قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

مختصر اور جامع تفسیری نکات

تذکیر بالقرآن

Reflection of Qur’an

قرآن مجید کی منتخب آیات کی تفسیر

A Summry of Qur’anic Teaching

حافظ محمد ابوبکر سجاد علوی

(خطیب لندن)

اس کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

© All rights reserved.

مختصر اور جامع تفسیری نکات

تذکیر بالقرآن

قرآن مجید کی منتخب آیات کی تفسیر

جلد اوّل

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ المائدہ

حافظ محمد ابو بکر سجاد علوی (خطیب لندن)
Telephone: +44 785 3099 327
Email: info@hafizsajjad.com
www.hafizsajjad.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ

تذکیر بالقرآن

ترتیب: حافظ محمد ابو بکر سجاد علوی

انتساب: لوجہ اللہ

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

الحمدللہ، خلاصہ تفسیر بعنوان تذکیر بالقرآن پیش خدمت ہے۔

یہ مستند تفاسیر کے علمی نکات کا خلاصہ ہے۔یہ کوئی باقاعدہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن کے ایک طالبعلم کے طور پر میرے تفسیری نوٹس ہیں۔

الحمدللہ، پچھلے 25 سال سے اردو اور انگریزی میں خطبات جمعہ، دروس قرآن وحدیث اور رمضان المبارک میں خلاصہ تفسیر کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔اس طویل عرصے کے دوران جو علمی اور تفسیری نکات حاصل ہوئے انہیں قلمبند کرتا رہا۔2020 میں خلاصہ تفسیر (انگلش) اور 2021 میں خلاصہ تفسیر (اردو) دروس کی شکل میں ریکارڈ کرکے یوٹیوب پر اپلوڈ کئے، جو الحمدللہ اب بھی استفادہ عام کیلئے موجود ہیں۔کچھ عرصہ پہلے میرے مربّی ومحسن قبلہ والد صاحب نور اللہ مرقدہ کی خواہش تھی کہ ان آن لائن دروس تفسیر کو مزید ترمیم واضافہ کرکے کتابی شکل میں مرتب کردوں۔خود میری بھی خواہش تھی کہ اپنے تفسیری اور علمی نکات کو ضبط تحریر میں لایا جائے تاکہ دوسرے لوگ بالخصوص آئمہ وخطباء اور مدرسین قرآن اس سے استفادہ کرسکیں۔اسی نیت کے ساتھ خالصتاً لوجہ اللہ اس کام کو کررہا ہوں۔دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ اس کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

اس گلدستہ تفسیر کی خصوصیت یہ ہے اس میں ہر رکوع کا خلاصہ اور تفسیری نکات الگ کردیئے گئے تاکہ مدرس یا خطیب کو درس کی تیاری میں آسانی ہو۔ہر رکوع میں اتنا علمی مواد موجود ہے کہ اس کی مدد سے مناسب دورانیہ کا درس تیار ہوسکتا ہے۔اس کے علاوہ ہر رکوع کے شروع میں تفسیری موضوعات لکھ دیئے گئے جن پر مدرس اپنے مطالعہ کی

روشنی میں مزید نکات کا اضافہ کر سکتا ہے۔ تحریر کا انداز کتابی سے زیادہ خطابی ہے۔ اہم نکات کو رنگین کر دیا گیا تاکہ خطیب یا مدرس کو نکات اٹھانے میں سہولت ہو۔ تذکیر بالقرآن ابھی نامکمل ہے اور ارتقائی مراحل میں ہے۔ دعا فرمائیں اللہ ربّ العالمین اس کام کی تکمیل فرمائے۔ آمین

الحمدللہ، اس خلاصہ تفسیر کی تیاری کیلیئے ہر آیت پر دس سے زیادہ تراجم قرآن کا موازنہ کیا گیا اور پھر ان میں سے موزوں ترین ترجمہ کا انتخاب کیا گیا۔ اسی طرح ہر آیت پر پانچ سے زیادہ تفاسیر کا مطالعہ کر کے ان میں سے تفسیری نکات اخذ کئے گئے۔ پھر ان اخذ شدہ نکات کو باہم مربوط کیا گیا تاکہ جامعیت اور تحریر کا حسن برقرار رہے۔ کچھ تفسیری نکات کی نوک پلک سنوار کر ان کو مزید آسان اور مثبت انداز میں پیش کیا گیا۔ کچھ جگہوں پر ترمیم و اضافہ میری طرف سے ہے۔ اس تفسیری کاوش میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش موجود ہے، انشاءاللہ اپنے فرصت کے لمحات میں اس میں مزید ترامیم و اضافہ کرتا رہوں گا۔ انشاءاللہ آپ علماء کرام اور اہل علم حضرات کی آراء کی روشنی میں اس میں مزید بہتری آئے گی۔

آپ سے گذارش ہے کہ اس تفسیری کام کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور اپنی قیمتی، اصلاحی اور عالمانہ رائے ضرور دیں تاکہ اس کام کو مزید بہتر انداز میں مکمل کیا جا سکے۔ دوران مطالعہ اگر میری کوئی نالائقی یا جہالت آپ پر ظاہر ہو تو ضرور مجھے مطلع فرمائیں تاکہ میں اصلاح کر سکوں۔ اس خلاصہ تفسیر میں اگر کوئی بات یا علمی رائے آپ کو قرآن و سنت کے مطابق لگے تو اس کو لے لیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی تفسیری نکتہ یا شخصی رائے قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے تو اس کو بلا تردد مسترد کر دیں (فاضربوہ فوق الجدار)۔

قرآن مجید کے اہم مضامین اور اہم تفسیری نکات کو ترتیب دینے کی یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ اگرچہ میں عالم نہیں ہوں، صرف علماء کی جماعت کا آخری صف کا طالب علم ہوں۔ مجھے اپنی علمی کوتاہی کا ادراک ہے۔

بقول شاعر:

؎ احب الصالحین ولست منھم
لعل اللہ ان یرزقنی صلاحاً

میں علماء و صلحاء سے محبت رکھتا ہوں، اگرچہ ان میں سے نہیں ہوں۔ لیکن اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بھی ان جیسا نیک اور صالح بنا دے۔ آمین

الحمدللہ، آئمہ کرام، علماء، خطباء، اہل علم اور ہر خاص وعام نے اس کاوش کی تحسین اور حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنی پر خلوص دعاؤں اور اصلاحی مشوروں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

بلاشبہ اس کاوش کا اجر سوائے اللہ رب العالمین کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ قرآن کی اس حقیر خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور سب کیلیئے فائدہ مند بنائے۔ آمین

آخر میں اللہ ربّ العالمین کا بے پناہ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس عظیم کام کو کرنے کی توفیق اور سعادت نصیب فرمائی۔ اللهم لا سهل إلا ما جعلته سهلا۔۔ اے اللہ! کوئی کام آسان نہیں ہے مگر وہی جسے تو آسان کر دے۔

طالب دعا:

حافظ محمد ابو بکر سجاد علوی

امام وخطیب، لندن برطانیہ

شعبان المعظم، 1447۔ فروری، 2026

اہم خصوصیات

برطانیہ، یورپ کی مصروف زندگی کے تناظر میں اردو کمیونٹی کیلئے خلاصہ تفسیر

ملٹی کلچرل سوسائٹی میں اسلام کی تعلیمات پر کیسے عمل کریں؟

مختصر اور جامع تفسیری نکات

سادہ، عام فہم اور معتدل انداز

اختلافی اور فرقہ وارانہ بحثوں سے اجتناب

رواداری، برداشت اور تحمّل کی اقدار اور رویّوں کا فروغ

آسان انداز میں فہم قرآن

دعوتی، علمی اور اصلاحی پہلوؤں سے قرآن کی تفسیر

تفسیری اور فقہی موشگافیوں کے بغیر آسان انداز میں قرآن کی تعلیمات

ملٹی فیتھ سوسائٹی کے پس منظر میں اسلام کا پیغام دعوت و محبّت

درس قرآن اور خلاصہ تراویح کی تیاری کیلئے علماء، خطباء کی خدمت میں تحفہ

طالب دعا: حافظ محمد ابوبکر سجاد

قرآن کا تعارف

دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن مجید ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو بندوں کی رشد و ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جانے والا ایسا کلام ہے جس کے ایک حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔

الرّحمٰن علّم القرآن۔ بڑی رحم دل ہستی (رحمٰن) نے قرآن سکھایا۔

قرآن کا سیکھنا اللہ کی رحمت کی علامت ہے۔

قرآن تذکیر سے بھرپور ہے (والقرآن ذی الذکر)۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (سورہ ص)

یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمدؐ) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر والے اس سے سبق لیں۔

اس آیت میں قرآن کو سمجھنے کے دو پہلو بیان کیے ہیں: یعنی تذکّر اور تدبّر

تذکّر: قرآن کو اتنا سمجھنا کہ اس سے انسان نصیحت حاصل کر سکے۔

یہ سب کے لیے ضروری ہے۔ قرآن کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اس کو سمجھ کر پڑھیں اور اس پر عمل کریں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ قرآن مجید کو اس حد تک سمجھنے کے لیے بس اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ عربی متن کو براہِ راست سمجھ سکیں۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ جب قاری حضرات نماز یا تراویح میں قرآن پڑھیں تو سمجھ آتی ہو۔ تھوڑی محنت سے یہ فائدہ قرآن سے ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ سورہ قمر میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ اور یقیناً ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنادیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

تدبّر: تذکّر کے برعکس قرآن پہ تدبّر و تفکر کر کے اس کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے نہ صرف عربی کے گہرے علم کی ضرورت ہے بلکہ دوسرے علوم سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم میں غور و فکر کے لیے عربی ادب، علم لغت، علم التجوید اور علم تفسیر کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے علاوہ مطالعہ سیرت پاک ﷺ، علم حدیث اور علم فقہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

تدبر کے لحاظ سے قرآن مشکل ترین کتاب ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور علم الٰہی لامتناہی ہے۔اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔یہ ناممکن ہے چاہے پوری زندگیاں کھپالیں۔اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔حدیث کے مطابق قیامت آجائے گی مگر قرآن کے علوم و معارف ختم نہیں ہونگے۔(لا تنقضی عجائبہ)

ہمارا کام اخلاص سے قرآن سیکھنے کی کوشش کرنا ہے تاکہ اپنی زندگی اس کی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق گزار سکیں۔

یہ فکر تو ہمیں یقیناً ہونی چاہیے کہ ہم قرآن کتنا سیکھ پائے اور اس پہ کتنا عمل کیا؟لیکن ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری ذمہ داری کوشش کرنا ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس کو کتنا عطا فرماتا ہے۔اجر کا تعلق نیت اور کوشش سے ہے نتائج سے نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جو شخص قرآن کو مہارت کے ساتھ پڑھتا ہے تو وہ بڑی عزت والے فرشتوں اور نبیوں کے ساتھ ہو گا۔جس کے لیے قرآن پڑھنا مشکل ہو اور پھر بھی محنت کرتا رہا تو اس کے لیے دوہرا اجر ہو گا۔ایک قرآن پڑھنے کا دوسرا اس پر محنت کرنے کا۔(سنن ابو داؤد)

دو قابل رشک لوگ

حدیث: دو چیزوں میں رشک کرنا جائز ہے ایک ایسے آدمی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی نعمت دی ہو اور وہ اس کو دن رات پڑھتا رہتا ہو،دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال کی نعمت دی ہو اور وہ دن رات اس سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا رہتا ہو۔(بخاری، مسلم)

قرآن کے حقوق

قرآن کے پانچ بنیادی حقوق ہیں۔

اس پر ایمان لانا،

اس کی تلاوت کرنا،

اس کو سمجھنا،

اس پر عمل کرنا،

اس کی آفاقی دعوت کو دوسروں تک پہنچانا۔

قرآن کے ان حقوق کی ادائیگی کیلئے کوشش کرنا ہر مسلمان کی زندگی کا مشن ہونا چاہیئے۔

بقول شاعر:

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن

نیست ممکن جز بقرآں زیستن

یعنی اگر تو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ زندگی قرآنِ پاک کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن پڑھنے، اس کی تعلیمات کو سمجھنے، اس پہ عمل کرنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

قرآن عظیم الشّان کتاب ہے، جو اس کتاب سے جڑتا ہے عظیم ہو جاتا ہے۔

نزل جبرئیلؑ بالقرآن فاصبح جبرئیلؑ افضل الملائکہ۔

جو فرشتہ اس قرآن کو لے کر آیا وہ فرشتہ (جبرائیلؑ) سارے فرشتوں کا سردار،

نزل القرآن علی سیدنا محمّدﷺ فصار سیّد الخلق۔

جس نبی پر اترا وہ نبی ﷺ ساری مخلوقات کا سردار،

جاء القرآن الی امّۃ محمّد فاصبحت خیر امّۃ۔

جس امّت کی طرف اترا وہ امّت (امّت مسلمہ) ساری امّتوں کی سردار،

نزل القرآن فی لیلۃ القدر فاصبحت خیر من الف شھر۔

جس رات میں اترا وہ رات (لیلۃ القدر) ساری راتوں کی سردار،

نزل القرآن فی شھر رمضان فاصبح رمضان خیر الشّھور۔

جس مہینے میں اترا وہ مہینہ (رمضان المبارک) سارے مہینوں کا سردار،

قرآن جس سینے میں محفوظ ہوتا ہے وہ سینہ باعث شرف بن جاتا ہے،

قرآن جس کاغذ پر چھپتا ہے وہ کاغذ مقدّس ہو جاتا ہے۔

غلاف اور رحل جو قرآن سے منسوب ہوتے ہیں باعث ادب ہو جاتے ہیں۔

حدیث: القرآن حجۃ لک او علیک

قرآن روز قیامت یا ہمارے حق میں یا ہمارے خلاف گواہی دے گا۔

قرآن پڑھنا بہترین عبادت ہے۔

افضل عبادة امتی تلاوت القرآن۔(حدیث)

بہترین مصروفیّت۔ قرآن پڑھنااور پڑھانا۔

خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمہ۔

تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کو خود بھی سیکھے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔(حدیث)

قرآن پڑھنے والے کو اللہ بغیر مانگے عطا فرماتے ہیں۔

دلوں کا زنگ: دلوں کے زنگ کو قرآن کی تلاوت سے دور کیا جاسکتا ہے۔

انّ ھذہ القلوب تصداء کما یصدا الحدید، قیل ما جلاءھا قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن ۔(حدیث)

تلاوت کے ہر حرف پر دس نیکیاں

من قراء حرف من کتاب اللہ فلہ بہ حسنہ والحسنۃ بعشر امثالھا، لا اقول الم حرف بل الف حرف لام حرف میم حرف۔ حدیث

نزول قرآن

قرآن دو مرحلوں میں نازل ہوا۔

پہلا مرحلہ: مکمل قرآن لوح محفوظ سے بیت معمور یا آسمان دنیا تک رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کی رات اتارا گیا۔

دوسرا مرحلہ: 23 سال کے عرصے میں حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا نبی اکرم ﷺ کے دل پر اتارا گیا۔

قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب توقیفی ہے، یعنی خود حضور ﷺ نے وحی الٰہی کی روشنی میں سورتوں اور آیات کی ترتیب لکھوائی۔

مکی اور مدنی سورتیں

قرآن مجید میں دو قسم کی سورتیں ہیں،

ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہونی والی سورتیں مکی سورتیں کہلاتی ہیں۔

ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہونے والی سورتیں مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔

یہ دونوں قسم کی سورتیں دراصل مختلف حالات کے مطابق دو مختلف دعوتی حکمت عملی کا نام ہے۔

دنیا میں جہاں بھی مسلمان بطور اقلیت زندگی گزار رہے ہیں وہ نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی اور مکی دور کی دعوتی حکمت عملی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتے ہیں۔

قرآن کی تفسیر

قرآن کی بہترین تفسیر خود قرآن کی آیات ہیں، ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر بیان کرتی ہے۔

القرآن یفسّر بعضہ بعضا۔

قرآن کی دوسری تفسیر سنت نبوی ﷺ اور احادیث مبارکہ ہیں۔ وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للنّاس ما نزّل الیھم۔ ویعلّمھم الکتب والحکمۃ۔

قرآن کی تیسری تفسیر اقوال صحابہ ہیں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے قرآن کو اترتے دیکھا اور چلتے پھرتے قرآن (نبی اکرم ﷺ) کی سیرت کا مشاہدہ کیا۔

اجماع صحابہ حجت ہے۔ (مقدمہ ابن تیمیہؒ)

عبداللہ بن عبّاسؓ عظیم مفسر قرآن تھے۔ تفسیر ابن عباس بڑی جامع تفسیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو ترجمان القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ (بحوالہ ابن جریر)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بہت بڑے مفسر قرآن تھے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن کی ہر سورت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کب نازل ہوئی، کہاں نازل ہوئی، کس مقصد کیلئے نازل ہوئی اور جب نازل ہوئی تو حضور ﷺ کس حال اور کیفیت میں تھے۔

قرآن کی چوتھی تفسیر اقوال تابعین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ ان سے قرآن سیکھا۔ اسلام کے سنہری دور سے قریب ہونے کی وجہ سے تابعین اور تبع تابعین کی تفسیری آراء کی بھی ایک خاص اہمیت ہے۔

تفسیر بالرّائے: تفسیر قرآن میں ذاتی رائے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ جو شخص قرآن کو بغیر استاد (رہنمائی، تفسیر) کے بغیر پڑھتا ہے تو شیطان اس کا استاد بن جاتا ہے۔

تلاوت قرآن کے آداب

طہارت،

محبت واحترام،

توجہ اور یکسوئی،

تعوّذ، تسمیہ،

ترتیل اور ٹھہر ٹھہر کر تجوید کے ساتھ پڑھنا،

عمل کی نیت،

اپنے رب سے ہم کلامی،

تلاوت کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔

یاد رکھیئے! تلاوت و تجوید قرآن ایک فن اور ہنر ہے اس کو بغیر استاد کی رہنمائی اور مشق کے نہیں سیکھ سکتے جس طرح سوئمنگ کی کتاب پڑھ کر آپ تیراکی نہیں سیکھ سکتے یا صرف ڈرائیونگ کی کتاب پڑھ کر ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتے اسی طرح قرآن کی تلاوت سیکھنے کیلئے ماہر قاری کی رہنمائی ضروری ہے۔

مطالعہ قرآن کے آداب

نیت کی درستگی،

ہدایت کی طلب اور جستجو،

اللہ تعالی سے رہنمائی کی دعا،

قرآن کتاب ہدایت ہے سائنس یا میڈیسن کی کتاب نہیں، کہ اس میں سے سائنسی فارمولے تلاش کیئے جائیں۔

قرآن سے اپنا فلسفہ نہ ڈھونڈیئے۔

قرآن کے تقاضوں پر عمل،

قرآن صرف ایک تھیوری ہی نہیں بلکہ پریکٹیکل بھی ہے۔جب پڑھو اقیمو الصّلوۃ (نماز قائم کرو) تو نماز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دو، جب پڑھو آتو الزکوۃ (زکوۃ ادا کرو) تو زکوۃ ادا کرنا شروع کر دو،

آیات قرآنی میں تدبّر اور غور و فکر،

کھلے ذہن (Open mind) کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیجئے۔

ہمیشہ سیاق وسباق کو مد نظر رکھیں۔

کچھ سورتوں اور آیات کا مخصوص شان نزول ہے وہ مخصوص حالات اور مخصوص مواقع کیلئے نازل ہوئیں۔

قرآن میں کچھ مخصوص ہدایات کا ذکر ہے:

جو انبیاءؑ، فرشتوں، اولی الامر کو دی گئیں، ہر فرد کو اختیار نہیں کہ وہ ہر حکم کو اپنے لئے سمجھ کر ان کو دوسروں پر نافذ کرنا شروع کر دے۔ کسی فرد یا گروہ کا کام نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دے۔

قرآنی اصطلاحات:

قرآن کی کچھ مخصوص اصطلاحات ہیں۔ قرآن فہمی کیلئے ان اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے۔

قرآن میں استعمال ہونے والے کئی الفاظ کثیر المعانی ہیں۔ ایک ہی لفظ مختلف امور کیلئے استعمال ہوا مثلاً صلوٰۃ کا لفظ نماز کیلئے بھی استعمال ہوا، دعا کیلئے بھی، درود شریف کیلئے بھی اور رحمت کیلئے بھی۔

محکمات و متشابہات

قرآن مجید میں دو قسم کی آیات ہیں۔

احکام والی آیات جن میں عبادات، اعمال، حلال و حرام وغیرہ کا حکم ہے۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کو متشابہات کہا جاتا ہے ان میں عموماً اللہ کی صفات کا ذکر ہے مثلاً عرش الٰہی، اللہ کا ہاتھ وغیرہ ان پر ایمان تو ضروری ہے مگر ان کیفیات کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

قرآن بہترین ساتھی ہے

قرآن کے نام

قرآن کے کئی نام آئے ہیں۔

قرآن کو کتاب ہدایت،

کتاب رحمت،

کتاب شفاء،

کتاب بشارت،

کتاب نور،

کتاب بصیرت،

کتاب مبین،

کتاب حکمت،

کتاب فرقان (حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب) کہا گیا۔

قرآن ایک دستور حیات اور لائف سٹائل ہے۔

قرآن ایک ایسا راستہ دکھاتا ہے جو اللہ کی رضا اور اسکی جنّت کی طرف لیجاتا ہے۔

قرآن تربیت کا ایسا نظام دیتا ہے جو ایک انسان کو مثالی انسان بناتا ہے۔

قرآن ایک ایسا سفارشی ہے جس کی سفارش رد نہیں ہوگی۔

قرآن ایک ایسا سایہ دار درخت ہے جو اپنے نیچے بیٹھنے والوں کو قلبی سکون اور راحت دیتا ہے۔

قرآن ایک ایسا امام ہے جو اپنی اقتدا کرنے والوں کو زمانے کا امام بنا دیتا ہے۔

قرآن پڑھنے والوں کیلئے تین عظیم دعائیں

قرآن کو یاد کرنے میں آسانی کی دعا

رب اشرح لی صدری و یسّرلی امری، واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوقولی۔

سورہ الم نشرح۔ یہ سورت بھی قرآن پڑھنے میں آسانی اور حفظ میں سہولت کیلئے پڑھی جاسکتی ہے۔۔

تلاوت کے بعد کی دعا

اللھم ارحمنا بالقرآن العظیم واجعله لنا إمامًا ونورًا وهدًى ورحمة۔ اللھم ذکّرنا منه ما نسینا، وعلّمنا منه ما جھلنا، وارزقنا تلاوته آناء اللیل وأطراف النھار، واجعله لنا حجّة یارب العالمین۔

قرآن کے انوارات و برکات سے استفادہ کی دعا

اَسْاَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ، سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَ نُوْرَ صَدْرِیْ وَ جَلَاءَ حُزْنِیْ وَ ذَھَابَ ھَمِّیْ۔(مسند احمد)

اس دعا میں ہم کیا مانگ رہے ہیں؟

اللہ کے ہر ممکنہ ناموں کا واسطہ دیکر اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ

ان تجعل القرآن ربیع قلبی ..... اے اللہ، قرآن کو میرے دل کی بہار بنادے۔

بہار جس طرح زمین میں زندگی اور تازگی واپس لاتی ہے اسی طرح ہمارے غمگین دکھی دل کو بھی قرآن کی برکت سے موسم بہار کی طرح خوش وخرم اور تروتازہ کردے۔

یہ قرآن جو میں نے پڑھا، سمجھا، سیکھا، سکھایا، عمل کیا اس کی بدولت میرا دکھ، درد، غم، تکلیف دور کردے۔ آمین

پارہ۔1

قرآن مجید کا پہلا پارہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ کی پہلی 141 آیات پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفاتحہ

قرآن کریم کی سورتوں کے آغاز میں مماثلت

قران کریم کی بعض سورتوں کے آغاز میں مماثلت پائی جاتی ہے:

قرآن مجید کی پانچ سورتوں کا آغاز اللہ کی حمد (الحمد للہ) سے ہوتا ہے: سورۃ الفاتحہ، سورۃ الانعام، سورۃ الکھف، سورۃ سباء، سورۃ فاطر۔ یہ

قرآن مجید کی پانچ سورتوں کا اغاز اللہ تعالیٰ کی تسبیح (سبّح یا یسبّح) سے ہوتا ہے: سورۃ الحدید، سورۃ الحشر، سورۃ الصف، سورۃ الجمعہ، سورۃ التغابن۔

قرآن مجید کی سات سورتوں کا آغاز حٰمٓ سے ہوتا ہے۔ انہیں حوامیم سبعہ یا آل حم کہا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنھما ان سورتوں کو قرآن مجید کا خلاصہ لباب القرآن اور جنت کے سرسبز باغات روضٰت الجنّٰت کہتے ہیں۔ ان سات سورتوں کے نام یہ ہیں: 1۔ مومن، 2۔ حم سجدہ (دوسرا نام سورۃ فصلت)، 3۔ شوریٰ، 4۔ زخرف، 5۔ دخان، 6۔ جاثیہ، 7۔ احقاف۔

قرآن مجید کی پانچ سورتوں کا آغاز نبی کریم ﷺ سے منسوب ہے۔ ان سورتوں کا آغاز یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ سورۃ احزاب، سورۃ الطلاق، سورۃ التحریم، سورۃ المزّمل، سورۃ المدثّر۔

قرآن مجید کی پانچ سورتوں کا آغاز صیغہ امر قُلْ سے ہوتا ہے۔ مثلاً قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ یہ پانچ سورتیں یہ ہیں: سورۃ جن، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس۔

قرآن کریم کی پانچ سورتیں حرف ندا "یا" سے شروع ہوتی ہیں مثلاً یاایّھا الناس۔ یہ سورتیں سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الحج، سورۃ الحجرات، سورۃ الممتحنہ۔

قرآن مجید کی کئی سورتوں کے ایک سے زیادہ نام

قرآن مجید کی کئی سورتوں کے ایک سے زیادہ نام آئے ہیں۔

سورۃ فاتحہ کے نام

سورہ فاتحہ کے بھی کئی نام آئے ہیں جو تقریباً 25 ہیں۔ مشہور نام یہ ہیں:

دیباچہ قرآن،

سورۃ الحمد۔ اس سورت میں اللہ کی حمد وثنا بیان کی گئی

سورۃ الصّلوٰۃ۔ نماز کی سب سے اہم سورت،

سورۃ الدعاء۔ (یہ سورت دراصل ایک دعا ہے۔ اس میں دعا کا طریقہ بھی سکھایا گیا)

سورہ سبع مثانی۔ (بار بار دہرائی جانے والی سات آیات)

ام الکتاب۔ کتاب کی اصل، بنیاد

امّ القرآن،

اساس القرآن۔ اس سورت کو قرآن کی اساس، بنیاد اور جڑ کہا گیا۔

عبداللہ بن عبّاسؓ سے مروی ہے: اساس الکتب القرآن واساس القرآن الفاتحه واساس الفاتحة بسم الله الرّحمٰن الرّحيم۔ تمام کتابوں کی اساس قرآن ہے، قرآن کی بنیاد سورۃ الفاتحہ ہے، اور سورۃ الفاتحۃ کی بنیاد بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہے۔

اس کو سورۃ الوافیہ بھی کہتے ہیں یعنی اس سورت کا ادب یہ ہے کہ اس سورت ک پورا اور مکمل پڑھا جاتا ہے۔

اس کو سورة الكافية بھی کہتے ہیں یعنی یہ سورت ہماری بہت ساری دینی اور دنیاوی ضروریات کیلئے کافی ہے۔

سورت فاتحہ پر عمل کرنے سے باقی قرآن پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔

سورة الكنز۔ اس سورت کو سورۃ الکنز (خزانہ) بھی کہا گیا۔

سورة الشفاء

اس سورت کو سورة الرّقيہ اور دم والی سورت بھی کہتے ہیں۔

اس سورت کو بیماری میں شفاء کی نیت سے پڑھنا یا پڑھ کر مریض پر دم کرنا ایک مسنون عمل ہے۔ جادو، نظر بد کیلئے یا عام حفاظت بھی اس سورت کو پڑھا جاتا ہے۔

سورۃ فاتحہ ایک بے مثل سورت ہے۔ اس جیسی کوئی اور سورت کسی آسمانی کتاب بشمول قرآن مجید موجود نہیں۔

اس سورت سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے،

نزول کے اعتبار سے پہلی مکمل نازل ہونے والی سورت ہے،

یہ ایک لحاظ سے قرآن کا خلاصہ ہے،

نماز بھی اسی سے شروع ہوتی ہے،

حدیث: لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب۔ نماز مکمل نہیں ہوتی جب تک سورت فاتحہ کی تلاوت نہ کیجائے۔

سورت فاتحہ سات آیات پر مشتمل سورت ہے جس میں ہمیں:

دعا کا طریقہ بتایا گیا۔ کس سے دعا مانگی جائے اور کیسے مانگی جائے۔

حدیث: جب اللہ سے دعا مانگو تو سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرو، اس کے بعد نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجو،

اسکے بعد اللہ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرو۔

سورہ فاتحہ کے تین حصے ہیں:

شروع میں اللہ کی حمد و ثنا ہے۔

درمیان میں اللہ کی تعریف بھی ہے اور بندے کی درخواست بھی ہے۔

آخری حصے میں بندے کی دعا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر حدیث قدسی کی روشنی میں

ایک حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "میں نے سورہ فاتحہ کو اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے۔

آدھی سورہ فاتحہ میرے لئے ہے اور آدھی میرے بندے کے لئے ہے۔

جب بندہ الحمد اللہ رب العالمین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

"حمدنی عبدی" میرے بندے نے میری حمد بیان کی"

جب الرحمن الرحیم کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اثنی علی عبدی۔ میرے بندے نے میری ثنا بیان کی

جب مالک یوم الدین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

میرے بندے نے میری عظمت و بزرگی کا اعتراف کیا

جب ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

ھٰذا بینی و بین عبدی۔ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے

جب بندہ اھدنا الصّراط المستقیم سے آخر تک کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

هٰذا العبدی ولعبدی ماسأل۔ یہ میرے بندے کیلئے ہے اور میرے بندے نے جو مانگا ہے اسے مل جائے گا۔

اہم تفسیری نکات

قرآن کی پہلی آیت:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔

اگرچہ تعوذ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم کو قرآن کے شروع میں نہیں لکھا جاتا مگر اس کا پڑھنا تلاوت سے پہلے ضروری ہے۔ کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا گیا مگر قرآن پڑھنے سے پہلے بسم اللہ کے ساتھ تعوّذ بھی پڑھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ سورہ نحل میں ارشاد ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔(النحل ۱۶:۹۸) پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

نماز میں بھی سورہ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ دونوں پڑھنی چاہئیں۔

اللہ ایک خاص نام ہے جو صرف ذات باری تعالیٰ ہی کیلئے بولا جاسکتا ہے۔ عربی گرائمر میں اس کو اسم جامد کہتے ہیں یعنی اس سے اور لفظ نہیں بن سکتے۔ اس نام کا تثنیہ، جمع، تذکیر و تانیث بھی نہیں بن سکتے۔

یہ لفظ اللہ کی ذات وصفات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

یہ اللہ کا ذاتی نام ہے، باقی سارے نام صفاتی ہیں۔

بسم اللہ کی اہمیت

بسم اللہ کا مطلب ہے:

اللہ کے نام کے ساتھ

اللہ کے نام کی مدد سے

اللہ کے نام کی برکت سے

بسم اللہ ایک دعائیہ کلمہ ہے جو ہر سلیم الفطرت انسان کے دل کی صدا ہے۔

ہر کار خیر اور قابل ذکر جائز کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔

حدیث: جو کام بسم اللہ سے نہ شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور نامکمل رہتا ہے۔

قرآن کی پہلی وحی کی پہلی آیت کے اندر بھی یہی حکم دیا گیا۔ اقراء باسم ربّک۔ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھنا شروع کرو۔

بسم اللہ پڑھنا سنت انبیاءؑ ہے۔

قرآن مجید کے اندر حضرت سلیمانؑ کی بسم اللہ کا ذکر ہے جو انہوں نے ملکہ سباء کو خط کے شروع میں لکھی تھی۔

انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم۔

قرآن میں نوحؑ کی بسم اللہ پڑھنے کا ذکر ہے جو انہوں نے کشتی کے سفر سے پہلے پڑھی۔ بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا۔۔۔

بسم اللہ کی برکات

بسم اللہ کی برکت سے انسان کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق، تائید اور مدد شامل ہو جاتی ہے اور وہ کام جلدی مکمل ہو جاتا ہے۔

انسان صحیح ترین نکتے سے کام کا آغاز کرتا ہے۔

بسم اللہ سے شروع کیا گیا کام شروع سے لے کر آخر تک بابرکت رہتا ہے۔

قرآن کھولو تو سب سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا دو دفعہ تذکرہ ہے۔

کہ اللہ دنیا میں بھی مہربان اور آخرت میں بھی مہربان۔ رَحْمَنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيمَهُمَا۔

سورت الفاتحہ کی دوسری آیت میں دوبارہ اللہ کی رحمت کا دو دفعہ تذکرہ ہے۔ الرحمٰن الرّحیم۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جو تمام کائنات کا رب ہے۔

الحمد للہ کلمہ ثنا بھی ہے اور کلمہ شکر بھی ہے۔

حدیث: مَا أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَى عَبْدٍ نِعْمَةً فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ إِلاَّ كَانَ الَّذِي أَعْطَاهُ أَفْضَلَ مِمَّا أَخَذَ (ترمذی)

اگر اللہ انسان کو نعمت عطا کریں اور انسان اس کا شکر ادا کرتے ہوئے الحمد للہ کہے تو دی ہوئی نعمت لے لی ہوئی نعمت سے افضل ہے۔

دوسری حدیث کے اندر فرمایا کہ اگر میری امت میں سے کسی کو اللہ دنیا بطور نعمت عطا فرما دیں اور وہ الحمد للہ کہے تو یہ کلمہ دنیا کی نعمت سے افضل ہو جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُلِلّٰہِ۔

سب سے بہترین ذکر لا الٰہ الاّ اللہ ہے اور سب سے بہترین دعا الحمدللہ ہے۔(ترمذی،ابن ماجہ)

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ، وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهُ، وَبِيَدِكَ الْخَيْرُ كُلُّهُ، وَإِلَيْكَ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ

اللّھم لک الحمد کما ینبغی لجلال و جھک وعظیم سلطانک۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا۔بدلے کے دن (یعنی قیامت کا) مالک ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں

یہ آیت ہمیں ہماری زندگی کا نصب العین بتاتی ہے۔یہ آیت ہماری زندگی کی سمت کو درست کرنے کیلئے کافی ہے۔

ہدایت کی دعا

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

(اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

ہم سب ہر نماز میں ہدایت کی بار بار دعا کرتے ہیں۔جو بھی نماز پڑھ رہا ہے چاہے بہت بڑا عالم ہے،امام ہے،اللہ کا ولی ہے،عام مسلمان ہے،گناہگار ہے یا نیک ہے سب ہدایت کی دعا کرتے ہیں اس لیے کہ سیدھے راستے پر چلنا سب کیلئے ضروری ہے چاہے وہ عالم ہو یا عام آدمی۔

صراط مستقیم کیا ہے؟

صراط مستقیم سے مراد قرآن وسنّت کا راستہ ہے۔

حدیث:علیکم بسنتی و سنته الخلفاء الراشدين---

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے۔حضرت جابرؓ کا بھی یہی قول ہے۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں اس سے مراد حق ہے۔

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا۔

دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں۔ قرآن وسنت کا تابع دراصل حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع ہے اور اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب، اس کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔لہٰذا صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہدایت ملنے کے بعد ہدایت کی دعا کیوں؟

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بندہ مومن کو تو اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے پھر نماز اور غیر نماز میں بار بار ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد ہدایت پر ثابت قدمی کی دعا ہے۔ اس لئے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے۔ وہ خود اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں بلکہ دن رات اپنے اللہ کا محتاج ہے اسی لئے اسے سکھایا گیا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنالے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ اے ایمان والو! اللہ پر، اس کے رسولوں پر اس کی اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں، سب پر ایمان لاؤ۔ (النساء۔136)

اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسے یہاں ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کرنے کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور دوام و استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہمیشگی کرنا جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

دوسری جگہ اللہ رب العزت نے اپنے ایمان دار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ یہ دعا کریں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَيْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔

یعنی اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما تو بہت بڑا دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔ (آل عمران:8)

ایک روایت کے اندر آتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نماز مغرب کی تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پوشیدگی سے پڑھا کرتے تھے۔

پس آیت اھدنا الصراط المستقیم کا مطلب یہ ہوا کہ: اے اللہ ہمیں صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔ (واللہ اعلم)

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

ان لوگوں کے راستے پر ہمیں چلا کہ جن پر تو نے اپنا فضل و کرم کیا نہ کہ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔ اور نہ گمراہوں کے راستے پر ہمیں چلا۔

سورۃ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہنی چاہیے۔

إِذَا قَالَ يَعنِي الْإِمَامَ : وَلَا الضَّالِّينَ، فَقُولُوا: آمِينَ، يُحِبْكُمُ اللهُ۔(مسلم)

جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، اللہ تم سے محبّت کریں گے۔

جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔۔۔

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوا، فَإِنَّهُ مَنْ وَافَقَ تَأْمِينُهُ تَأْمِينَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو؛ کیونکہ جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق (برابر) ہو گئی، تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (بخاری و مسلم)۔

سورۃ البقــرۃ

سورہ البقرۃ کی خصوصی فضیلت

سورۃ البقرہ قرآن مجید کی سب سے لمبی سورت ہے جو 286 آیات پر مشتمل ہے۔

اس سورت کو قرآن کا خلاصہ کہا جاتا ہے۔

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سیّد الکلام القرآن و سیّد القرآن البقرہ و سیّد البقرہ آیۃ الکرسی۔

سارے کلاموں کا سردار کلام قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کی سردار سورت البقرہ ہے اور سورۃ البقرہ کی سردار آیت آیۃ الکرسی ہے۔

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامًا، وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ الْبَقَرَةُ ۔

ہر چیــز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورت البقــرہ ہے۔ترمذی

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُورًا فَإِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ۔(مسلم،ترمذی،مسند احمد)

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناو(یعنی گھروں میں بھی تلاوت اور نیکیوں کا اہتمام کیا کرو)،بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جہاں سورہ البقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔مسند احمد

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تَعَلَّمُوا سُورَةَ الْبَقَرَةِ فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ، وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ، وَلَا تَسْتَطِيعُهَا الْبَطَلَةُ۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے،اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے اور اہل باطل (شیاطین،جادوگر)اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص سورہ بقرہ کی دس آیات کو پڑھ لے گا تو اللہ تعالیٰ اس رات شیطان اور ہر قسم کی آفات اور بلاوں اور مصیبتوں سے اس کی حفاظت فرمائیں گے۔وہ دس آیات یہ ہیں: سورہ بقرہ کی پہلی چار آیات، آیۃ الکرسی اور اس کے متصل بعد دو آیات، سورہ بقرہ کی آخری تین آیات۔

حدیث: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے معراج کے موقع پر تین تحفے دیئے گئے۔

1۔ہر کلمہ گو شخص (بالآخر) جنت میں جائے گا۔

2۔پانچ نمازوں کا تحفہ۔

3۔سورہ بقرہ کی آخری آیات

قرآن مجید کی طویل ترین آیت (آیت مداینت) سورہ بقرہ میں ہے۔

قرآن مجید کی سورتوں کے نام ان سورتوں کا موضوع نہیں ہیں بلکہ سورتوں میں ذکر ہونے والے کسی نام یا واقعہ پر سورت کا نام دے دیا گیا۔

سورہ البقرہ میں ذکر ہونے والے گائے کے واقعہ کی وجہ سے اس کا نام البقرہ (گائے) رکھ دیا گیا۔یہ نام اس سورت کا موضوع نہیں ہے۔

سورہ بقرہ قرآن کا خلاصہ ہے۔اس میں ایمان کے بنیادی اصول،توحید باری تعالیٰ،رسالت،آخرت،اللہ تعالیٰ کی ربوبیت،ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہدایات،عبادات،معاملات،معاشرت،اخلاق،اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق بنیادی اصول اور ہدایات دی گئیں ہیں۔

پہلا رکوع: الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَۙ۔ (البقرہ۔1)

رکوع کے تفسیری نکات: حروف مقطعات،قرآن کتاب ہدایت،متقی لوگوں کی صفات،ایمان بالغیب کی اہمیت،ایمانیات،عبادات،ارکان اسلام،اقامت صلوٰۃ وزکوٰۃ،آسمانی کتابوں پر ایمان،فکر آخرت،ہدایت یافتہ لوگوں کی صفات،مخصوص منکرین کا ذکر۔

الٓمّٓ۔ الف،لام،میم

حروف مقطعات،

ان کے معانی صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کو معلوم ہیں۔ اللہ و رسولہ اعلم بمرادہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَۙ

یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی بھی شک نہیں پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے۔(البقرہ۔2)

قرآن،لاریب کتاب یعنی شکوک و شبہات سے بالاتر سچی کتاب ہے۔

قرآن ساری انسانیت کیلئے ہدایت ہے (ھدی للنّاس) مگر اس سے حقیقی فائدہ وہی اٹھائیں گے جو اپنے اندر تقوٰی اور خوف خدا پیدا کریں گے۔(ھدی للمتقین)۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَۙ۔

جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(البقرہ۔3)

متقین کی صفات

ایمانیات

اسلامی عقائد

ایمان مفصل

اٰمَنْتُ بِاللہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَالْمَوْتِ

میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اس پر کہ ہر بھلائی اور برائی اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادی ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔

نماز کے بنیادی مسائل

نماز کو کیسے ادا کریں؟

زکوٰۃ کے بنیادی احکامات

بن دیکھے ایمان کی فضیلت

ا۔ایمان بالغیب۔بن دیکھے ایمان کی خاص فضیلت۔اللہ، رسولوں، فرشتوں آخرت کو نہیں دیکھا مگر ایمان لانا۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ کو نہیں دیکھا پھر بھی آپؐ پر ایمان لائے ان کے ایمان کی بھی ایک خاص فضیلت ہے۔(بحوالہ ابن کثیر)

2۔نماز قائم کرنا۔

3۔اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرنا۔

4۔آسمانی کتابوں پر ایمان لانا۔پچھلی آسمانی کتابوں پر عمومی ایمان تو ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں البتہ ان کے متن اور اہل کتاب کی تشریحات کے بارے میں احتیاط ضروری ہے۔اصطلاح میں ان کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے اور اس حوالے سے تین صورتیں پیش آتی ہیں:

1۔ اگر اہل کتاب کی روایت قرآن وحدیث کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہو تو اس کو بطور حوالہ بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

2۔ اگر وہ روایت قرآن وحدیث سے ٹکراتی ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

3۔ اگر وہ روایت قرآن وحدیث کے کسی حکم کی نہ تائید کرتی ہے نہ تردید تو اس کے بارے میں حکم ہے کہ لا نصدّق و لا نكذب نہ ہم اس روایت کی تصدیق کریں نہ تردید کریں گے بلکہ سکوت اور خاموشی اختیار کریں گے۔

حدیث: إِذَا حَدَثَكُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ فَلَا تُكَذِّبُوهُمْ وَلَا تُصَدِقُوهُمْ وَلكِنْ قُولُوا: آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُم۔ جب تم سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کوئی بات بیان کریں تو نہ تو ان کی تکذیب کرو (یعنی انہیں جھٹلاؤ نہیں) اور نہ ہی ان کی تصدیق کرو (یعنی فوراً سچی مان لو)۔ بلکہ یہ کہو: ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری "طرف نازل کیا گیا اور جو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ (بخاری)

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۗ

اور جو کتاب (اے محمد ﷺ) تم پر نازل ہوئی (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں ؑ پر) نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ (البقرہ۔4)

اس آیت میں آپ ﷺ اور آپؐ سے پہلے نازل ہونے والی وحی پر ایمان کا تذکرہ ہے لیکن آپؐ کے بعد کسی نئے نبی یا وحی پر ایمان کا ذکر نہیں۔ قرآن میں چالیس سے زیادہ مقامات پر جہاں کہیں نبی، رسول، وحی یا کتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ من قبل اور من قبلک (آپ ﷺ سے پہلے) کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں من بعد (آپ ﷺ کے بعد) کا اشارہ نہیں۔ قرآن کا یہ انداز خود شہادت دے رہا ہے کہ نبوت ورسالت اور وحی کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہو گیا۔

اس لحاظ سے قرآن کی ابتدائی آیات میں ہی عقیدہ ختم نبوت کو واضح کر دیا گیا۔

5۔ یوم آخرت پر یقین رکھنا۔

جن کے اندر یہ صفات ہونگی وہ حقیقی طور پر کامیاب اور ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔

پانچ ارکان اسلام

حدیث: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ، وَحَجِّ الْبَيْتِ۔

حضرت ابن عمر (رض) سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیادیں پانچ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کی گواہی دینا۔ نماز قائم رکھنا، زکوۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ (بخاری، مسلم)

ہدایت یافتہ لوگ

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔ (البقرہ۔5)

ہدایت سے محروم لوگ

انّ الذین کفرو سواً علیھم۔۔۔البقرہ۔آیت۔6

مخصوص منکرین کا ذکر جن کے دلوں پر ہدایت سے محرومی کی مہر لگادی گئی۔

یہاں منکرین سے مراد وہ خاص لوگ ہیں جو اسلام دشمنی میں ساری حدیں پار کر گئے جس وجہ سے دولت ایمان سے محروم کر دیئے گئے مثلاً ابو جہل، ابو لہب وغیرہ۔ ورنہ بہت سارے لوگ کفر و شرک چھوڑ کر مسلمان ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض نے صحابیت کا درجہ پایا، بعض نے دین کی خدمت میں اعلیٰ مقام حاصل کیا لہٰذا عام منکرین اس آیت کے مخاطب نہیں۔

گناہوں کی دنیاوی سزا، سلب توفیق

نماز، تلاوت، عبادات میں دل نہ لگنا گناہوں کی نحوست اور بد اثرات کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے، اس کو حدیث میں دلوں کا زنگ کہا گیا۔ ایسی کیفیت کو قرآن کی تلاوت اور فکر آخرت سے دور کیا جاسکتا ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: بندہ مومن جب گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگر وہ توبہ کر کے گناہ سے باز آجاتا ہے تو اس کا دل پہلے کی طرح صاف اور شفاف ہو جاتا ہے اگر وہ توبہ کی بجائے گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے تو وہ نقطہ سیاہ پھیل کر اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ زنگ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (المطففین:14) یعنی ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے جو ان کی مسلسل بد اعمالیوں کا منطقی نتیجہ ہے۔ (ترمذی، نسائی)

دوسرا رکوع: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔ (البقرہ۔8)

رکوع کے تفسیری نکات

منافقین کا تعارف، منافقین مدینہ کا پس منظر، نفاق کی قسمیں، اعتقادی نفاق، منافقین کے دلوں میں بیماری، نفاق ایک ذہنی اور نفسیاتی بیماری کا نام ہے۔ خود فریبی کا شکار لوگ، منافقانہ طرز زندگی کی ممانعت

منافقین کا ذکر

البقرہ کے دوسرے رکوع کی تیرہ آیات میں منافقین کا ذکر ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان دار نہیں ہیں۔

(البقرہ۔8)

منافقین مدینہ کا تعارف

علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں منافقین مدینہ کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ تمام لوگ مال دار تھے اور مدینہ میں جائیدادیں اور پھیلے ہوئے کاروبار رکھتے تھے۔ مالداری اور تجارت نے ان کو منافع پسند، مصلحت پسند اور دنیا پرست بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینہ پہنچا اور آبادی کے ایک بڑے حصہ نے پورے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ اسلام قبول کر لیا، تو یہ لوگ عجیب امتحان میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مقامی لوگوں کی اکثریت بشمول ان کی اپنی اولاد دین اسلام قبول کر چکی ہے۔ ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی عزت، شہرت سب خاک میں مل جائے گی حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت برپا ہونے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ باقی سارے عرب سے دشمنی مول لے لیں۔ وہ چونکہ ساری دنیا کے معاملات صرف مفاد اور مصلحت ہی کے زاویہ سے دیکھتے اس لیے ان کو اپنے مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ وہ ایمان کا محض زبانی دعویٰ کر لیں تاکہ اپنے آپ کو مردم شماری میں مسلمان ظاہر کر سکیں۔ مدینہ میں رہ کر اعلانیہ غیر مسلم ہونے سے ان کو اپنے ہی خاندان اور قبیلے سے بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ مدینہ کو چھوڑتے تو اپنی جائیداد اور تجارت سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اپنے کفر کیلئے یہ اتنی قربانی دینے کو تیار نہیں تھے۔ مجبوراً مدینہ میں بیٹھ کر بادل نخواستہ نمازیں پڑھنا اور زکوۃ اداء کرنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ دور نبویؐ کے اعتقادی منافق تھے۔ ظاہری طور پر مسلمان تھے مگر ان کی اصل ہمدردیاں دشمنان اسلام کے ساتھ تھیں۔ قرآن مجید نے ان کی اس منافقانہ طرز زندگی کا پردہ چاک کیا اور اس منافقت کو کھول کر بیان کیا۔ غزوہ تبوک نے تمام منافقین کو بے نقاب کر دیا اور کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرا دی۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر منافقین کے خصائل کو بیان کر کے ان کے نفاق سے پردہ اٹھایا گیا۔

مومنین اور منافقین میں فرق:

منافقین کی خصلتیں مومنین کے بالکل برخلاف ہوتی ہیں۔

مومن بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں منافق برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور بھلائیوں سے منع کرتے ہیں۔

مومن سخی ہوتے ہیں منافق بخیل ہوتے ہیں۔

مومن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں۔ منافق یاد الٰہی بھلائے رہتے ہیں۔

منافقین کی علامات

منافقین کی کئی خصلتیں مذکور ہیں: جھوٹ، دھوکہ، عدم شعور، قلبی بیماریاں، سفاہت، احکام الٰہی کا استہزاء، فتنہ وفساد، جہالت، ضلالت، تذبذب۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ، دل میں کچھ، عمل کچھ، عقیدہ کچھ، صبح کچھ اور شام کچھ کشتی کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی ادھر۔

بقول شاعر:

ے سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگو گے؟

نفاق کی اقسام

1۔ اعتقادی نفاق۔ عقیدے میں نفاق موجود ہو۔ ہمیں بہر حال صرف ظاہر پر فیصلہ کرنا ہے۔ حدیث: اذا رائیتم الرجل یعتاد الی المساجد فاشھدولہ بالایمان۔ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ باقاعدگی سے مسجد میں آتا ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اعتقادی نفاق کا معاملہ صرف نبی اکرم ﷺ کے دور کے ساتھ خاص تھا۔ اب ہر شخص یا تو مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ دلوں کا حال صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں لہٰذا کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے شخص پر نفاق کا لیبل لگائے۔

2۔ عملی نفاق۔ احادیث میں مخصوص اعمال کا ذکر ہے جو نفاق کی علامات ہیں۔

منافقین کے دلوں میں بیماری

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ

ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھادیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ (البقرہ۔10)

بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔

نفاق ایک ذہنی کیفیت اور نفسیاتی بیماری کا نام ہے۔

خود فریبی کے شکار لوگ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ (البقرہ۔11)

گھاٹے کے تاجر، ایمان فروش لوگ

اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ (البقرہ۔16)

تجارت سے مراد ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے۔ جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ منافقین نے نفاق کا جامہ پہن کر ہی گھاٹے والی تجارت کی۔ اپنے ضمیر کا سودا کیا، اپنی آخرت کو بھی برباد کیا۔

تیسرا رکوع: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ --- (البقرہ۔21)

رکوع کے تفسیری نکات

ساری انسانیت کو دعوت توحید (یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ)، بندگی رب کا مفہوم، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت، سب سے بڑا گناہ: شرک، توحید کی اقسام، اللہ کی ربوبیت کے دلائل، زمین و آسماں میں اللہ کی نشانیاں، اعجاز القرآن، قرآن کے چیلنج کا ذکر (فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ)۔ نبیٔ اکرمؐ کا اصل معجزہ: قرآن مجید، خسارے والے لوگ: اللہ کے عہد کو توڑنے والے، قطعہ رحمی کرنے والے، فساد پھیلانے والے، روئے زمین پر موجود ساری چیزیں اور نعمتیں انسان کیلئے پیدا کی گئیں (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا)۔

ساری انسانیت کو دعوت توحید

يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

(البقرہ۔21)

بندگی رب کا مفہوم

اثبات وجود الله العلمین

یہ آیت (البقرہ۔21) اللہ تعالیٰ کے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے زمین اور آسمان کی مختلف شکل وصورت مختلف رنگ مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات ان میں سے ہر ایک کا نفع بخش ہونا اور خاص حکمت کا حامل ہونا ان کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت، حکمت، زبردست سطوت اور سلطنت کا ثبوت ہے۔

کائنات کا نظام اللہ کے وجود پر دلیل ہے

؎ کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے

وہی خدا ہے

سورج ایک مقرر راستہ پر پچھلے پانچ ارب سال سے چھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے مسلسل چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا خاندان 9 سیارے، 200 سے زیادہ چاند اور بے شمار اجرام فلکی کا قافلہ اسی رفتار سے جا رہا ہے۔ کبھی نہیں ہوا کہ تھک کر کوئی پیچھے رہ جائے یا غلطی سے کوئی ادھر ادھر ہو جائے۔ سب اپنی اپنی راہ پر اپنے اپنے پروگرام کے مطابق نہایت تابعداری سے چلے جا رہے ہیں۔

اب بھی اگر کوئی کہے کہ نظام کائنات تو ہے لیکن چلانے والا کوئی نہیں، ڈیزائن تو ہے لیکن ڈیزائنر نہیں، کنٹرول تو ہے لیکن کنٹرولر نہیں۔ سسٹم تو ہے مگر سسٹم چلانے والا کوئی نہیں؟

چاند تین لاکھ ستر ہزار میل دور ہونے کے باوجود زمین پر سمندروں کے اربوں، کھربوں ٹن پانیوں کو ہر روز دو دفعہ مدوجزر سے ہلاتا رہتا ہے تاکہ ان میں بسنے والی مخلوق کیلئے ہوا سے مناسب مقدار میں آکسیجن کا انتظام ہوتا رہے، پانی صاف ہوتا رہے، اس میں تعفن پیدا نہ ہو۔ ساحلی علاقوں کی صفائی ہوتی رہے اور غلاظتیں بہہ کر گہرے پانیوں میں چلی جائیں۔ یہی نہیں بلکہ سمندروں کا پانی ایک خاص تناسب سے کھارا ہے تاکہ اس میں اس میں چھوٹے بڑے آبی جانور آسانی سے تیر سکیں اور مرنے کے بعد بدبو اور تعفن پیدا نہ ہو۔ سطح زمین کے نیچے بھی میٹھے پانی کے سمندر ہیں جو کھارے پانی کے کھلے سمندروں سے ملے ہوئے ہیں۔ سب کے درمیان ایک تہہ یا پردہ ہے تاکہ میٹھا پانی میٹھا رہے اور کھارا پانی کھارا۔

اس حیران کن انتظام کے پیچھے کون سی عقل ہے؟ اس توازن کو کون برقرار رکھے ہوئے ہے؟ کیا یہ پانی کی اپنی سوچ تھی یا چاند کا فیصلہ؟

آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے قرآن نے فرمادیا تھا: الشمس والقمر بحسبان۔ کہ سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔(سورۃ رحمٰن۔5)

کیا زمین اس قدر عقلمند ہے کہ اس نے بھی خود بخود لیل ونہار کا نظام قائم کر لیا، خود بخود ہی اپنے محور پر تقریباً 23 ڈگری جھک گئی تاکہ سارا سال موسم بدلتے رہیں کبھی بہار، کبھی گرمی، کبھی سردی اور کبھی خزاں تاکہ اس پر بسنے والوں کو ہر طرح کی سبزیاں، پھل اور خوراک سارا سال ملتی رہیں؟

کیا زمین نے اپنے اندر شمالاً، جنوباً ایک طاقتور مقناطیسی نظام بھی خود بخود ہی قائم کر لیا تاکہ اس کے اثر کی وجہ سے بادلوں میں بجلیاں کڑکیں جو ہوا کی نائٹروجن کو نائٹرس آکسائڈ میں بدل کر بارش کے ذریعے زمین پر پودوں کیلئے قدرتی کھاد مہیا کریں، سمندروں پر چلنے والے بحری جہاز، آبدوزیں، ہوا میں اڑنے والے ہوائی جہاز اس مقناطیس کی مدد سے صحیح سمت کی طرف راستہ حاصل کریں۔ کیا اس کے پیچھے کوئی قوت کار فرما نہیں یا پھر یہ بھی زمین کی اپنی سوچ ہے؟

کیا زمین نے خود بخود سورج، ہوا اور سمندروں سے مل کر سمجھوتا کر لیا کہ سورج کی گرمی سے آبی بخارات اٹھیں گے، ہوائیں اربوں ٹن پانی کو اپنے دوش پر اٹھا کر پہاڑوں اور میدانوں تک لائیں گی، ستاروں سے آنے والے ریڈیائی ذرے بادلوں میں موجود پانی کو اکھٹا کر کے قطروں کی شکل دیں گے اور پھر یہ نمکین پانی میٹھا بن کر خشک میدانوں کو سیراب کرنے کیلئے برسے گا، جب سردیوں میں پانی کی کم ضرورت ہو گی تو پہاڑوں پر برف کے ذخیرے کی صورت میں جمع ہوتا جائے گا، گرمیوں میں جب زیادہ پانی کی ضرورت ہو گی تو یہ پگھل کر ندی نالوں اور دریاؤں کی صورت میں اہل زمین کو سیراب کرے گا۔ کیا یہ شاندار نظام خود بخود بن گیا؟ کیا اس نظام کو کوئی بنانے والا نہیں؟ کوئی چلانے والا نہیں؟

حیوانات ہوں یا نباتات، ان کے بیج اور ڈی، این، اے کے اندر ان کا پورا نقشہ، ڈرائینگ موجود ہے، یہ کس کی نقشہ بندی ہے؟

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ورنہ پوری کائنات اللہ تعالٰی کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے۔(سنریهم آیتنا فی الآفاق و فی انفسهم۔۔۔)

ایک صحرانشین نے اللہ کو کیسے پہچانا؟

کسی اعرابی (بدوی) سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی موجودگی کی کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا:

ان البعر لیدل علی البعیر۔ وان اثر الا قدام لیدل علی المسیر۔ فسماء ذات ابراج وارض ذات فجاج۔ وبحار ذات امواج الا یدل ذالک علی وجود اللطیف الخبیر۔

یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو جاتا ہے اور پاؤں کے نشان زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی آدمی گذر کر گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان، یہ راستوں والی زمین، یہ موجیں مارنے والے سمندر اللہ تعالیٰ باریک بین اور باخبر کے وجود پر دلیل نہیں ہوسکتے؟

حضرت امام مالک (رح) سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے آپ نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا، آوازوں کا جداگانہ ہونا، نغموں کا الگ ہونا، ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے۔

امام ابو حنیفہ (رح) سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بہت بڑی کشتی ہے اس کا نہ کوئی نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گزر جاتی ہے ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے نہ اس کا کوئی ملاح ہے نہ منتظم۔ سوال کرنے والے دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عقلمند ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی اتنے بڑے نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر، ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان وزمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اور ان کا مالک حاکم خالق کوئی نہ ہو؟

حضرت امام شافعی (رح) سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ توت کے پتے ایک ہی ہیں ایک ہی ذائقہ کے ہیں کیڑے اور شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں ہرن وغیرہ سب اس کو چباتے کھاتے اور چرتے چگتے ہیں اسی کو کھا کر ریشم کا کیڑا ریشم تیار کرتا ہے مکھی شہد بناتی ہے، ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اسی کو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ مانتے ہیں وہی موجد اور صانع ہے۔

ابن معتز شاعر کا قول ہے:

؎ فیا عجبا کیف یعصی الالہ،

ام کیف یجحدہ الجاحد

وفی کل شی لہ آیتہ،

تدل علی انہ واحد

یعنی تعجب ہے کس طرح اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور کس طرح اس کا انکار کیا جاتا ہے حالانکہ ہر چیز میں نشانی ہے جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔

سب سے بڑا گناہ: شرک

حدیث: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ بخاری، مسلم

أَتَدْرِي مَا حَقُّ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ؟ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ بندے اسی کی عبادت کریں اور کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

توحید کی اقسام

توحید کی تین قسمیں:

توحید ربوبیت،

توحید الوہیت،

توحید صفات

۱۔ توحید ربوبیت کا مطلب ہے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، رازق، اور مدبر صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس توحید کو ملاحدہ و زنادقہ کے علاوہ تمام لوگ مانتے ہیں حتیٰ کہ مشرکین بھی اس کے قائل رہے ہیں۔ (قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ۔۔۔۔فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۔۔۔ (یونس)

۲۔ توحید الوہیت کا مطلب ہے کہ عبادت کی تمام اقسام کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ۔۔۔

۳۔ توحید صفات کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں ان کو تسلیم کریں اور وہ صفات اس انداز میں کسی اور کے اندر نہ مانیں، مثلا جس طرح اس کی صفت علم غیب ہے یا ہر ایک کی فریاد سننے پر وہ قادر ہے۔ ان تمام صفات الٰہیہ میں سے کوئی صفت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اندر تسلیم نہ کی جائیں۔

ے وہ اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے بندے کو نجات

زمین و آسمان اللہ کی نشانیاں

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت (کی طرح) بنایا اور آسمان کی طرف سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کے لئے (انواع واقسام کے) پھل پیدا کئے، پس تم اللہ کے لئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم (حقیقتِ حال) جانتے ہو۔(البقرہ۔22)

زمین گول ہونے کے باوجود (ہمارے رہنے سہنے کیلئے) ہموار اور برابر ہے۔

زمین مسلسل گردش میں ہونے کے باوجود ہمارے لئے ساکن بنادی گئی تاکہ ہم اس میں رہ سکیں۔ یہ اللہ کی قدرت اور نشانیوں میں سے ہے۔

اعجاز قرآن

قرآن کا چیلنج

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

ہم نے اپنے بندے پر جو کچھ اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنالاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالٰی کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو۔(البقرہ۔23)

نبی اکرم ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید

حدیث: مَا مِنْ نَبِيَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ إِلَّا قَدْ أُعْطِيَ مِنَ الآيَاتِ مَا آمَنَ عَلَى مِثْلِهِ الْبَشَرُ، وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُه وَحْيًا أَوْحَاهُ اللهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَة۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو ایسے معجزے دیئے گئے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور میرا معجزہ اللہ کی وحی یعنی قرآن پاک ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ میرے تابعدار بہ نسبت اور نبیوں کے بہت زیادہ ہوں گے۔(بخاری، مسلم)

باقی انبیاءؑ دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے معجزے بھی ختم ہو گئے۔ سلیمانؑ کا تخت ختم ہو گیا، نوح کی کشتی، موسیٰؑ کی لاٹھی، عیسیٰؑ کے معجزات ختم ہو گئے مگر حضورؐ دنیا سے چلے گئے مگر آپؐ کا معجزہ (قرآن) باقی ہے کیوں؟ کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت ابھی باقی ہے۔

ایمان اور نیک اعمال

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب انہیں وہاں کا کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا اور انہیں ہم شکل پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرہ۔25)

خسارے والے لوگ: اللہ کے عہد کو توڑنے والے

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (البقرہ۔27)

عہد الٰہی سے کیا مراد ہے؟

بعض نے عہد الٰہی سے مراد حقوق اللہ کی ادائیگی مراد لیا ہے۔

اس سے مراد وہ تمام عہد و پیمان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لئے ہیں، جن میں سب سے پہلا وہ عہد ربوبیت ہے جو ازل میں تمام ارواح کو حاضر کر کے لیا گیا تھا، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جس کے جواب

میں سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا: بَلٰی کیوں نہیں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں۔ بندوں کی جانب سے اس اقرار میں تمام احکام الٰہی کی اطاعت، تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام ناجائز چیزوں سے اجتناب شامل ہے۔

بعض نے اس کے اندر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو بھی شامل کیا ہے کیونکہ وہ بھی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔(من یطع الرّسول فقد اطاع الله)

حدیث: حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اس بات پر عہد اور بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، پنج وقتہ نماز کی پابندی کریں گے، اپنے امراء کی جائز امور میں اطاعت کریں گے اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے (سنن ابوداؤد)

روایت میں آتا ہے کہ جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے، ان کی پابندی عہد کا یہ حال تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے دوران ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو وہ کسی انسان کو کہنے کے بجائے خود سواری سے اتر کر اٹھاتے تھے۔

عدم سے وجود میں لانے والی ہستی

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(البقرہ۔28)

اس آیت میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے کو عبادت میں شریک کیسے کر سکتے ہو؟ جبکہ تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا ایک وہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کئے گئے؟ یا یہ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں؟ انہوں نے زمین و آسمان بھی پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ بے یقین لوگ ہیں۔ اور جگہ ارشاد ہوتا ہے آیت: ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیًا مذکورا۔ یقینا انسان پر وہ زمانہ بھی آیا ہے جس وقت یہ قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔

سارا جہاں تیرے لیے، تو خدا کیلئے

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًاثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ

اللہ وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا، پھر وہ (کائنات کے) بالائی حصوں کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے انہیں درست کر کے ان کے سات آسمانی طبقات بنا دیئے، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (البقرہ۔29)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی ہر چیز اصلاً جائز اور حلال ہے سوائے ان چیزوں کے جن کو حرام اور ممنوع قرار دے دیا گیا۔

وفیه دلیل علیٰ ان الاصل فی الاشیاء المخلوقه الاباحه حتیٰ یقوم الدلیل۔۔۔ زمین کی اشیاء مخلوقہ کے لئے اصل یہ کہ وہ حلال ہیں۔ الّا یہ کہ کسی چیز کی حرمت دلیل سے ثابت ہو۔ (فتح القدیر)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے، کوئی چیز بے کار اور فضول نہیں۔ وہ چیزیں جو بظاہر موذی اور حرام ہیں وہ بھی بالواسطہ انسانوں کو فائدہ دے رہی ہیں۔

؎ نہیں ہے کوئی چیز نکمّی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوتھا رکوع: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔۔۔ (البقرہ۔30)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں منصب انسانیت، انسان کی تخلیق کا مقصد، شیطانی رویے (سرکشی، تکبر، حسد) اور بندگانہ رویے (توبہ، رجوع الی اللہ، ہدایت کی پیروی) کو بیان کیا گیا۔

انسان کے اعزازات

اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان آدمؑ کو فضیلت اور عظمت بخشنے کیلئے اس پر کئی احسانات کیے:

1۔ انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا۔

2۔ اس کو زمین پر اللہ کا نائب بنایا گیا۔

3۔ فرشتوں سے اس کو سجدہ کروایا گیا۔

4۔ انسانیت کا آغاز علم کی روشنی سے ہوا۔ پہلے انسان کو کو تمام اشیاء کا علم سکھایا گیا۔

5۔ جنّت کو انسان کا پہلا مسکن بنایا گیا۔

6۔ غلطی کے بعد توبہ کا موقع عطا کیا گیا۔ انسان کی توبہ کو قبول کیا گیا۔

7۔ دنیا کا پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔

7۔ انسان کا اصل مقام جنت ہے۔ زمین پر آسمانی ہدایت کی پیروی کی صورت میں انسان کو دوبارہ جنت کا حقدار بنایا گیا۔

تخلیق انسانی کی ابتدا

تخلیق آدم

قصہ آدم و ابلیس۔ کائنات میں بنی نوع انسان کا مقام، خلیفہ فی الارض۔ انسان، اللہ کا نائب

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا: کیا تُو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں فرمایا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ (البقرہ۔30)

خلافت آدم کا مفہوم

آدم (علیہ السلام) کی دوسری مخلوقات پر وجہ فضیلت: علم

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا۔۔۔(البقرہ۔31)

ہمارا علم محدود

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے۔ (البقرہ۔32)

ہر عالم کے اوپر ایک بڑا عالم (اللہ) موجود ہے۔ وفوق کل ذی علمٍ علیم۔

تعارف ابلیس

ابلیس کا گناہ۔ تکبر

سجدے سے انکار

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جھک جاؤ، تو سب جھک گئے، مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ (البقرہ۔34)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں سب سے پہلا گناہ یہی تکبر ہے جو ابلیس سے سرزد ہوا۔

حدیث: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ۔

صحیح حدیث میں ہے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔

آدمؑ اور حواؑ جنت میں

جنّت میں امتحان

البقرہ۔35

سفر ارضی کا آغاز

زمین پر آمد

دنیا میں عارضی قیام:

وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ

اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔ البقرہ۔36

آدمؑ و حواؑ کی توبہ

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔(البقرہ۔37)

توبہ و استغفار: سنت انبیاءؑ

غلطی اور لغزش کے بعد توبہ شیوہ انبیاءؑ ہے۔ لیکن غلطی کے بعد غلطی پر ڈٹ جانا اور اپنے گناہ کی تاویلیں کرنا ابلیس کا طریقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ توبہ کے کلمات کا متن

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

اہل زمین کو ہدایت الٰہی کی پیروی کا حکم (البقرہ۔38)

پانچواں رکوع: يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔۔۔ (البقرہ۔40)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں سچ اور جھوٹ یعنی حق اور باطل کی آمیزش کی ممانعت، حق کو چھپانا، باجماعت نماز کی اہمیت، دوسروں کو نیکی کی دعوت دینے کے ساتھ خود بھی اس بھی اس پر عمل پیرا ہو، صبر اور نماز کے ذریعے اللہ کی مدد حاصل کرو۔ نماز میں خشوع اور خشیت الٰہی پیدا کرو۔

جھوٹ اور سچ کو نہ ملاؤ

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔(البقرہ۔42)

سورۃ آل عمران کے اندر اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ ہمیشہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے اور حق اور سچ کو نہیں چھپائیں گے: لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تھی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے صاف صاف بیان کرو گے اور (جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے) اسے نہیں چھپاؤ گے۔(آل عمران۔187)

حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط اور تلبیس کرنا حرام ہے۔

آیت: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔۔ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈ مڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں۔

باجماعت نماز کی اہمیّت

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (باجماعت نماز ادا کرو)۔(البقرہ۔43)

رکوع والی نماز: امّت مسلمہ کی خاص عبادت

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں کیا جاتا ہے۔

آیت کے معنٰی یہ ہیں کہ رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی باجماعت نماز ادا کرو۔ یہاں ایک بات یہ قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ حالانکہ نماز میں سجدہ بھی ہے، قیام بھی ہے، تشہد بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ باقی مذاہب (مثلاً اہل کتاب) کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا مگر رکوع نہیں تھا۔ رکوع صرف اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس لئے راکعین کے لفظ سے امت مسلمہ کے نمازی مراد ہوں گے جن کی نماز میں رکوع بھی ہے۔

باجماعت نماز کے احکام

حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ له الا من عذر (صححه القرطبی) یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو۔

اگر کوئی شخص مسجد کے قریب رہنے کے باوجود یا مسجد میں آنے کی استطاعت کے باوجود تنہا نماز پڑھ لے اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی مگر ایک تو وہ باجماعت نماز کے ثواب سے محروم رہے گا اور دوسرا سنّت کی خلاف ورزی ہو گی اور اگر ترک جماعت کی عادت بنا لے تو سخت گنہگار ہے۔

باجماعت نماز کی اہمیت: عبداللہ بن مسعودؓ کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کریم ﷺ کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن ھدیٰ میں سے ہے اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کرکے فرمایا) تو تم اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بین النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

مولانا رومیؒ کی حکایت: چراغ ابلیس

نیکی پر خود بھی عمل پیرا ہو

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم (اللہ کی) کتاب (بھی) پڑھتے ہو، تو کیا تم نہیں سوچتے؟ (البقرہ۔44)

چراغ تلے اندھیرا

دوسروں کو نصیحت، خود میاں فضیحت

طبرانی کی معجم کبیر میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عالم لوگوں کو بھلائی سکھائے اور خود عمل نہ کرے اس کی مثال چراغ جیسی ہے کہ لوگ اسی کی روشنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن وہ خود جل رہا ہے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ معراج والی رات میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو کہا گیا کہ یہ آپ کی امت کے خطیب، عالم اور مبلغ ہیں جو لوگوں کو بھلائی سکھاتے تھے مگر خود عمل نہیں کرتے تھے۔

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ آدمی اس وجہ سے فریضہ دعوت و تبلیغ چھوڑ دے کہ میں کامل انسان نہیں۔ حدیث کے اندر آتا ہے کل بنی آدم خطاؤن، وخیر الخطائین التوابون۔ ہر انسان خطاکار ہے اور بہترین خطاکار وہ ہے جو توبہ کرتا ہے۔

کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی)

چنانچہ امام مالک نے حضرت سعید بن جبیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر شخص یہ سوچ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسن کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں۔ (قرطبی)

ایک حدیث کے اندر ہدایت کو قبول کرنے کی مثال زمین سے دی گئی جو تین طرح کی ہے۔ زرخیز زمین، پتھریلی زمین، اور بنجر زمین۔ پتھریلی زمین خود تو بارش کے پانی سے فائدہ نہیں اٹھاتی مگر پانی کو روک لیتی ہے جس سے اللہ کی مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہی مثال اس آدمی کی ہے جو ہدایت سے خود تو فائدہ نہیں اٹھاتا مگر دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بعض دفعہ دوسروں کو دعوت دینے کی برکت سے بھی خود انسان کی اپنی اصلاح ہو جاتی ہے اور انسان خود بھی عمل شروع کر دیتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں جب اپنے اندر کوئی خامی یا کمزوری دیکھتا ہوں تو اس کی زور و شور سے تبلیغ شروع کر دیتا ہوں جس سے میری اس خامی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

علماء کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے قول وفعل میں تعارض نہیں ہوتا۔حاتم اصمؒ کہتے ہیں کہ قیامت والے دن اس عالم سے زیادہ حسرت والا کوئی نہیں ہوگا جس کی وجہ سے دوسروں نے علم سیکھا اور اس پر عمل کیا وہ تو کامیاب ہوگئے اور وہ خود عمل نہ کرنے کی وجہ سے ناکام رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاس بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کیلئے وعظ ونصیحت کرنا جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ خطیب اور مربّی کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے۔

بہر حال یہ ایک اہم آیت ہے جس کو دوران دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭوَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ

صبر اور نماز سے مدد لو،بیشک نماز ایک سخت مشکل کام ہے سوائے ان لوگوں کے لئے جو خشوع وخضوع والے ہیں۔

البقرہ-45

صبر اور نماز:بندہ مومن کے دو ہتھیار

اس آیت میں حکم فرمایا جارہا ہے کہ تم دنیا اور آخرت کے کاموں میں نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کیا کرو۔

صلوٰۃ کے لفظی معنٰی دعا کے ہیں اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے۔

صبر کے مفہوم میں کئی چیزیں شامل ہیں۔روزہ رکھنا بھی صبر کرنا ہے اسی لئے رمضان کو صبر کا مہینہ (وھو شھر الصبر) کہا گیا ہے۔

صبر سے مراد (صبر عن المعصیہ) گناہوں سے رک جانا بھی ہے۔اس آیت میں اگر صبر سے یہ مراد لی جائے تو برائیوں سے رکنا اور نیکیاں کرنا دونوں کا ذکر آگیا،نیکیوں میں سب سے اعلیٰ چیز نماز ہے۔حضرت عمر بن خطاب (رض) فرماتے ہیں صبر کی دو قسمیں ہیں مصیبت کے وقت صبر اور گناہوں کے ارتکاب سے صبر۔

صبر اور نماز ہر بندہ مومن کیلئے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ نماز کے ذریعے سے ایک مومن کا رابطہ و تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے۔ جس سے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ صبر کے ذریعے سے کردار کی پختگی اور دین میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے نبی اکرم ﷺ کو جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا آپؐ فوراً نماز کا اہتمام فرماتے۔ (فتح القدیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کی لڑائی کی رات میں نے دیکھا کہ ہم سب سو گئے تھے مگر اللہ کے رسول ﷺ ساری رات نماز اور دعا میں مشغول رہے۔

اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ۔۔۔ نماز بھاری اور مشکل ہے سوائے خشوع اختیار کرنے والوں کے

خشوع سے کیا مراد ہے؟

خشوع ایک قلبی کیفیت کا نام ہے۔ خشوع سے مراد خوف خدا، قلبی سکون و انکساری اور تواضع ہے بشرطیکہ مصنوعی نہ ہو۔

تقوٰی کی اداکاری کرنے کا نام خشوع نہیں۔ اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع نہیں۔ بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے فرمایا: سر اٹھا خشوع دل میں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی کا ارشاد ہے کہ موٹا پہننے موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں۔ بلکہ سب کو ایک نظر سے دیکھنا یعنی سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا اور فرائض کو پورا کرنے کا نام خشوع ہے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے (قرطبی)

حدیث کے اندر آپؐ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: التقوٰی ھٰهنا۔۔ تقوٰی یہاں ہے۔

قرآن میں خشوع کی کیفیت کو تقوٰی کا لباس بھی کہا گیا۔ (ولباس التقوٰی ذٰلک خیر)

صرف جبہ و دستار پہننے سے خشوع حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظاہر و باطن میں خوف خدا سے خشوع ملتا ہے۔

بقول شاعر:

ے لباس زہد کی ظاہر فریبیوں پہ نہ جا

کہ چڑھے ہوئے ہیں اندھیروں پر روشنی کے غلاف

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسنون لباس، داڑھی جو کہ مسنون اعمال ہیں ان کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ الگ مستقل مسنون اعمال ہیں جن کی اپنی اہمیت اور الگ اجر و ثواب ہے۔

نماز میں خشوع سے کیا مراد ہے؟

ہر شے کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک باطنی حقیقت۔ نماز بھی ایک ظاہری صورت رکھتی ہے اور ایک باطنی حقیقت۔ نماز کی اس باطنی حقیقت کا نام قرآن وسنت کی زبان میں خشوع و خضوع ہے۔ نماز میں خشوع و خضوع سے مراد وہ کیفیت ہے کہ دل میں اللہ کی ذات مستحضر ہو، اَعضاء وجوارح پر سکون ہوں، پوری نماز میں جسم کعبہ کی طرف اور دل ربِ کعبہ کی طرف متوجہ ہو۔ گویا: ان تعبد الله كانك تراه، فان لم تكن تراه فانه يراك۔۔ اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

چھٹا رکوع: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔۔۔ (البقرہ۔47)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات کا ذکر، تخویف قیامت، شفاعت باطلہ، تاوان دیکر نجات کے عقیدے کا ابطال، فرعون سے نجات، بچھڑے کی پوجا، تورات کا ذکر، مطالبہ دیدار الٰہی، بادل کا سایہ اور من وسلوٰی کا نزول کا ذکر ہے۔

قرآنی اسلوب: قرآن گذشتہ قوموں کے حالات عبرت، نصیحت اور سبق حاصل کرنے کیلئے کرتا ہے نہ کہ قصہ گوئی اور تاریخ دانی کیلئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن جزئیات پر بحث نہیں کرتا، شہروں کے نام اور واقعات کی تاریخ اور دن نہیں بتاتا۔ ان کو بیان کرنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ آج کے مسلمان اپنے آپ کو ان اعتقادی گمراہیوں، گناہوں، کمزوریوں اور غلط فہمیوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں جن کا شکار پچھلی قومیں یا افراد ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ سوائے قصہ یوسفؑ کے قرآن میں کسی نبی یا قوم کا ایک جگہ تذکرہ بیان نہیں کیا گیا۔ نوحؑ کا تذکرہ 28 مقامات پر کیا گیا۔ ابراہیمؑ کا تذکرہ 25 مقامات پر کیا گیا۔ موسیٰؑ کا تذکرہ 58 مقامات پر کیا گیا۔ آدمؑ کا تذکرہ 25 مقامات پر آیا۔

بنی اسرائیل سے خطاب

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ

اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کیئے اور یہ کہ میں نے تمھیں سب لوگوں پر فضیلت دی۔ (البقرہ۔47)

بنی اسرائیل کون تھے؟

اسرائیل (بمعنی عبداللہ) حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب یا دوسرا نام تھا۔ بنی اسرائیل سے مراد یعقوبؑ کی آل، اولاد۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے جن سے بارہ قبیلے بنے اور ان میں بکثرت انبیاء اور رسل تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب میں ان کی گزشتہ تاریخ اور علم و مذہب سے وابستگی کی وجہ سے ایک خاص مقام حاصل تھا اس لئے انہیں گزشتہ انعامات الٰہی یاد کرائے جا رہے ہیں۔

یوم حشر کا منظر

وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ۔

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ ان کے لیے کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ اس کی طرف سے بدلہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ البقرہ۔48

بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات و احسانات

فرعون سے نجات،

آسمانی کھانا (من و سلویٰ کا اہتمام)،

پانی کے چشمے،

تپتے صحرا میں بادلوں کا سایہ

احسانات الٰہیہ کی تفصیل

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰىؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰـكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوا اتارا (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ' اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔(البقرہ۔57)

ساتواں رکوع: وَاِذِاسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ۔۔۔ (البقرہ۔60)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں موسیٰؑ کی پانی کی دعا، بارہ چشموں کا جاری ہونا، احسانات کے جواب میں کفران نعمت، ناشکری۔ اور اس کے نتیجے میں مسکنت اور ذلت کا ذکر ہے۔

موسیٰؑ کی اپنی قوم کیلئے پانی کی دعا

وَاِذِاسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًاؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْؕ ۔۔۔ (البقرہ۔60)

یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کونسی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔۔۔۔(البقرہ۔60)

خشک سالی، قحط سالی میں نماز استسقاء کی ادائیگی سنت ہے۔ اگر باقاعدہ نماز استسقاء کا اہتمام نہ ہو سکے تو کسی بھی وقت یا عام نمازوں میں یا جمعہ کے موقع پر بارش کیلئے خصوصی دعا جا سکتی ہے۔

نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ البقرہ۔60

انعامات کے جواب میں ناشکری، بے صبری، نعمتوں کی ناقدری اور سرکشی،

آٹھواں رکوع: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ۔۔۔ (البقرہ-62)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں فرمایا گیا کہ اسلام سب کیلئے ہے اور اس کی دعوت عام ہے۔ دین اسلام میں داخلے کے دروازے کسی کیلئے بند نہیں ہیں۔ کوئی بھی انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب کا پیروکار ہو یا نہ ہو وہ اس کی تعلیمات کو قبول کر کے اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ اخروی کامیابی کا اصول ایمان و اعمال صالح ہے۔ یوم السبت کی نافرمانی اور سزاء، گائے کے بارے میں حکم میں پس و پیش اور بادی النظر میں غیر ضروری سوالات سے گریز کی تلقین اس رکوع میں شامل ہے۔

وسیع البنیاد دعوت

ہدایت کی طرف دعوت عامہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ-62)

جو کوئی مسلمان اور یہودی اور نصرانی اور صابئی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام بھی کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں موجود ہے اور ان پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ البقرہ-62

فرماں برداروں کے لئے بشارت

کامیابی کا پیمانہ۔ حسب و نسب نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالح ہے۔

صابئی کون؟

صابئین۔ صابی کی جمع ہے۔ صابی کے معنی ایک تو بے دین اور لامذہب کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو یقینا ابتدا میں کسی دین حق کے پیرو رہے ہوں گے اسی لئے قرآن میں یہودیت و عیسائیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بعد میں ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آ گئی یا یہ کسی بھی دین کے پیرو نہ رہے۔ اس لئے لامذہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔ حقیقت حال کا علم تو محض اللہ تعالی کو ہے مگر بظاہر یہی قول اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ یہودی تھے نہ نصرانی نہ مجوسی نہ مشرک بلکہ یہ لوگ فطرت پر تھے کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے یعنی ان لوگوں نے تمام مذاہب ترک کر دیئے تھے بعض علماء کا قول ہے کہ صابی وہ ہیں جنہیں کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ واللہ اعلم

عہد الٰہی سے رو گردانی

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

پھر اس (عہد اور تنبیہ) کے بعد بھی تم نے رو گردانی کی، پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً تباہ ہو جاتے۔(البقرہ۔64)

شرعی احکام میں حیلہ بازی کی ممانعت

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ۔

تم ان لوگوں کو بھی جانتے ہو جنہوں نے ہفتہ کے دن کے معاملہ میں زیادتی سے کام لیا تو ہم نے حکم دے دیا کہ اب ذلّت کے ساتھ بندر بن جائیں۔(البقرہ۔65)

ہفتے والے کون تھے؟

یہ ایلہ بستی کے باشندے تھے ان پر ہفتہ کے دن تعظیم ضروری کی گئی تھی اس دن کا شکار منع کیا گیا تھا۔ اور مچھلیاں اسی دن بکثرت آیا کرتی تھیں تو انہوں نے مکاری کی۔ گڑھے کھود لئے۔ رسیاں اور کانٹے ڈال دیئے۔ ہفتہ والے دن مچھلیاں آ جاتیں اور گڑھوں میں پھنس جاتیں۔ اتوار کو جا کر وہ ان کو پکڑ لیتے۔ اس جرم اور حیلہ سازی پر اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں بدل دیں۔

ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں صورتیں نہیں بدلی تھیں بلکہ دل مسخ ہو گئے تھے۔ یہ صرف بطور مثال کے ہے جیسے عمل نہ کرنے والوں کو گدھوں سے مثال دی ہے۔(کانھم حمر مستنفرہ۔۔74:50 اور دوسری جگہ مثال دی گئی۔۔ کمثل الحمار۔۔62:5)۔ اسی طرح بصیرت سے عاری لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ دل اندھے ہیں۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ(22:46)

بہر حال چاہے ان پر یہ بگاڑ کا عذاب جسمانی طور پر آیا یا ذہنی طور پر لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ یہ عذاب شدہ لوگ اس کے بعد صرف چند دن تک زندہ رہ سکے۔ اس میں معاملے میں ایک حدیث صحیح مسلم میں موجود ہے جس سے اس

کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے حضور ﷺ سے بندروں کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ قوم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو ان کی نسل نہیں چلتی (بلکہ چند روز میں ہلاک ہو کر ختم ہو جاتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں (لہٰذا ان سے اس عذاب کا کوئی جوڑ نہیں)۔

اس آیت سے جو سبق ملتا ہے کہ دینی احکامات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ ان کے اندر حیلہ سازی کر کے ان پر عمل نہ کرنا اللہ کے غیض و غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ اس آیت سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم شرعی باطل ہو جائے حرام ہے۔

گائے کا واقعہ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً۔۔۔(البقرہ۔67)

غیر ضروری سوالات کی ممانعت

حدیث: ایک دفعہ حضور ﷺ نے حج کی فرضیت کے بارے میں لوگوں کو آگاہ فرمایا۔ اس پر ایک آدمی نے سوال پوچھا کیا حج ہر سال فرض ہے۔ آپؐ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال حج واجب ہو جاتا اور تم سے یہ نہ ہو سکتا۔ (مسلم)

نواں رکوع: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۔۔۔ (البقرہ۔72)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں گائے کے واقعے کی مزید تفصیلات جس میں مجرم تک پہنچنے کیلئے معجزانہ تفتیش کا ذکر، شقاوت قلبی کا ذکر، باغیانہ کردار کا تجزیہ، کلام اللہ میں تحریف اور تبدیلی کا ذکر، نجات کا اصول، اخروی لحاظ سے خوش فہمی میں مبتلا لوگوں کا تذکرہ۔ کسی فرد یا گروہ سے نسبت اخروی نجات کیلئے کافی نہیں۔ اللہ سے جھوٹی امیدیں نہ لگاؤ۔ دنیا کمانے کیلئے کلام اللہ میں تحریف، مذہب کے نام پر دھوکہ دہی کا تذکرہ۔ اس کے بعد اصحاب النّار اور اصحاب الجنّۃ کا اجمالی تذکرہ شامل ہے۔

پتھر دل والوں کا تذکرہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْھٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔(البقرہ۔74)

پھر اسکے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا کہ وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں پھر ان سے پانی نکلتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔(البقرہ۔74)

سنگدلی کے نقصانات

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ان اللہ رفیق یحب الرفق۔

اللہ تعالیٰ نرم دل ہیں اور نرم دلی کو پسند فرماتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ باتیں نہ کیا کرو کیونکہ باتوں کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور سخت دل والا اللہ سے بہت دور ہو جاتا ہے۔(ترمذی)

بدبختی کی چار علامات

بزار میں حضرت انس سے مرفوعاً روایت ہے کہ چار چیزیں بدبختی اور شقاوت کی علامتیں ہیں:

1۔ آنکھوں کا خشک ہو جانا یعنی خوف خدا سے آنکھوں سے آنسو نہ بہنا۔

2۔ دل کا سخت ہو جانا۔ رحمدلی کا نہ ہونا، دوسروں پر ترس نہ کرنا

3۔ طول امل: امیدوں کا بڑھ جانا۔

4۔ والحرص الدنیا: دنیا کی حرص پیدا ہو جانا۔ یعنی لالچی بن جانا۔

جنتی لوگ کون؟

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔(البقرہ۔82)

دسواں رکوع: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔۔۔(البقرہ۔83)

رکوع کے تفسیری نکات

دس نکاتی عہدنامہ، میثاق الٰہی میں شامل دس احکامات: 1۔توحید، 2۔والدین سے حسن سلوک، 3۔صلہ رحمی، تعلقات میں حسن سلوک، 4۔یتیموں کی خبر گیری، 5۔مسکینوں سے حسن سلوک، 6۔دوسرے لوگوں سے اچھے انداز میں گفتگو کرنا۔(قولوللنّاس حسنا)، 7۔نماز قائم کرنا، 8۔زکوٰۃ ادا کرنا، 9۔قتل نفس کی ممانعت، 10۔جلاوطنی کی ممانعت۔

جزوی ایمان کی مذمت۔(اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔۔۔)

دین کو بیچ کر دنیا کمانے والوں کی مذمت۔

عہد الٰہی کے دس احکامات

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔

اور جب ہم نے اولاد یعقوبؑ سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے اچھا سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا پھر چند آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو جلاوطن کرنا پھر تم نے اقرار کیا اور تم خود گواہ ہو۔(البقرہ۔83-84)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کئی احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی وخوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ شامل ہیں۔

میثاق الٰہی میں شامل دس احکامات

1۔توحید،

2۔والدین سے حسن سلوک

3۔صلہ رحمی، تعلقات میں حسن سلوک،

4۔یتیموں کی خبر گیری

5۔مسکینوں سے حسن سلوک،

6۔دوسرے لوگوں سے اچھے انداز میں گفتگو کرنا۔(قولوللنّاس حسنا)

7۔نماز قائم کرنا،

8۔زکوٰۃ ادا کرنا،

9۔قتل نفس کی ممانعت

10۔جلاوطنی کی ممانعت

جزوی ایمان کی مذمت

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍۚ۔۔۔

کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے۔(البقرہ۔85)

دین کو بیچ کر دنیا کمانے والے

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیا کی زندگی خریدلی ہے، پس نہ ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی ان کو مدد دی جائے گی۔(البقرہ۔86)

حدیث: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ فتنوں کے دور میں انسان صبح کو مومن ہو گا مگر (پروپیگنڈے کا شکار ہو کر) شام کو کافر ہو گا، فرمایا:يبيع دينه بعرض من الدنيا۔کہ اپنے دین کو بیچ کر دنیا خرید لے گا۔(مسلم، کتاب الایمان)۔

وہ اس طرح کہ وہ دنیا کے معمولی سے سازوسامان کی خاطر اپنے دین کو بیچ دے گا، اپنی جھوٹی شہرت کے لئے، مال کی طمع میں وہ اپنے دین، اپنے مشن، اپنے مقصد زندگی کا سودا کر دے گا۔

گیارہوں رکوع:وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ۔۔۔(البقرہ۔87)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں موسیٰؑ، عیسیٰؑ کا ذکر، انبیاؑ کی نافرمانی، تکذیب، دنیاپرستی اور سمع واطاعت کا ذکر ہے۔

صرف اپنے فرقے پر نہیں بلکہ اللہ کے نازل کردہ احکامات (دین) پر ایمان لاؤ۔(آمنوبماانزل اللہ۔۔)

عناد وتکبر اور خودپرستانہ رویہ

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۔

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد بھی پے درپے رسول بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں دیں اور روح لقدس سے اس کی تائید کی کیاجب تمہارے پاس کوئی وہ حکم لایا جسے تمہارے دل نہیں چاہتے تھے توتم اکڑ بیٹھے پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کیا۔(البقرہ۔87)

سمع واطاعت

البقرہ۔93

اللہ تمام اعمال سے باخبر ہے

﴿ وَٱللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴾ اور اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہاہے۔البقرہ۔96

بارھواں رکوع: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ۔۔۔(البقرہ۔97)

جبرائیلؑ روح القدس اور اللہ کے امین فرشتے ہیں۔اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کے دل میں اللہ کی وحی پہنچانے پر مقرر ہیں۔

اس رکوع کے دوسرے حصے میں جادو اور اس کے متعلقہ اعمال کی مذمت بیان کی گئی۔

صحیح حدیث میں ہے حضور ﷺ رات کو بیدار ہوتے تو یہ دعافرماتے:

اللَّهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ فَاطِرَ السَّموَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ، اهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلى صِرَاطٍ مُسْتَقِيم

اے اللہ، اے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب، اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، اے چھپے کھلے کے جاننے والے۔ اپنے بندوں کے اختلاف کا فیصلہ تو ہی کرتا ہے، اے اللہ اختلافی امور میں اپنے حکم سے حق کی طرف میری رہبری کر تو جسے چاہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

جادو کی مذمت

جادو اور اس کے متعلقہ اعمال کفر اور شرک کے دائرے میں آتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۣوَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭلَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز (جادو) کا خریدار بنا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور وہ چیز بہت بری ہے جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچا کاش وہ جانتے۔(البقرہ۔102

حدیث:مَنْ أَتَى كَاهِنًا أَوْ سَاحِرًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلّم

جو شخص کسی کاہن یا جادوگر کے پاس جائے اور اسکی بات کو سچ سمجھے اس نے محمد ﷺ پر اتری وحی کے ساتھ کفر کیا۔(بزار) یہ حدیث صحیح ہے اور اسکی تائید میں اور احادیث بھی ہیں۔

جادو کرنے والا اور کرانے والا دونوں سخت گناہ گار ہیں۔

اگر کسی پر جادو کا اثر ہو تو اسے صرف قرآنی آیات اور مسنون دعاؤں سے ہی دور کرنا چاہیئے۔

غیر اسلامی اور غیر شرعی طریقہ اور غلط عقیدے والے عاملوں سے عمل کرانا نہایت خطرناک ہے۔ آج کل جگہ جگہ عامل حضرات بیٹھے ہوئے ہیں جن میں سے اکثر قرآن وسنت سے دور اور مشرکانہ اعمال وافعال کے حامل ہیں۔

جعلی عاملین نہ صرف لوگوں کی گمراہی اور شرک کا سبب بنتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کے ایمان کے بھی ڈاکو بن جاتے ہیں، ان کی عزت کے بھی اور ان کے مال کے بھی۔

تیرہواں رکوع: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا۔۔۔(البقرہ۔104)

اہل ایمان کی تربیت، گفتگو کیلئے اچھے الفاظ کے استعمال کی تاکید، منسوخ آیات کے پیچھے حکمت، نیک اعمال، اعمال کی قبولیت (اخلاص، اتباع سنت) کا ذکر ہے۔

گفتگو کیلئے الفاظ کے چناؤ میں احتیاط ﴿ لَا تَقُولُواْ رَاعِنَا----﴾۔ البقرہ۔104

ذو معنی الفاظ کے استعمال سے گریز کرو۔

آسمان وزمین کا حقیقی فرمانروا اللہ ہے

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ

کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین اور آسمان کا مالک اللہ ہی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں۔(البقرہ۔107)

کامیابی کے اصول

وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُواْ لأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّهِ إِنَّ اللّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔

اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔ جو نیکی بھی اپنے لیے آگے بھیجو گے، اس کو خدا کے پاس پاؤ گے۔ اللہ تمہارے سارے اعمال سے واقف ہے۔ سورۃ البقرۃ:110

قبولیت اعمال کی شرائط

بَلٰى مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۔

سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس کے لیے اس کا بدلہ اس کے رب کے ہاں ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(البقرہ۔112)

نیک اعمال میں احسان کا مطلب: وھومحسن

اعمال کی قبولیت کی دو شرائط:

اللہ کی رضا کی نیت سے عمل کیا جائے اور حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق کیا جائے۔

(اَسْلَمَ وَ جْھَہ لِلّٰہِ) کا مطلب ہے محض اللہ کی رضا کے لئے کام کرے اور (وَ ھُوَ مُحْسِنٌ) کا مطلب ہے اخلاص کے ساتھ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی سنت کے مطابق۔ قبولیت عمل کے لئے یہ دو بنیادی اصول ہیں اور نجات اخروی انہی اصولوں کے مطابق کئے گئے اعمال صالحہ پر مبنی ہے نہ کہ محض آرزووں پر۔

نجات کیلئے نیک اعمال بھی ضروری ہیں

اس آیت کا یہ بھی مطلب ہے کہ محض نسلی طور پر اسلام کا نام رکھ لینا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا جب تک ایمان اور عمل صالح کو اختیار نہ کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

حدیث: من بطابہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ۔

جس کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ (صحیح مسلم)

چودھواں رکوع: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ۔۔۔ (البقرہ۔113)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں دوسروں کی نفی کرنا اور عبادت گاہوں سے روکنے کی مذمت بیان کی گئی اور واضح کیا گیا کہ نجات کا دارومدار اللہ کے سچے دین کی پیروی میں ہے۔ اللہ کی مساجد سے روکنے کو ظلم کہا گیا۔ مشرق و مغرب کہیں بھی اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے۔ حضورؐ کو بشیر اور نذیر کہا گیا۔ دوسروں کی پیروی کے بجائے اللہ کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اللہ کی کتاب کی تلاوت کا حق ادا کرنے والے سچے ایمان والے ہیں۔

اللہ کی مسجدوں سے روکنا

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگوں کا حق نہیں ہے کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔ البقرہ۔114

اللہ کی مسجدوں سے روکنے سے کیا مراد ہے؟

جب مشرکین مکہ نے رسول کریم ﷺ کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مسجد حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(بحوالہ ابن کثیر)

آیت کا شان نزول تو مفسرین کے نزدیک کوئی خاص واقعہ ہے مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے تاکہ یہ حکم قریش مکہ وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ عام رہے۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص مسجد کا نام لینے کے بجائے مساجد اللہ فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا اور آیت کا مضمون یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر و نماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں ان میں سے ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے صراحۃ روکا جائے۔

مسجد اللہ کا گھر ہے مگر بعض لوگ مالکانہ سوچ اور نوابی ذہنیت لے کر مسجد میں آتے ہیں۔اسی طرح بعض رویّے لوگوں کو مسجد سے دور کر دیتے ہیں۔

مسجد میں شور و شغب کر کے یا اس کے قرب و جوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز و ذکر وغیرہ میں خلل ڈالے یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں یا کم ہو جائیں کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل در و دیوار یا ان کے نقش و نگار سے نہیں بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے،

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (9:18)یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر اور نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

اسی لئے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمان کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین و خوب صورت ہوں گی مگر حقیقتاً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو جائیں گے۔ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مسجد میں جھگڑے کو قرب قیامت کی نشانی بتایا۔حضرت فاروق اعظم نے مسجد میں ایک شخص کی اونچی

آواز سنی تو فرمایا تمہیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی) یعنی مسجد کے ادب و احترام میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنی چاہیئے۔

اسی طرح مساجد کو تمام ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے تاکہ مسجد میں آنے والے مسجد میں آکر راحت اور خوشی محسوس کریں۔ مساجد میں داخل ہونے والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی نجاسات اور بدبو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں اور اپنے دلوں کو تمام اخلاق رذیلہ، تکبر حسد، بغض، حرص وریاء وغیرہ کی نجاسات سے پاک کرکے داخل ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیاز، لہسن وغیرہ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے تاکہ دوسرے اذیت محسوس نہ کریں۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ:

شرافت وانسانیت کے چھ کام ہیں: تین حضر کے اور تین سفر کے۔

حضر کے تین کام یہ ہیں: 1۔ تلاوت قرآن کرنا۔ 2۔ مسجدوں کو آباد کرنا۔ 3۔ دین کے کاموں میں اجتماعی کوششیں کرنا۔

اور سفر کے تین کام یہ ہیں: 1۔ اپنے مال میں سے غریب مسافروں پر خرچ کرنا۔ 2۔ ہر ایک سے اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ 3۔ اور رفقائے سفر کے ساتھ تفریح وخوش طبعی کا طرز عمل رکھنا۔

بچوں کی تربیت میں مساجد کا کردار

بچپن کا علم اور مشاہدات پتھر کی لکیر کی مانند ہوتے ہیں۔ پتھر پر جو نقش پڑ جائے وہ جلد نہیں مٹ سکتا۔ مساجد میں نمازیوں کا مجمع، نہایت باادب ماحول، خاموش ذکر الٰہی، تلاوت میں مشغولیت، پھر ایک امام کی پیروی میں صف بندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی اور نماز کے بعد آپس میں لوگوں کا ملنا، مصافحہ کرنا، خیر خیریت جاننا۔ بچے اپنے والدین کے ساتھ یہ مناظر باقاعدگی سے دیکھیں۔ ابھی انہیں کوئی شعور نہیں، لیکن نگاہیں چپکے چپکے ان مناظر کے شخصیت پر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ دل ودماغ میں ایک روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے۔ جیسے جیسے یہ بچے اپنی پختہ عمر کو پہنچتے ہیں، ان میں اپنے مسلم ہونے اور اللہ کے گھر میں اللہ کی بندگی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بچے بہرحال بچے ہیں۔ شعور کی ناپختگی، ناسمجھی اور بچپن کی طبیعت کی شرارتوں سے وہ عاری نہیں ہوتے۔ اللہ کے گھر میں دھیرے دھیرے مساجد سے اچھی طرح آشنائی کے بعد ان میں ادب و

تہذیب کی رمق پیدا ہوتی ہے۔ تربیت کے مرحلے کا تقاضہ ہے کہ لوگ ان بچوں کو بچے ہی سمجھیں اور ان کے ساتھ ان کی شرارتوں یا کچھ شور شرابے پر ایسا کوئی رویہ اختیار نہ کریں کہ بچہ اس کا کچھ ایسا اثر لے بیٹھے کہ وہ مسجد میں آنا ہی چھوڑ دے۔ مسجد میں بچوں کو ڈانٹنا معصوم ذہنوں کو مسجد کے ماحول سے متنفر کر سکتا ہے۔

دراصل یہ بچے جنت کے پھول ہیں۔ انہیں سے تو چمنِ اسلام کی رونق ہے۔ یہ تو ہمارا مستقبل ہیں۔

ماشاء اللہ یہ ہماری مساجد صرف دو رکعت نماز کے لیے ہی نہیں ہیں، بلکہ یہاں بچوں کے دینی مکاتب بھی ہوں اور مساجد کے وسیع علاقے میں کھیل کھیل میں بچوں کی تربیت بھی ہو۔ ان کی دلچسپیوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ انسان کی زندگی میں یہ بچپن کی تعلیم و تربیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بچہ اس تربیت کے نظام کو زندگی میں کبھی نہیں بھولتا۔ ملت کے اس قیمتی سرمایہ کو ضائع نہ ہونے دیجیے۔

خواتین کو مساجد سے روکنا

اسلام کے ابتدائی دور میں خواتین سماجی کاموں میں ایکٹیو رہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے عصر حاضر میں اسلامی معاشرے میں ان کا رول بہت ہی محدود ہو گیا ہے۔

خواتین کی مسجد میں آمد پر علماء اور فقہاء کی مختلف آراء موجود ہیں۔

مساجد میں خواتین کی آمد کے شرعی حکم کے بارے میں فقہائے اسلام کی اکثریت مساجد میں خواتین کو آنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ بعض فقہاء خواتین کو مسجد میں اعتکاف تک کی اجازت دیتے ہیں۔ امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط میں امام ابو حنیفہؒ کے حوالے سے خواتین کے لیے مسجد میں اعتکاف کو جائز کہا ہے۔ البتہ کچھ متاخرین علماء صرف فتنے کے اندیشے کے سبب خواتین کے مسجد میں آنے کو درست نہیں سمجھتے۔ لیکن عام طور پر اس موضوع پر بحث یارائے صرف فقہی نوعیت کی نظر آتی ہے اس میں دعوتی اور سماجی پہلوؤں اور معاشرتی ضروریات کے حوالے سے احاطہ نہیں کیا گیا۔

موجودہ دور بالخصوص غیر مسلم ممالک میں مسلم کیونٹی کیلئے مسجد کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔

مسجد تعلیم گاہ بھی ہے،، تربیت وتزکیہ کا مرکز بھی، درس وتدریس کی جگہ بھی، کیمونٹی سنٹر بھی، دینی اور سماجی تقریبات کی جگہ بھی، ہر خوشی، غم میں اکھٹے ہونے کی جگہ بھی۔ ایک لحاظ سے مسلم کیمونٹی کی زندگی مسجد ہی کے ارد گرد گھومتی ہے۔

پھر یہ حقیقت کہ آپ ﷺ کے دور میں خواتین کس طرح مساجد میں اچھی خاصی تعداد میں شرکت کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ فجر کی نماز تک میں شریک ہوتیں (بروایت عائشہ) بلکہ بخاری شریف کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خواتین نفل نمازیں بھی مسجد میں ادا کرتی تھیں۔

اسی طرح ابن ماجہ کی روایت میں ایک سیاہ فام خاتون کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو مسجد نبوی کی خادمہ تھیں۔

دور نبوی میں کچھ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو خواتین کے مساجد میں آنے پر تردد تھا لیکن نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: اللہ کی بندیوں کو مسجد آنے سے نہ روکو۔ لہذا اس کے بعد کوئی بھی صحابی اپنے اہل خانہ کو مسجد آنے سے نہیں روکتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مخالفین اسلام بشمول منافقین مسلمانوں کو اذیتیں اور تکالیف دیتے اور طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتے، اسلام میں پردے کے کچھ احکامات بھی اسی تناظر میں آئے۔ ان حالات اور مسائل کے باوجود خواتین کا مساجد میں آنا جانا جاری رہا۔

عید کی نمازوں میں خواتین کی شرکت کا حکم آپ ﷺ بہت تاکید کے ساتھ دیتے تھے۔ ایک صحابیہ نے غالباً اسی موکد حکم کی وجہ سے دریافت کیا کہ اگر کسی خاتون کے پاس جلباب (عبایا) نہ ہو اور اس وجہ سے وہ عید کی نماز میں شرکت نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ تو نہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی اور خاتون اسے جلباب (عبایا) دے دے، اور وہ اس موقع کے خیر اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہو۔ (بخاری)۔
اس کے بعد بعض روایات (طبقات ابن سعد، مسند احمد) سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں بھی خواتین مساجد جاتیں۔ اس کے بعد اس سلسلے میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں خواتین کو مسجد آنے سے روکا گیا۔ لیکن مسند احمد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فجر کی نماز کی امامت کراتے ہوئے جو جان لیوا حملہ کیا گیا اس وقت ان کی اہلیہ مسجد میں ہی نماز ادا کر رہی تھیں۔
حضرت عمرؓ کی جانب اس پابندی کی نسبت کے غلط ہونے کا ایک اور ثبوت عہد عثمانی میں تراویح کی نماز میں خواتین کی حاضری بھی ہے۔ اس کے بعد کے ادوار میں کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین مساجد میں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں۔

البتہ متاخرین علماء وفقہاء فتنے کے اندیشے کے سبب خواتین کی مسجد آمد کو ممنوع (مکروہ تحریمی) قرار دیتے ہیں۔

لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ یہ فتنہ صرف خواتین کو مسجد آنے سے ہی کیوں روکتا ہے؟ کسی اور مقام پر جانے سے کیوں مانع نہیں ہے؟

یہ کیسا فتنہ ہے جو یونیورسٹی، کالج، مدارس اور اسکول میں جانے سے مانع نہیں ہوتا۔

دفتر، عدالت، ہسپتال میں جانے سے نہیں روکتا۔

خواتین کو حجاب کرنے سے نہیں روکتا۔

روزمرّہ زندگی کے امور کو سرانجام دینے کیلئے خواتین کو باہر جانے سے نہیں روکتا۔

پڑوسی، رشتہ دار، فیملی فرینڈز کے گھروں میں خواتین کو جانے سے نہیں روکتا۔

خواتین کو شاپنگ پر جانے سے نہیں روکتا۔

کسی دینی پروگرام میں جانے سے نہیں روکتا۔

صرف خواتین کو مسجد میں آنے سے روکتا ہے۔

صرف مسجد کا نام آتے ہی ہمیں اس موہوم فتنے کی شدت اور حسّاسیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اسلام کی تین مقدس ترین مساجد مسجد حرام، مسجد نبویؐ، مسجد اقصیٰ میں خواتین باقاعدگی سے نماز و عبادات کیلئے آتی ہیں وہاں خواتین کے جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھی جاتی۔

مشرق و مغرب ہر جگہ اللہ موجود ہے

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

اور اللہ کے لئے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی لہٰذا تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کرلو گے سمجھو وہیں خدا موجود ہے وہ صاحبِ وسعت بھی ہے اور صاحبِ علم بھی ہے۔(البقرہ۔115)

کعبہ صرف علامت وحدت وسمت ہے ورنہ اللہ کا جمال وجلال غیر محدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ نہ مشرقی ہے، نہ مغربی۔ وہ تمام سمتوں اور اطراف کا مالک ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس طرف رہتا ہے۔ آیت کا یہ بھی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ محدُود، تنگ دل، تنگ نظر بھی نہیں ہے، بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویہ ء نظر اور دائرہ فیض بھی وسیع ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کونسا بندہ، کس وقت، کہاں، دنیا کے کس کونے میں، کس نیت سے اس کو یاد کر رہا ہے۔

کن فیکون کی مالک ہستی

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۔

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جب کوئی چیز کرنا چاہتا ہے تو صرف یہی کہہ دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے۔(البقرہ۔117)

حضور ﷺ کی دو عالی شان صفات

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّلَا تُسْــٴَـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ۔

(اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو سچائی کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اہل دوزخ کے بارے میں تم سے کوئی سوال نہ ہو گا۔(البقرہ۔119)

اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی تسلی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسول! ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر (خلق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سناتے رہیے اور (نہ ماننے والوں کو) خبردار کرتے رہیے اور آپؐ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہو گی کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں دین قبول کیا اور کیوں دوزخ میں گئے۔ آپ اپنا کام کرتے رہیے آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اور آپؐ کے امتی صرف دعوت دینے کی حد تک مسئول ہیں۔ ہدایت دینے کے ذمہ دار نہیں۔

تلاوت کا حق ادا کرنے والے

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے وہ اس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور جو اس کے منکر ہوں تو وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔(البقرہ۔121)

اہل کتاب کے اچھے لوگوں کی تعریف

اس آیت (البقرہ۔121) میں اہل کتاب کے لوگوں میں جو لوگ صالح اور نیک سیرت تھے ان کی خوبیاں اور ان کے مومن ہونے کی خبر دی جارہی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دیگر افراد۔

حق تلاوت سے کیا مراد ہے؟

فرمایا کہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ حق تلاوت ادا کرتے ہوئے اس کو پڑھتے ہیں۔

وہ اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح پڑھنے کا حق ہے کے کئی مطلب بیان کئے گئے:

1۔ خوب توجہ اور غور سے پڑھتے ہیں۔

2۔ اس کے حلال کو حلال، حرام کو حرام سمجھتے اور کلام الٰہی میں تحریف نہیں کرتے۔

3۔ اس میں جو کچھ تحریر ہے، لوگوں کو بتلاتے ہیں اس کی کوئی بات چھپاتے نہیں۔

4۔ اس کی محکم باتوں پر عمل کرتے اور متشابہات پر ایمان رکھتے اور جو باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ان کے بارے میں اہل علم سے سوال کرتے ہیں۔

5۔ اس (کتاب الٰہی) کی ایک ایک بات کی پیروی کرتے ہیں۔ (فتح القدیر)

6۔ دوران تلاوت جنت کا ذکر آتا ہے تو جنت کا سوال کرتے ہیں اور جہنم کا ذکر آتا ہے تو جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حق کی تلاوت میں یہ سارے ہی مفہوم داخل ہیں اور تلاوت کا حق ادا کرنے کی سعادت انہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

پندرہوں رکوع: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ --- (البقرہ۔122)

رکوع کے تفسیری نکات

امامت کی بنیاد ایمان و عمل پر ہے حسب و نسب پر نہیں۔ یوم الحساب سے ڈرو۔ سیرت ابراہیمؑ کا تذکرہ، تعمیر کعبہ کے وقت دعائیں۔ حضور ﷺ کی بعثت کی دعا۔

ابراہیم کی آزمائش

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ۔

اور جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں۔ فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں عرض کی اور میری اولاد سے بھی؟ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ (البقرہ۔124)

حضرت ابراہیمؑ کو کن کلمات سے آزمایا گیا؟

کلمات سے مراد وہ تمام آزمائشیں ہیں، جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام گزارے گئے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں، جن سے انسان محبّت کرتا ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو حضرت ابراہیمؑ نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ہیں جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا جسے انہوں نے حق کی راہ میں مقابلہ نہ کیا ہو۔ وہ ہر آزمائش اور ہر امتحان میں کامیاب اور کامران رہے، جس کے صلے میں امام الناس کے منصب پر فائز کئے گئے، چنانچہ مسلمان ہی نہیں، یہودی، عیسائی حتٰی کہ مشرکین عرب سب ہی کے نزدیک ان کی شخصیت نہایت ہی محترم مانی جاتی ہے۔

کلمات ابراہیمی کے بارے میں کئی اقوال ملتے ہیں مثلاً:

اس سے مراد احکام شریعت، مناسک حج، قربانی پسر کی آزمائش، ہجرت، نار نمرود، دعوت و تبلیغ، ہجرت کرنا، مہمان نوازی، اللہ کی راہ میں جانی اور مالی مصیبتوں کو برداشت کرنا ہے۔

بعض مفسرین نے اس سے مراد مکمل اطاعت لیا ہے۔

بعض نے آزمائش کے کلمات سے مراد مکمل اسلام لیا ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک روایت کا ذکر کیا ہے کہ ان کلمات سے تیس احکامات مراد ہیں جو قرآن میں تین مقامات پر آئے:

سورہ توبہ کی آیت 112 (التائبون العابدون۔۔) میں موجود دس صفات: یعنی توبہ کرنا، عبادت کرنا، حمد کرنا، اللہ کی راہ میں سفر کرنا، رکوع کرنا، سجدہ کرنا، بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا، ایمان لانا۔

اسی طرح سورۃ مومنون (قد افلح المومنون۔ آیات: 1۔10) اور سورۃ معارج میں موجود دس صفات: یعنی نماز کو خشوع و خضوع سے ادا کرنا، لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے منہ پھیر لینا، زکوٰۃ دینا، شرمگاہ کی حفاظت کرنا، امانت

داری کرنا، وعدہ وفائی کرنا، نماز پر ہیشگی اور حفاظت کرنا، قیامت پر ایمان رکھنا، عذاب الٰہی سے ڈرتے رہنا، سچی گواہی دینا یا شہادت حق پر قائم رہنا شامل ہے۔

اسی طرح سورۃ احزاب (آیت۔35) میں موجود دس صفات: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ یعنی اسلام لانا، ایمان رکھنا، قرآن پڑھنا، سچ بولنا، صبر کرنا، عاجزی کرنا، خیرات دینا، روزہ رکھنا، بدکاری سے بچنا، اللہ تعالیٰ کا ہر وقت بکثرت ذکر کرنا۔

بعض نے ان کلمات سے دس فطری امور کی بجاآوری بھی مراد لیا ہے: مثلاً فطری امور میں شامل داڑھی رکھنا، مونچھوں کو کم کرنا، مسواک کرنا، کلی کرنا، ناخن کاٹنا، ختنہ وغیرہ۔ (واللہ اعلم)

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔

(ابراہیمؑ نے دعا کی) اور میری اولاد کو بھی (یہ منصب امامت عطا فرما؟)۔ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ (البقرہ۔124)

لاینال عھد الظالمین فرما کر دین میں صاحبزادگی کی نفی کر دی گئی۔ اگر ایمان و عمل صالح نہیں، تو پیرزادگی اور صاحبزادگی کی بارگاہ الٰہی میں کیا حیثیت ہوگی؟ نبی ﷺ کا فرمان ہے: من بطا بہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ۔ جس کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ (مسلم)

کعبہ: دلوں کا مقناطیس

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ۔۔

اور جب ہم نے کعبہ لوگوں کے لیے بار بار آنے کی جگہ اور امن و سکون کا مقام بنا دیا۔ (اور فرمایا) مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ۔ (البقرہ۔125)

بیت اللہ کی دو خصوصیات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی دو خصوصیات بیان فرمائیں:

ایک مطلب یہ ہے کہ کعبہ لوگوں کے لئے ثواب کی جگہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں بار بار آنے کی جگہ، یعنی مرجع خلائق بنادیا۔ جو ایک مرتبہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو جاتا ہے، دوبارہ، سہ بارہ آنے کے لئے بیقرار رہتا ہے ۔ بعض علماء نے فرمایا کہ قبول حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دل میں موجود ہو۔ بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ یہ امن اور سکون کی جگہ ہے۔یعنی یہاں کسی دشمن کا خوف بھی نہیں رہتا چنانچہ زمانہء جاہلیت میں بھی لوگ حدود حرم میں کسی جانی دشمن سے بھی بدلہ نہیں لیتے تھے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا اثر ہے۔ آپؑ نے دعا مانگی تھی کہ:

فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ۔۔۔

اے اللہ! تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے۔۔۔(ابراہیم:37)

مقام ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟

مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ کرتے رہے۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کے قدم کے نشانات ہیں۔

بقول شاعر:

ے وموطی ابراہیم فی الصخر رطبتہ
علی قدمیہ حافیا غیر ناعل

یعنی اس پتھر میں ابراہیمؑ کے دونوں پیروں کے نشان تازہ بتازہ ہیں جن میں جوتی نہیں۔

اب اس پتھر کو ایک شیشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے، جسے ہر حاجی مطاف میں با آسانی دیکھ سکتا ہے۔ پہلے یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو: واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی۔ اس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلے پر رکھ دیا گیا۔ اس مقام پر طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے۔ طواف کے بعد کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے قریب پڑھنا افضل ہے۔ البتہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

مساجد کی خدمت: سنّت انبیاء

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔

اور ہم نے ابراھیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ البقرہ۔125

تعمیر کعبہ۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعائیں

ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اپنی دعاؤں کو ربِّ یا ربّنا کے لفظ سے شروع کیا جو دعا مانگنے کا ایک پیغمبرانہ طریقہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔

ابراہیمؑ کی امن کیلئے خصوصی دعا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا۔۔۔

جب ابراہیمؑ نے کہا اے پروردگار تو اس شہر کو امن والا شہر بنا دے۔۔۔۔(البقرہ۔126

رزق میں برکت کی دعا

پھلوں کے رزق کی دعا

وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ۔۔

قبولیت اعمال کی دعا

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

اور جب ابراھیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو ساتھ دعا بھی کر رہے تھے): اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما۔ بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ (البقرہ۔127)

غور کرنے کی بات ہے کہ کتنا مبارک عمل (تعمیر بیت اللہ) کتنی مبارک جگہ، کتنے مبارک لوگ، کتنا مبارک موقع، کتنی مبارک زبانیں۔ پھر بھی دعا کر رہے ہیں: ربنا تقبل منّا۔ اے ہمارے ربّ، ہماری طرف سے قبول فرمالے۔

یہاں یہ سبق دینا مقصود ہے کہ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے شایان شان عبادت و اطاعت ممکن نہیں۔ ہر شخص اپنی قوت وہمت کے مطابق کام کرتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر فخر اور غرور نہ کرے بلکہ عاجزی کے ساتھ دعا کرے کہ اے اللہ! میرا یہ عمل قبول فرمالے۔

دین پر استقامت کی دعا

اولاد کی اصلاح کی دعا

رجوع الی اللہ کی دعا

وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنادے۔ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ (فرمانبردار امت) قرار دے۔ اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا۔ اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔(البقرہ۔128)

آخری رسولؐ کی بعثت کی دعا

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اے ہمارے رب! ان کے درمیان ایک رسول کو مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے. انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بیشک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔(البقرہ۔129)

یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کی آخری دعا ہے۔ اہل حرم کے لیے یہ دعا کی کہ آپ کی اولاد میں سے رسول آئے۔ یہ بھی اللہ تعالٰی نے قبول فرمائی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ جل شانہ کے نزدیک آخری نبی اس وقت سے ہوں جبکہ آدم ابھی مٹی کی صورت میں تھے۔(مسند احمد)

حدیث: انا دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ وبشارة عِيسٰى وَرَأَتْ أُمِّي كَأَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ لَهُ قُصُورُ الشَّام

میں ابراہیمؑ کی دعا کا جواب ہوں، عیسٰیؑ کی بشارت ہوں۔ اور میری ماں کا خواب جس میں وہ دیکھتی ہیں کہ ان میں سے گویا ایک نور نکلا جس سے ارض شام کے محلات روشن ہو گئے۔

بعثت رسولؐ کے تین مقاصد

اس آیت (البقرہ۔129) میں بعثت رسولؐ کے تین مقاصد بیان کئے گئے:

1۔ کتاب کی تلاوت

2۔ کتاب وحکمت کی تعلیم

3۔ تزکیہ نفس، تربیت، اصلاح اخلاق

1۔ تلاوت کی اہمیت:

بعثت نبویؐ کے مقاصد میں پہلا مقصد قرآن کی تلاوت ہے۔ اصول فقہ میں قرآن کی تعریف یہ کی گئی: ھوالنظم والمعنی جمیعا یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معانی دونوں کا۔ لہٰذا قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث میں بتایا گیا ہے وہ صرف ترجمہ پڑھنے سے حاصل نہ ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص نماز میں صرف نماز کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ادا نہ ہو گی۔

البتہ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے جو بذات خود ایک الگ فریضہ ہے جس کو الگ بیان کیا گیا۔ فرمایا: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (16:44) یعنی ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کی تفسیر بیان فرمائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے۔ اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک الگ عبادت اور باعث ثواب ہے۔

سولھواں رکوع: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ---(البقرہ۔130)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں انبیاءؑ کا اپنی اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں ملت ابراہیمی کی فضیلت کا ذکر ہے۔ ملت ابراہیمؑ سے روگردانی اور اعراض کی ممانعت، موت اور ہمارے اعمال کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی تربیت اولاد۔ اللہ کا رنگ یعنی اللہ کے دین کا راستہ اختیار کرو۔ لنا اعمالنا ولکم اعمالکم ۔ ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار۔ ہمیں دوسروں کے اعمال کی فکر کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

پہلے پارے کے آخری رکوع کے بیشتر حصے میں (آیت:128 سے لے کر 136 تک) سارے تعصبات اور نسل پرستی کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے (اسلام) پر زور دیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہی اسلام

ابراہیمؑ اور ان کی اولاد اسماعیلؑ واسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا دین تھا۔ یہ حضرات کبھی نسل پرستی اور تعصب کا شکار نہیں ہوئے۔ آیت 136 میں مسلمانوں کو اس تعصب اور نسل پرستی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے: لانفرق بین احدِ منہم۔ یعنی ہم انبیاءؑ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے۔(البقرۃ:136)

یعقوب علیہ السلام کی اپنی اولاد کو وصیّت

اولاد کی محبت، اس کی بھلائی کی فکر اور ان کیلئے دعائیں کرنا سنت انبیاؑ ہے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے وقت والدین کا اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا جو ان کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہے یعنی دینداری۔ آیت: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ (البقرہ۔132) کا یہی مطلب ہے اور آیت: اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ۔ (البقرہ۔133) کا بھی یہی حاصل ہے۔

اولاد کی دینی تربیّت۔ والدین کی ذمہ داری

حدیث: إِنَّ اللَّهَ سَائِلٌ كُلَّ رَاعٍ عَمَّا اسْتَرْعَاهُ، حَفِظَ ذَلِكَ أَمْ ضَيَّعَ؟ حَتَّى يَسْأَلَ الرَّجُلَ عَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ۔

بے شک، اللہ تعالیٰ ہر ذمہ دار، نگہبان سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کریں گے یہاں تک کہ آدمی سے اپنی فیملی کے بارے میں سوال ہو گا۔(صحیح ابن حبّان)

حدیث: حسن تربیت سب سے بہترین تحفہ ہے جو ایک والد اپنی اولاد کو دیتا ہے۔

حدیث: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بے شک آدمی کا اپنے بیٹے کو ادب ایک صاع صدقہ دینے سے افضل ہے۔(ترمذی۔باب البر والصّلہ)

اللہ کا رنگ

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ سے اچھا رنگ کس کا ہو گا۔ ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں۔(البقرہ۔138)

اصل رنگ تو اللہ کا رنگ ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی (روحانی غسل یا بپتسمہ) سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی سے چڑھتا ہے۔ اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں اور اللہ کے رنگ سے مراد دین فطرت یعنی دین اسلام ہے۔ جس کی طرف ہر نبی نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی امتوں کو دعوت دی۔

ہم جس رنگ اور چہرے کے ساتھ دنیا میں آتے ہیں وہ ہمارا اپنا انتخاب نہیں ہوتا مگر جس چہرے کے ساتھ ہم نے مرنا ہے، دنیا سے رخصت ہونا ہے اور آخرت میں پہنچنا ہے اسے قرآن و سنّت کے مطابق ڈھالنے، روشن اور پر نور بنانے کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔

جو ہمارا رب ہے وہی تمہارا بھی رب ہے

قُلْ اَ تُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَۙ

کہہ دو کیا تم ہم سے اللہ کی نسبت جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہاری لئے تمہارے عمل اور ہم تو خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ (البقرہ۔139)

؎ نہ تیرا خدا کوئی اور ہے، نہ میرا خدا کوئی اور ہے
یہ جو راستے ہیں جدا جدا، یہ معاملہ کوئی اور ہے

دوسروں کی غلطیوں پر نظر رکھنے کے بجائے اپنے اعمال کی فکر

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے لیے ان کے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کی نسبت نہیں پوچھا جائے گا۔ البقرہ۔141

پارہ - 2

قرآن مجید کا دوسرا پارہ سورہ البقرہ آیت 142 تا 252 پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ۔۔۔(البقرہ۔142)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں قبلہ کی تبدیلی کے احکامات، ہدایت کیلئے زمان و مکان کی قید نہیں، ہدایت کا اصول، امت مسلمہ ایک معتدل امت ہے، امت مسلمہ کی ذمہ داریاں، دعوت و تبلیغ، تحویل قبلہ اور تحویل امامت، قبلہ کی تبدیلی امتحان کیلئے تھی، تحویل قبلہ اور مقام مصطفیٰؐ(فلنولینک قبلۃ ترضاھا)۔

ہدایت روئے زمین پر کہیں پر بھی مل سکتی ہے

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اے نبیؐ! ان سے کہو مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔(البقرہ۔142)

مشرق اور مغرب دونوں اللہ کی تخلیق ہیں۔

حدیث: جعلت لی الارض مسجداً و طھوراً۔ میرے لئے (یعنی میری امّت کیلئے) پوری روئے زمین پاک صاف، مسجد بنادی گئی۔

روئے زمین کا کوئی حصّہ ناپاک نہیں۔ پوری زمین پاک ہے اور سجدہ، نماز کیلئے موزوں ہے۔

دین اسلام میں ہدایت کیلئے مکان کی قید نہیں لگائی گئی۔

ابو جہل مکّہ کا باشندہ ہونے کے باوجود ہدایت سے محروم رہا۔

عبداللہ بن ابی مدینے کا رہائشی اور بظاہر مسجد نبویؐ کا نمازی مگر حقیقی ایمان سے محروم رہا۔

اس آیت کی مزید تشریح وللہ المشرق و المغرب: سورۃ البقرہ۔115 میں گذر چکی ہے۔

امّت مسلمہ امّت وسط یعنی اعتدال والی امّت ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔

اور اِسی طرح ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنایا ہے۔(البقرہ۔143)

دوسرے مقام پر فرمایا: لَاتَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ۔ اپنے دین کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھو، غلو سے کام نہ لو۔(النساء۔171)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیّدنا محمد ﷺ کی امت کو اُمَّتِ وَسَط کا لقب عطا فرمایا ہے۔'وَسَط' کے معنی ہیں عقیدہ و عمل میں اعتدال، میانہ روی اور توازن پر قائم رہنے والا، جو غُلُوّ اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔ اس کے برعکس انتہا پسندی وہ روش ہے جو راہ اعتدال کی ضد ہے۔

راہِ اعتدال' اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کو 'توازن' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اعتدال و توازن کے اس مفہوم و معنی کی روشنی میں اسلام کی ہر تعلیم اور ہر حکم میں اعتدال موجود ہے۔ اسلام عقیدہ و نظریہ، عبادات و شعائر، اخلاق و آداب اور قانون و نظام میں معتدل ہے۔

ایک صالح معاشرے کی پہچان، اس میں بسنے والے افراد کا وہ رویہ اور طرزِ عمل ہوتا ہے، جس میں اعتدال و توازن، انسانی ہمدردی، انسانی حقوق کا احترام اور بالخصوص جان، مال اور عزّت و عصمت کا تحفظ پایا جائے۔

مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر عدل و انصاف، توسط اور میانہ روی کی خوبیوں سے متصف ہونے چاہئیں۔

حدیث: خير الامور اوساطها۔ ہر معاملے میں اعتدال کی راہ بہترین ہے۔

حدیث: حسنِ سیرت (نیک چال چلن)، بُردباری اور میانہ روی نبوت کے اجزا میں سے 24 واں حصہ ہے۔ (ترمذی)

فریضہ دعوت و تبلیغ اور شہادت حق یعنی حق کی گواہی

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔۔۔(البقرہ۔143)

اور اِسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امّت بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (البقرہ۔143)

اللہ مہربان ہستی

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

اللہ انسانوں کے ساتھ نرمی اور رحمدلی کا معاملہ فرماتے ہیں۔(البقرہ۔143

قبلہ کی تبدیلی

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔

(اے محمد ﷺ) ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب آپکو ہم اس قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں۔ آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔ اور بے شک وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔(البقرہ۔144)

تحویل قبلہ اور تحویل امامت

قبلہ کی تبدیلی امتحان کیلئے تھی

تحویل قبلہ اور مقام مصطفیٰ۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا

ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔(البقرہ۔144)

قبلہ کی ضرورت کیوں؟

بندگی اور عبادت میں یکجہتی کیلئے اسلام نے کئی اصول وضع کیے۔ مخلوق انسانی کو بے شمار خداؤں کی بندگی سے ہٹا کر صرف ایک خدا کے در پر لے آنا وحدت اور یکجہتی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ نماز میں بلا تفریق رنگ و نسل شاہ و گدا کو ایک ہی صف میں کھڑا کرکے مساوات کی بہترین مثال پیش فرمادی۔ حج مساوات انسانی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

قبلہ کی سمت مقرر کرنے میں ایک بھی ایک حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب سکھلائے جائیں۔ اجتماعیت کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کی وحدت اور یک جہتی ہے۔ یہ وحدت اور یکجہتی جتنی زیادہ قوی ہوگی اتنی ہی اجتماعیت مستحکم اور مضبوط ہوگی۔ انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے زہر قاتل ہوتا ہے۔ قبلہ کے لفظی معنی ہیں سمت توجہ یعنی جس طرف رخ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک بندہ مومن کا رخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف ہی ہوتا ہے اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے وہ کسی خاص سمت میں نہیں۔

لیکن اگر قبلہ کی سمت مقرر نہ کی جاتی تو اس کا اثر طبعی طور پر یہ ہوتا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رخ کا پابند نہ ہوتا جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کرلیتا اور ایک ہی نماز باجماعت میں کسی کا رخ شمال کی طرف اور کسی کا جنوب کی طرف ہوتا جس سے وحدت اور یکجہتی قائم نہ رہتی۔ اس مقصد کیلئے قبلہ کی سمت متعین کی گئی کہ ہر نماز میں جسم کعبہ کی طرف اور دل رب کعبہ کی طرف ہو۔

دوسرا رکوع: وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَافَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔۔۔ (البقرہ۔148)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں مسابقت الی الخیرات کی تاکید، تحویل قبلہ کے مزید احکامات، خشیت الٰہی کی تلقین، صرف اللہ سے ڈرنے کا حکم، دعاء ابراہیم کا جواب، رسول اکرمؐ کی بعثت کے اہم مقاصد، بعثت رسولؐ اور قرآن جیسی نعمتوں کا شکر کرنے کی تاکید، اللہ کو یاد کرنے کا حکم، اللہ کا شکر ادا کرو، کفران نعمت نہ کرو۔

مسابقت الی الخیرات یعنی نیک کاموں میں جلدی کرنا

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَافَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔

اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رُخ کرتا ہے پس تم نیکیوں کی طرف پیش قدمی کیا کرو، تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تم سب کو جمع کرلے گا، بیشک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔(البقرہ۔148)

مسابقت فی الخیرات سے مراد نیک کاموں کو پہلی فرصت میں ادا کرنا ہے۔عبادات اور نیک اعمال میں بلاوجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ۔کیونکہ بعض اوقات اس کے ٹالنے اور تاخیر کرنے سے توفیق سلب ہوجاتی ہے۔حج کرنے میں جلدی کرنا، زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر نہ کرنا۔

بعض فقہاء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہر نماز کو اول وقت میں پڑھنا افضل ہے۔البتہ جن نمازوں میں رسول اللہ ﷺ نے تاخیر کو پسند فرمایا ان میں تاخیر مستحب ہے(مثلاًعشاء کی نماز)۔

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ انّ اللہ علٰی کل شیٍ قدیر۔ البقرہ۔148

دنیا میں جہاں بھی ہو نماز کے وقت قبلہ رو ہوجاؤ

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو، بے شک یہ (تبدیلی قبلہ) آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔(البقرہ۔149)

قرآن مجید میں قبلہ کا حکم الفاظ کے معمولی ردوبدل سے تین بار آیا۔امام فخر الدین رازیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ پہلا حکم تو ان کے لیے ہے جو کعبہ کو دیکھ رہے ہیں (مثلاً مسجد حرام میں نماز پڑھنے والے)۔دوسرا حکم

ان کے لیے ہے جو مکہ میں ہیں لیکن کعبہ ان کے سامنے نہیں۔ تیسرا حکم ان کیلئے ہے جو مکہ کے باہر روئے زمین پر کسی بھی جگہ موجود ہیں۔ مکہ سے باہر والوں کیلئے صرف کعبہ کی سمت ہی کافی ہے۔

اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ وما اللہ بغافل عمّا تعملون البقرہ-149

بعثت رسول کے مقاصد

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ-151)

جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ (البقرہ-151)

یہ آیت دعائے ابراہیمؑ (البقرہ-129) کا جواب ہے۔

ذکر اور شکر

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ۔

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کیا کرو اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔ (البقرہ-152)

ذکر اللہ کے فضائل

اللہ کے ذکر کی یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں۔ حضرت معاذ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں اور ایک حدیث قدسی بروایت ابوہریرہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔

ایک حدیث قدسی میں ہے جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ وہ جماعت فرشتوں کی ہے۔

ایک اور حدیث قدسی میں ہے کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھاتا ہوں اور اگر تو اے بنی آدم میری طرف ایک ہاتھ بڑھائے گا میں تیری طرف دو ہاتھ بڑھاؤں گا اور اگر تو میری طرف چلتا ہوا آئے گا تو میں تیری طرف دوڑتا ہوا آؤں گا۔

تیسرا رکوع: يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِ --- (البقرہ۔153)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں صبر، نماز، ثابت قدمی کا حکم دیا گیا، ایمان اور آزمائش لازم وملزوم ہیں، مصیبت اور پریشانی کی دعا (اناللہ واناالیہ راجعون)، حج اور عمرہ کے کچھ احکامات، رضاکارانہ خدمات کی فضیلت واہمیت، دینی احکامات کو چھپانے کی مذمت، علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا حرام ہے، کتمان حق یعنی حق اور سچائی کو چھپانے کی ممانعت، توبہ اور اصلاح کر لینے والے اس وعید سے مستثنٰی ہیں۔ توحید کا دوٹوک اعلان (الٰهكم الٰه واحد---)

صبر اور نماز

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ البقرہ۔153

مصائب اور آزمائشوں کا مقابلہ ایمان اور صبر کے ساتھ،

انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں آرام اور راحت (نعمت) یا تکلیف و پریشانی۔

اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی تمام ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب اور تکالیف کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر دو جزء سے مرکب ہے ایک صبر دوسرے نماز۔

نعمت میں شکر الٰہی کی تلقین اور تکلیف میں صبر اور اللہ سے مدد کی تاکید ہے۔

صبر کی کئی قسمیں ہیں، گناہوں سے بچنا بھی صبر ہے اس کو صبر علی المعصیہ کہتے ہیں۔ اور لذتوں کے قربان اور عارضی فائدوں کے نقصان پر صبر۔

دوسرا صبر علی الاطاعہ یعنی احکام الٰہی کے بجالانے میں جو مشکلیں اور تکلیفیں آئیں، انہیں صبر اور ضبط سے برداشت کرنا۔ بعض لوگوں نے اس کو اس طرح تعبیر کیا ہے۔ اللہ کی پسندیدہ باتوں پر عمل کرنا چاہے وہ نفس اور بدن پر کتنی ہی

گراں ہوں اور اللہ کی ناپسندیدگی سے بچنا چاہیے اگرچہ خواہشات ولذات اس کو اس کی طرف کتنا ہی کھینچیں۔(ابن کثیر)

مصیبت اور پریشانی میں کیا کرنا چاہیے؟

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۗ۔

اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے،مال وجان اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

(البقرہ۔155۔156)

مصیبت اور پریشانی میں کیا کیا جائے؟

پریشانی ایک فطری عمل ہے۔انسانی زندگی میں قدم قدم پر آزمائش ومصائب ہیں لیکن مصیبت اور پریشانی میں حد سے زیادہ پریشان ہونا بذات خود ایک نئی پریشانی کو دعوت دینے والی بات ہے۔لہٰذا مصیبت اور پریشانی میں صبر واستقامت دکھائی جائے کہ یہی ایک بندہ مومن کی شان ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی مرض سے، کبھی جان و مال کی کمی سے، کبھی دشمن کے ڈر خوف سے، کبھی کسی نقصان سے، کبھی آفات ومصائب سے اور کبھی نت نئے فتنوں سے آزماتا ہے۔بالخصوص دعوتِ دین اور اقامت دین تو وہ راستہ ہے جس میں قدم قدم پر آزمائشیں ہیں۔اسی سے سچے ایمانداروں کی پہچان ہوتی ہے اور کھرے اور کھوٹے کا فرق پتہ چلتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا آگ میں ڈالا جانا، فرزند کو قربان کرنا، حضرت ایوب علیہ الصلوۃ والسلام کو بیماری میں مبتلا کیا جانا، ان کی اولاد اور اموال کو ختم کر دیا جانا، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا ستایا جانا اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا شہید کیا جانا؛ یہ سب آزمائشوں اور صبر ہی کی مثالیں ہیں اور ان مقدس ہستیوں کی آزمائشیں اور صبر ہر مسلمان کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ اسے جب بھی کوئی مصیبت آئے اور وہ کسی تکلیف یا اذیت میں مبتلا ہو

توصبر کرے اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے۔ یہ صبر اس کیلئے اخروی درجات کی بلندی کا سبب ہو گا ان شاء اللہ۔

حدیث: مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اسے خوشی پہنچتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے۔ دونوں ہی حالتیں اس کے لئے خیر ہیں۔ (صحیح مسلم)

مصیبت اور پریشانی کی دعا: انّا للہ وانّا الیہ راجعون

مصیبت میں انا للہ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکین قلب کا بہترین علاج ہے۔

حدیث: ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو بھی کوئی مصیبت لاحق ہوئی اور اس نے یہ کلمات پڑھے: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اللهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا۔

ہم سب اللہ کے لئے ہیں، اور ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں، یا اللہ! مجھے اس مصیبت کا ثواب دے اور اس کے بدلہ میں اس سے اچھی نعمت عطا فرما۔ تو اللہ تعالی اسے نعم البدل عطاء فرمائے گا۔ صحیح مسلم

حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ پریشانی کی حالت میں یہ دعا پڑھتے تھے: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ العَظِيمُ الحَلِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ العَرْشِ العَظِيمِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَرَبُّ الأَرْضِ، وَرَبُّ العَرْشِ الكَرِيمِ۔ اللہ صاحب عظمت اور بردبار کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا رب ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے اور عرش عظیم کا رب ہے۔ بخاري

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إذا مات ولد العبد، قال الله لملائكته: قبضتم ولد عبدي؟ فيقولون: نعم، فيقول: قبضتم ثمرة فؤاده؟ فيقولون: نعم، فيقول: فماذا قال عبدي؟ فيقولون: حمدك، واسترجع، فيقول الله تعالى: ابنوا لعبدي بيتًا في الجنة، وسموه: بيت الحمد۔

جب کسی کی اولاد فوت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ملک الموت سے دریافت فرماتا ہے تو نے میرے بندے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے کلیجہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ بتاؤ اس مصیبت پر اس نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں اے اللہ! اس بندے نے تیری حمد کی اور انااللہ پڑھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کیلئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ (ترمذی)

مصائب اور مشکلات میں آسانی کی دعا:

اللھم لا سھل الّا ما جعلتہ سھلاً، وانت تجعل الحزن اذا شئت سھلاً۔

اے اللہ! نہیں کوئی کام آسان مگر وہی جسے تو آسان کر دے اور جب تو چاہتا ہے غم کو آسان کر دیتا ہے۔ (صحیح ابن حبان۔2427)

مایوسی گناہ ہے

حالات جیسے بھی ہوں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے بلکہ انسان ہر حال میں اللہ کے فضل و کرم کا امیدوار رہے۔ رضا بالقضا ایک بندہ مومن کا شیوہ ہے۔ حدیث کے مطابق برے حالات میں اچھے حالات کا انتظار کرنا بہترین عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ بعض دفعہ جب کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں سے دکھ اور پریشانی کا شاک دیتے ہیں۔ دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسرے کیلئے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بخوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ایک حدیث مبارکہ کے اندر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے کسی بندے کو اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں مگر اس کی نیکیاں اس کیلئے کافی نہیں ہوتی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے دکھ اور پریشانی کی صورت میں کسی آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں جس میں وہ سرخرو ہوتا ہے اور اس کا مقام اور مرتبہ اللہ کے ہاں بہت بڑھ جاتا ہے۔

اللہ سے مشکل اور پریشانیوں سے نجات کی دعا کرتے رہنا چاہیئے اور تدابیر میں بھی مشغول رہے۔ دعا کا حکم اس لئے ہے کہ تدبیر میں بغیر دعا برکت نہیں ہوتی۔

استغفار کرتے رہنا چاہیئے۔

صدقہ کو معمول بنایا جائے کہ صدقہ مصیبتوں، حوادثات اور پریشانیوں کو ٹالتا ہے۔(حدیث: الصدقۃ رد البلاء)

کسی مصیبت اور پریشانی کی وجہ سے دوسرے احکام دین میں سستی اور کوتاہی بھی نہیں کرنی چاہیے۔

کسی دوسرے کی مصیبت اور پریشانی پر خوش بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ اسے پریشانی سے نکال کر ہمیں اس میں مبتلا کرنے پر قادر ہے۔

حدیث کے اندر آتا ہے: لا تظهر الشماتته لاخيک، فير حمه الله و يبتليک۔ اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرو ورنہ اللہ اس پر رحم فرمادیں گے اور تمہیں کسی آزمائش یا مصیبت کے اندر مبتلا کر دیں گے۔

مصیبت اور پریشانی میں دوسروں کی مدد

مصیبت اور پریشانی میں کسی کی مدد کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ حدیث کے مطابق جو کسی دوسرے کی پریشانی کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کی تکالیف میں سے اس کی کسی تکلیف کو دور فرمادیں گے۔

مصیبت اور پریشانی کے وقت اناللہ پڑھنے والوں کیلئے اجر عظیم

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے۔ اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔(البقرہ۔157)

مناسک حج۔ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۗ

یقیناً صفا اور مَروہ، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے۔(البقرہ۔158)

صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان سعی کرنا ان مناسک حج میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ صفاء اور مروہ کے درمیان سعی حج اور عمرہ کا ایک اہم رکن ہے۔

آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ذہن میں آیا کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی تو شاید گناہ ہو، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں صفاء اور مروہ پر دو بت نصب تھے۔ اساف بت صفا کی پہاڑی پر نصب تھا اور نائلہ بت مروہ کی پہاڑی پر نصب تھا۔ اسلام سے قبل ان دو بتوں کی وجہ سے سعی کی جاتی تھی۔ جب نبی ﷺ کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہل عرب تک پہنچی، تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مروہ کے درمیان سعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے صفاء اور مروہ کے درمیان سعی کے بارے میں کراہت موجود تھی، کیونکہ وہ مناۃ کے معتقد تھے اور اساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صفاء اور مروہ کو شعائر اللہ فرما کر اور سعی کا حکم دیکر لوگوں کے اس وہم اور خلش کو دور فرما دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے صفا مروہ کی سعی کی جس سے یہ عمل مسنون ہو گیا اور کسی کو اس کے ترک کرنے کا جواز نہ رہا۔ (بحوالہ بخاری مسلم)

رضاکارانہ خدمات

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔

اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔ (البقرہ۔158)

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے۔

اللہ کی آیات (دین) کو چھپانے سے کیا مراد ہے؟

حدیث: من سئل عن علم یعلمه فکتمه الجمه الله یوم القیامة بلجام من النار ۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہے اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت والے دن اسے آگ کی لگام دی جائے گی۔ (رواہ ابوہریرۃ و عمرو بن العاص اخرجہ ابن ماجۃ)

علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل کے متعلق ہے جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔ وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے اور وہ کتمان علم کے حکم میں نہیں ہے۔ آیت مذکورہ میں لفظ من البینات والھدیٰ سے اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایسے ہی مسائل

کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کردو گے (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے: كلموا الناس علىٰ قدر عقولهم --- لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کیا کرو، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کی تکذیب کردیں

۔

کیونکہ جو بات عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو گی ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے جو مخاطبین کو غلط فہمی میں مبتلا کردیں۔

اس آیت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت بھی نہیں کرنی چاہئے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ (بخاری)

اس سے ملتے جلتے کئی اور اقوال بھی صحابہ کرام سے منقول ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام احادیث نبوی ؐ کو آیاتِ الٰہی کی طرح دین کا حصہ سمجھتے تھے۔

توبہ اور اصلاح کرنے والوں کیلئے مغفرت اور اجر عظیم

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَ تُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے بیان کرنے لگیں، اُن کو میں معاف کردوں گا اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ (البقرہ۔160)

معبود واحد

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔

تمہارا معبود حقیقی ایک ہی ہے، وہی رحمان بھی ہے اور رحیم بھی۔ البقرہ۔163

یعنی مستحق عبادت ہستی صرف اللہ ربّ العالمین ہے۔ اس مقصد کیلئے قرآن مجید میں خاص اصطلاح استعمال ہوئی جسے توحید یا وحدانیت کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے مقابلے میں کفر و شرک کی اصطلاح استعمال ہوئی

ہے۔ جس کا مطلب اللہ رب العالمین کا سرے سے ہی انکار کر دینا یا اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو بھی شریک کرنا شامل ہے۔ قرآن میں کفر کا لفظ کفران نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفران نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا سرے سے انکار ہی کر دے اور احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت کا نتیجہ سمجھے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ بے وفائی کرے۔ اس چیز کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چوتھا رکوع: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ--- (البقرہ۔164)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں تخلیق کائنات میں غور و فکر اور تدبر کی دعوت، توحید ربوبیت، دعوت توحید، محبت الٰہی، بعض لوگ غیر اللہ سے اتنی محبت کرتے ہیں جتنی اللہ سے ہونی چاہیے، سچے اہل ایمان اللہ سے حقیقی محبت رکھتے ہیں، دنیا میں جن کی پیروی کی گئی آخرت میں ان کا اعلان بیزاری، مذہبی پیشواؤں کا اپنے مقتدیوں سے اعلان براءت، حسرتیں اور عذاب جہنم۔

تخلیق کائنات میں غور اور تدبّر

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلنے میں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کی نفع دینے والی چیزیں لے کر چلتے ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے نازل کیا ہے پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ

کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے چلنے والے جانور پھیلا تا ہے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان حکم کا تابع ہے البتہ عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔(البقرہ۔164)

اہل عقل کیلئے نشانیاں

یہ آیت(البقرہ۔164)اس لحاظ سے بڑی جامع ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظم و تدبیر کے متعلق سات اہم امور کا اس میں یکجا تذکرہ ہے جو کسی اور آیت میں نہیں۔

1۔ آسمان اور زمین کی تخلیق جن کی وسعت وعظمت محتاج بیان نہیں۔

2۔ رات اور دن کا یکے بعد دیگرے آنا، دن کو روشنی اور رات کو اندھیرا کر دینا تا کہ کاروبار معاش بھی ہو سکے اور آرام بھی۔ پھر رات کا لمبا اور دن کا چھوٹا ہونا اور پھر اس کے برعکس دن کا لمبا اور رات کا چھوٹا ہونا۔

3۔ کشتیوں اور جہازوں کا چلنا، جن کے ذریعے سے تجارتی سفر بھی ہوتے ہیں اور ٹنوں کے حساب سے سامان رزق و آسائش ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔

4۔ بارش جو زمین کی شادابی وروئیدگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

5۔ ہر قسم کے جانوروں کی پیدائش، جو نقل و حمل، کھیتی باڑی اور جنگ میں بھی کام آتے ہیں اور انسانی خوراک کی بھی ایک بڑی مقدار ان سے پوری ہوتی ہے۔

6۔ ہر قسم کی ہوائیں ٹھنڈی بھی گرم بھی، مرطوب بھی، غیر مرطوب بھی، مشرقی مغربی بھی اور شمالی جنوبی بھی۔ انسانی زندگی اور ان کی ضروریات کے مطابق۔

7۔ بادل جنہیں اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے، برساتا ہے۔

یہ سارے امور کیا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت نہیں کرتے، یقینا کرتے ہیں۔ کیا اس تخلیق میں اور اس نظم و تدبیر میں اس کا کوئی شریک ہے؟ نہیں۔ یقینا نہیں۔ تو پھر اس کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود اور حاجت روا سمجھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

پانچواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا---- (البقرہ۔168)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں حلال اور پاکیزہ رزق کھانے کا حکم، شیطانی راستوں (مثلاً بے حیائی اور برائیوں) سے بچنے کی تاکید، آباؤاجداد کی اندھی تقلید سے اجتناب، پاکیزہ روزی کا حصول اور اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا، حرام اشیاء کو نام لیکر حرام قرار دیا گیا، البتہ حالت اضطرار اور شدید مجبوری میں جان بچانے کی غرض سے حرام اشیاء کو بقدر ضرورت استعمال کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ آخری آیات میں دین فروشی کی مذمت بیان کی گئی۔

حلال وحرام کا تصوّر

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖوَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطانی راستوں کی پیروی نہ کرو۔ (البقرہ۔168)

دنیا کی تمام چیزیں اصلاً حلال ہیں سوائے ان کے جن کو حرام کیا گیا۔ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کیلئے حلال وجائز ہیں کیونکہ وہ انسان کیلئے ہی پیدا کی گئیں۔ (هوالّذی خلق لكم ما فی الارض جميعاً) سوائے ان چیزوں کے جن کو حرام قرار دیا گیا۔ اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن وسنّت کے اصولوں سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

حدیث: حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے:

حلال کھانا،

فرائض ادا کرنا،

رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع کرنا۔

حدیث: حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: من أكل طيبا وعمل بسنةٍ وأمِنَ الناسُ بوائقَه دخل الجنة
۔

جس شخص نے حلال کھایا
اور سنت کے مطابق عمل کیا
اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا۔ (ترمذی)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہیں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں۔ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حدیث: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلم نہ ہو جائے اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں اور جب کوئی بندہ مال حرام کماتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بری چیز سے برے عمل کو نہیں دھوتے ہاں اچھے عمل سے برے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

روز محشر کے سوال:

حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما تزال قدما عبد يوم القيامة حق يسأل عن اربع عن عمره فيما افناه وعن شبابهٖ فيما ابلاه وعن ماله من اين اكتسبه وفيما انفقه وعن علمه ماذا عمل فيه۔

قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا جب تک اس سے ان سوالوں کا جواب نہ لیا جائے:

1۔ ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی؟

2۔ دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کن مشاغل میں برباد کی؟

3۔ تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا؟

4۔ اور کہاں خرچ کیا؟

5۔ اور یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا؟ (البیہقی)

طیّب اور پاکیزہ غذا

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَ رِزْقًا طَیِّبًا وَ عَمَلًا متقبّلًا۔ (سنن ابن ماجہ)

حدیث: اے اللہ میں تجھ سے نفع بخش علم، پاکیزہ روزی اور (تیری بارگاہ میں) مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں۔

دعاؤں کی قبولیت کا نسخہ: حلال رزق

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) نے حضور ﷺ سے فرمایا: حضور! میرے لئے دعا کیجئے کہ میں مستجاب الدعوات بن جاؤں (یعنی اللہ تعالی میری دعاؤں کو قبول فرمایا کرے)۔ آپؐ نے فرمایا: اے سعد پاک چیزیں اور حلال لقمہ کھاتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتا رہے گا۔ قسم ہے اس اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے حرام کا لقمہ جو انسان اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اس کی نحوست کی وجہ سے چالیس دن تک اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

ایک اور حدیث کے اندر آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے وہ پراگندہ بالوں والا اور غبار آلود ہوتا ہے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے اور گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے لیکن اس کا کھانا، پینا، لباس اور غذا سب حرام کے ہیں اس لئے اس کی دعا کیسے قبول ہو۔

شیطان کا کام: برائی پر ابھارنا

اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(شیطان تو) تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اللہ کے بارے میں جہالت کی باتیں کرتے رہو۔ (البقرہ۔169)

شیطان کے حکم کرنے سے مراد دل میں وسوسہ ڈالنا ہے جیسا حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے (انسان) کے دل میں ایک خیال اور وسوسہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور دوسرا خیال فرشتہ کی طرف سے۔ شیطانی وسوسہ گناہ اور برائی کا ہوتا ہے جبکہ فرشتہ کا خیال نیکی اور اچھائی کا ہوتا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ جب شیطانی خیال یا وسوسہ دل میں آئے تو اس کو جھٹک دو اور دل سے فوراً نکال دو۔ البتہ فرشتے کے خیال کو دل میں جگہ دو اور عمل کی کوشش کرو۔

حلال کھانے کی برکات

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔

اے ایمان والو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ (البقرہ۔172)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ تم پاک صاف اور حلال طیب چیزیں کھایا کرو اور میری شکر گزاری کرو۔ مسند احمد میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ پاک چیز کو قبول فرماتا ہے اس نے رسولوں کو اور ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ پاک چیزیں کھائیں اور نیک اعمال کریں۔ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔(51:23)

رزق حلال کمانا فرض ہی نہیں عین عبادت بھی ہے

نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کے بارے میں فرمایا جو روزی کمانے کیلئے دوڑ دھوپ کر رہا تھا: فرمایا کہ اگر یہ بندہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کی غرض سے محنت کرنے نکلا ہے تو یہ اللہ کے راستے میں ہے، اگر اپنے بوڑھے والدین کی مدد کرنے کیلئے روزی کما رہا ہے تو اللہ کے راستے میں ہے، اگر اپنے اہل خانہ کیلئے کمانے نکلا ہے تو اللہ کے راستے میں ہے۔ اگر یہ اپنے آپ کو دوسروں سے مانگنے سے بچانے کیلئے مال کما رہا ہے تو بھی اللہ کے راستے میں ہے۔ إِنْ كَانَ يَسْعَى عَلَى وَلَدِهِ صِغَارًا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَإِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيرَيْنِ فَفِي سَبِيلِ اللَّهِ... وَإِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَهْلِهِ فَفِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى نَفْسِهِ لِيُعِفَّهَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔(المعجم الكبير للطبراني، والمعجم الصغير)

حرام اور ممنوع اشیاء کا ذکر۔ مردار، خون، سور وغیرہ

حالت اضطرار میں حرام اشیاء کا بقدر ضرورت استعمال جائز

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔(البقرہ۔173)

اس آیت میں چار حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے لیکن اسے کلمہ حصر انّما کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حرام صرف یہی چار چیزیں ہیں جبکہ ان کے علاوہ بھی کئی چیزیں ہیں جو حرام ہیں۔ اس لئے اول تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حصر ایک خاص سیاق میں آیا ہے یعنی قریش مکہ کے اس فعل کے ضمن میں کہ وہ حلال جانوروں کو بھی حرام قرار دے لیتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں حرام تو صرف یہ ہیں۔ اس لئے یہ حصر اضافی ہے یعنی

اس کے علاوہ بھی دیگر محرمات ہیں جو یہاں مذکور نہیں۔ دوسرا حدیث میں دو اصول جانوروں کی حلت و حرمت کے لئے بیان کر دیئے گئے ہیں وہ آیت کی صحیح تفسیر کے طور پر سامنے رہنے چاہئیں۔ درندوں میں ذوناب (وہ درندہ جو دانتوں سے شکار کرے) اور پرندوں میں ذومخلب (جو پنجے سے شکار کرے) حرام ہیں تیسرے جن جانوروں کی حرمت حدیث سے ثابت ہے مثلاً گدھا کتا وغیرہ وہ بھی حرام ہیں جس سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ حدیث بھی قرآن کریم کی طرح دین کا ماخذ اور دین میں حجت ہے اور دین دونوں کے ماننے سے مکمل ہوتا ہے نہ کہ حدیث کو نظر انداز کر کے صرف قرآن سے۔

مردہ سے مراد وہ حلال جانور ہے جو بغیر ذبح کیے طبعی طور پر یا کسی حادثے سے (جس کی تفصیل المائدہ میں ہے) مر گیا ہو یا شرعی طریقے کے خلاف اسے ذبح کیا گیا ہو مثلاً گلا گھونٹ دیا جائے یا پتھر اور لکڑی وغیرہ سے مارا جائے۔ البتہ حدیث میں دو مردار جانور حلال قرار دیئے گئے ہیں ایک مچھلی دوسری ٹڈی وہ اس حکم میتہ سے مستثنیٰ ہیں خون سے مراد دم مسفوح ہے یعنی ذبح کے وقت جو خون نکلتا اور بہتا ہے لیکن گوشت کے ساتھ جو خون لگا رہ جاتا ہے وہ حلال ہے ۔ دو خون حدیث کی رو سے حلال ہیں کلیجی اور تلی۔

وما اھل بہ لغیر اللّٰہ۔۔: وہ جانور یا کوئی اور چیز جسے غیر اللہ کے نام پر پکارا جائے اس سے مراد وہ جانور ہیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جائیں جیسے مشرکین عرب لات وعزی وغیرہ کے ناموں پر ذبح کرتے تھے۔

اسلامی احکامات میں لچک اور نرمی

حالت اضطرار میں بقدر ضرورت حرام کھانے کی اجازت

اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرائط کے ساتھ دی گئی ہے۔

1۔ ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو۔ مثلاً بھوک یا پیاس سے جان یا صحت کو خطرہ ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان یا صحت کو خطرہ ہو اور اس حالت میں علاج کیلئے حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز علاج یا دواء کیلئے میسر نہ ہو۔

2۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے حکم کو جان بوجھ کر توڑنے کی نیت دل میں نہ ہو۔

3۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے، مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے۔

دین فروشی کی سزا

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًاۙ اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۚوَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِیْمٌ۔

(البقرہ۔174)

جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کے احکام کو چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں وہ در حقیقت اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور خدا روز قیامت ان سے بات بھی نہ کرے گا اور نہ انہیں پاکیزہ قرار دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(البقرہ۔174)

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکم شرعی کو بدل دے وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر رہا ہے۔

چھٹا رکوع: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ۔۔۔ (البقرہ۔177)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں نیکی کی حقیقت یعنی اصل نیکی کیا ہے؟ ایمان، عقیدہ، حسن عمل، ضرورتمندوں کی مدد، عبادات، معاملات، صبر واستقامت، ہر طرح کے حالات میں دین پر ثابت قدمی اصل نیکی ہے۔ مزید اس رکوع میں فلسفہ قصاص کی حکمت ومصلحت، وصیت کے احکامات کا ذکر ہے۔

آیت البرّ

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِۙ وَالسَّآىٕلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚوَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚوَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِؕ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕوَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ، یوم آخرت، ملائکہ اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے

داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے پورا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور معرکہ حق و باطل میں صبر اور ثابت قدمی دکھائیں۔ یہی سچّے اور متقی لوگ ہیں۔ (البقرہ۔177)

اصل نیکی کیا ہے؟

اس آیت سے سورۃ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ اسی لئے اس آیت کو احکام اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد سورۃ البقرہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں۔ اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاقیات کا اجمالی ذکر آگیا ہے۔

یہ آیت (آیت البرّ۔ البقرہ۔177) قبلہ کے ضمن میں ہی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرلینا بذات خود کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف مرکزیت اور اجتماعیت کے حصول کا ایک طریقہ ہے، اصل نیکی تو ان عقائد پر ایمان رکھنا ہے جو اللہ نے بیان فرمائے اور ان اعمال و اخلاق کو اپنانا ہے جس کی تاکید اس نے فرمائی ہے۔

پہلی چیز ایمانیات یعنی عقائد ہیں ان کا ذکر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ میں مفصل آگیا۔ دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں ان میں سے عبادات کا ذکر وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ تک آگیا پھر معاملات کا ذکر وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ سے کیا گیا پھر اخلاقیات کا ذکر وَالصّٰبِرِیْنَ سے کیا گیا۔

الباساء سے تنگ دستی اور شدت فقر، الضراء سے نقصان یا بیماری مراد ہے۔ ان تمام حالتوں میں صبر کرنا، یعنی ثابت قدمی دکھانا، احکامات الٰہی سے انحراف نہ کرنا اصل دینداری ہے۔ آخر میں بتلا دیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں۔

حضرت ابوذر (رض) نے جب حضور ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ تو حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی، انہوں نے پھر سوال کیا حضور نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی پھر یہی سوال کیا آپ نے فرمایا سنو نیکی سے محبت اور برائی سے عداوت ایمان ہے۔ (ابن ابی حاتم)

حضرت فاطمہ بنت قیس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مال میں زکوٰۃ کے سوا کچھ اور بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تم نمازیں پڑھو اور دوسرے اعمال نہ کرو یہ کوئی بھلائی نہیں۔

فلسفہ قصاص کی وضاحت

البقرہ۔178

قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو، اسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل قاتل کو ضرور انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔

قصاص لینے کا حق اگرچہ مقتول کے ورثاء کا ہے مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں بلکہ اس حق کو حاصل کرنے کے لئے عدالت یا حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔(بحوالہ قرطبی)

ہمیشہ سزا کا اختیار قانونی اور عدالتی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد صرف حکومت وقت کو ہوتا ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو سزا دینے کا اختیار نہیں۔

قصاص سے متعلق زمانہ جاہلیت کی روایات:

زمانہ جاہلیت میں کوئی نظم اور قانون نہیں تھا اس لیے زور آور قبیلے کمزور قبیلوں پر جس طرح چاہتے ظلم کا ارتکاب کر لیتے۔ ایک ظلم کی شکل یہ تھی کہ کسی طاقتور قبیلے کا کوئی فرد قتل ہو جاتا تو وہ صرف قاتل سے بدلہ لینے کے بجائے قاتل فرد کے قبیلے کے کئی افراد کو بلکہ بسا اوقات پورے قبیلے ہی کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی طرح ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے۔ اس کے علاوہ زمانہ جاہلیت کی روایات میں یہ بھی تھا کہ کسی غلام کے قاتل آزاد مرد کو یا عورت کے قاتل مرد کو سزا نہیں ملتی تھی۔

ان آیات میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو قاتل ہو گا قصاص (بدلے) میں اسی کو سزا ملی گی۔ اسی حوالے سے سورۃ مائدہ میں النفس بالنفس کی آیت موجود ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص میں قاتل یا قتل میں ملوث افراد کو ہی سزا دی جائے۔ اس بنا پر مفسرین اس آیت البقرہ 178 کو سورۃ المائدہ کی آیت 45 سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس(رض) فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مرد کو عورت کے بدلے سزا نہیں دیتے تھے جس پر آیت: اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ (المائدہ:45) نازل ہوئی پس مجرم لوگ سب برابر ہیں۔ خواہ قاتل مرد ہو، خواہ عورت ہو، خواہ غلام ہو۔

اسی طرح یہ بھی فقہی اصول ہے کہ اگر ایک جرم میں کئی افراد ملوث ہیں تو ان سب کو سزا ملے گی۔ حضرت عمر فاروق (رض) کے دور میں ایک قتل میں ملوث سات قاتلوں کو سزا ملی۔

اس سے اگلی آیت میں فلسفہ قصاص کا خلاصہ بیان کر دیا گیا: وَ لَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ تاکہ تم (مزید خونریزی سے) بچو۔ (البقرہ۔179)

وصیت کے احکامات

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ اۨلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؕ۔ (البقرہ۔180)

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آ پہنچے اگر اس نے کچھ مال چھوڑا ہو، تو (اپنے) والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں بھلے طریقے سے وصیت کرے، یہ پرہیز گاروں پر لازم ہے۔ (البقرہ۔180)

وصیت کرنے کا یہ مخصوص حکم آیت وراثت کے نزول سے پہلے دیا گیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے (یعنی ورثہ کے حصے مقرر کر دیئے ہیں) پس اب کسی وارث کے لئے وصیت کی ضرورت نہیں۔

البتہ اب ایسے رشتہ داروں کے لئے وصیت کی جاسکتی ہے جو وارث نہ ہوں یا راہ خیر میں خرچ کرنے کے لئے بھی ایک تہائی مال کی وصیت کی جاسکتی ہے۔

آدمی کو جو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے۔ (جصاص)

وراثت کے ملکی قوانین اگر اسلامی قوانین سے مختلف ہوں تو وراثت کے سلسلے میں وصیت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورتحال میں ملکی قوانین اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں وصیت ضرور کرنی چاہیئے تاکہ ورثاء کو ان کا زیادہ سے زیادہ حق مل سکے۔ برطانیہ میں چونکہ وراثت کی وصیت عموماً وکیل کے ذریعے کی جاتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں ماہر سولیسٹر جو وراثت کے انگریزی قوانین کا ماہر ہو اور اسلامی وراثت کے اصولوں سے بھی آگاہ ہو اس کی خدمات لینی چاہئیں۔

جس شخص کے ذمہ دوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت واجب ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گذرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔

ساتواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔۔۔ (البقرہ۔183)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں روزوں کی فرضیت، مریضوں، مسافروں اور عمر رسیدہ افراد کیلئے رخصت اور رعایت، دین کا اہم اصول کہ اللہ بندوں کے ساتھ آسانی، نرمی اور سہولت چاہتے ہیں، ان کیلئے تنگی اور مشکلات نہیں چاہتے (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔۔)، رمضان اور قرآن کا تعلق، قرآن انسانیت کیلئے ہدایت کا ذریعہ (ھدی للنّاس)، دعا کی اہمیت و آداب، روزوں اور اعتکاف کے مسائل، مالی معاملات کی اہمیت، دوسروں کا مال ناحق نہ کھاؤ، رشوت نہ دو۔

روزوں کی فرضیّت اور احکام

روزے کا عظیم اجر: قربِ الٰہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَۙ۔

اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ البقرہ۔183

رمضان اور قرآن

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔ البقرہ۔185

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا ہے کہ، تم رمضان کے آخری عشرے میں شب قدر کی تلاش کرتے ہو اور جو شب قدر میں نازل ہوا اُسے چھوڑ دیتے ہو۔ اگر تم اس کو پکڑ لو تو تمہاری ہر رات شب قدر ہو سکتی ہے۔ اس رات کا جو حاصل ہے وہ قرآن کی وجہ سے ہے تو اُس عظیم ترین رات سے اپنی نسبتوں کو ہمیشہ باقی رکھتے ہوئے قرآن کو ہماری زندگیوں کا مرکز و محور بنانا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ

جو شخص اس مہینے کو پائے اُس کیلئے لازم ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

شریعت کے احکامات میں آسانی اور سہولت

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔ البقرہ۔185

اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ابتداء میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر سن 2 ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی وہ روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں روزوں کا اگلا حکم نازل ہوا اور یہ رعایت صرف مریض، مسافر، حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور بزرگ لوگوں کے لیے برقرار رکھی گئی۔ جو لوگ عارضی عذر کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکیں تو وہ بعد میں جب سہولت ہو قضا کر لیں البتہ مستقل عذر والے صرف فدیہ دے دیں۔ ان مسائل کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

لیکن اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا۔(بیان القرآن)

دعا کی اہمیّت اور آداب

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں نزدیک ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، پھر چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔البقرہ۔186

رمضان المبارک کے احکام و مسائل کے درمیان دعا کا مسئلہ بیان کر کے یہ واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں دعا کی بڑی فضیلت ہے جس کا خوب اہتمام کرنا چاہیے خصوصا افطاری کے وقت کو قبولیت دعا کا خاص وقت بتلایا گیا ہے۔ تاہم قبولیت دعا کے لئے ضروری ہے ان آداب شرائط کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح احادیث میں حرام روزی سے بچنے اور خشوع و خضوع کا اہتمام کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گزرا ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ۔۔۔(البقرہ۔186)

آیت کا شان نزول:

ایک اعرابی نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ ﷺ! کیا ہمارا رب قریب ہے؟ اگر قریب ہو تو ہم اس سے سرگوشیاں کر لیں یا دور ہے؟ اگر دور ہو تو ہم اونچی اونچی آوازوں سے اسے پکاریں، نبی ﷺ خاموش رہے اس پر یہ آیت اتری۔(ابن ابی حاتم)

ایک اور روایت میں ہے کہ صحابہ (رض) کے اس سوال پر کہ ہمارا رب کہاں ہے؟ یہ آیت اتری۔(ابن جریر)

حدیث: حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے ہر بلندی پر چڑھتے وقت اور ہر وادی میں اترتے وقت بلند آوازوں سے تکبیر کہتے جا رہے تھے نبی ﷺ ہمارے قریب آکر فرمانے لگے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو تم کسی بہری یا غائب ہستی کو نہیں پکار رہے بلکہ جسے تم پکارتے ہو وہ تم سے تمہاری سواریوں کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔(مسند احمد)

حدیث: حضرت انس(رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ میرے ساتھ جیسا عقیدہ رکھتا ہے میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے میں اس کے قریب ہی ہوتا ہوں۔(مسند احمد)

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے پھیلائے، اور اس سے کسی بھلی چیز کا سوال کرے، اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔(ترمذی۔ابن ماجہ)

قبولیت دعا کی مختلف صورتیں:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: زمین کی پشت پر رہنے والا جو مسلمان بھی اللہ عزوجل سے کوئی دُعا مانگتا ہے تو:

اللہ تعالیٰ اس کی مانگی ہوئی چیز دے دیتا ہے،

یا اس جیسی کسی مصیبت کو آنے سے روک دیتا ہے،

جب تک کہ وہ گناہ یا قطع رحم کی دُعا نہ کرے۔(ترمذی، مسند احمد)

صحیح مسلم میں ہے کہ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! دعا میں جلدبازی کیا ہے؟ فرمایا: دُعا کرنے والا کہے کہ میں نے دُعا کی، اور پھر کی، لیکن مجھے نظر نہیں آرہا کہ میری دُعا قبول ہوگی۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور دُعا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ انھوں نے فرمایا:

روزہ دار کے افطار کے وقت اس کی دُعا قبول ہوتی ہے۔

چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ جب روزہ افطار کرتے تو اپنے اہل وعیال کو بلاتے اور دُعا کرتے۔

رمضان میں مراعات اور کچھ پابندیاں

البقرہ۔138

ابتدائے اسلام میں روزوں کے احکام کے سلسلے میں کچھ اضافی پابندیاں عائد تھیں مثلاً سحری کھانے کی اجازت نہ تھی۔

صحابہ(رض) کو قدرے مشقت ہوئی جس پہ رخصت کی آیتیں نازل ہوئیں اور آسانی کے احکام مل گئے۔

سحری کھانا اور اس میں تاخیر کرنا سنت ہے۔

افطار میں جلدی سنّت ہے

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ سحری کھایا کرو اس میں برکت ہے۔(بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک میری امت افطار میں جلدی کرے اور سحری میں تاخیر کرے تب تک بھلائی میں رہے گی۔(مسند احمد)

اعتکاف اور اس کے مسائل

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ۔۔۔ (البقرہ۔187)

اعتکاف کے لغوی معنی کس جگہ ٹھہرنے کے ہیں اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ مسنوں اعتکاف کا ثواب ایک حدیث میں عمرہ کے برابر بتایا گیا۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: میری امّت کی رہبانیت اعتکاف ہے۔

ہر محلہ کی مسجد میں اعتکاف کرنا اہلِ محلہ کے ذمے سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگر تمام محلہ والوں میں سے کوئی بھی اس سنت کو ادا نہ کرے تو سب اس سنت کے چھوڑنے والے اور گناہ گار ہوں گے۔

اعتکاف کی تین اقسام ہیں۔

1۔واجب اعتکاف: جو کسی نذر یا منت کے طور پر پورا کیا جاتا ہے۔

2۔سنت اعتکاف: جو رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ مسنون اعتکاف کے ساتھ روزہ شرط ہے اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد سے نکلنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں۔

3۔نفل اعتکاف: یہ کسی بھی وقت مسجد میں ثواب کی نیت کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس کیلئے وقت کی قید نہیں۔ نفلی اعتکاف کیلئے روزہ شرط نہیں۔

دوران اعتکاف موبائل کا استعمال

اعتکاف کا مقصد دنیاوی امور سے یکسو ہو کر اللہ سے لو لگانا ہے، موبائل یا سمارٹ فون اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ ہے، دوران اعتکاف سوشل میڈیا کا غیر ضروری استعمال اور فضول ویڈیوز دیکھنا ناجائز ہے، اس سے مسجد کا تقدس پامال ہوتا ہے، اور اس کی بے حرمتی بھی ہوتی ہے، اس لیے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے نہ کہ گناہ کرنے کی، اور وقت کا ضیاع الگ ہوتا ہے، لہٰذا اعتکاف کے دوران موبائل استعمال کرنے اور ویڈیو دیکھنے سے سے اگرچہ اعتکاف فاسد

نہیں ہوتا، لیکن اس کی روح اور مقصد ضائع ہو جاتا ہے، اس لیے معتکف کو (خواہ مرد ہو یا خاتون) چاہیے کہ وہ اس سے اجتناب کرے، اور اگر کوئی واقعی ضرورت نہ ہو تو اعتکاف کے دوران موبائل فون کا استعمال نہ کرے اور دس دن یک سو ہو کر اللہ کی عبادت کرے، اگر جائز ضرورت ہو تو موبائل استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور اگر کوئی چیز خریدنے کی واقعی ضرورت ہو اور اس کے علاوہ انتظام نہ ہو سکتا ہو تو فون پر کوئی چیز خریدنے کی بھی گنجائش ہو گی، لیکن بلا ضرورت مکروہ ہے۔

کسی کا مال ناحق نہ کھاو

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

اور تم لوگ آپس میں اپنے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، نہ انھیں حکام (عدالت) کے پاس لے جاؤ (اس نیت کے ساتھ) کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر لو، جانتے بوجھتے۔ (البقرہ۔188)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس کسی کا حق ہو لیکن حق والے کے پاس ثبوت نہ ہو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کروا لے اس طرح دوسرے کا حق غصب کر لے یہ ظلم ہے اور حرام ہے۔ عدالت کا فیصلہ ظلم اور حرام کو جائز اور حلال نہیں کر سکتا۔ یہ ظالم عند اللہ مجرم ہو گا۔ (ابن کثیر)

عدالت تو ظاہر ہے کہ پیش کیے گئے ثبوت کے مطابق فیصلہ کرتی ہے۔ عدالت کے فیصلے سے (یا مفتی کے فتویٰ سے) نہ حرام حلال ہوتا ہے اور نہ حلال حرام، اور گناہ اس شخص پر ہو گا جو حیلے بہانے یعنی تیز طرار وکیل، جھوٹے ثبوت یا رشوت دے کر غلط فیصلہ کرا لے۔ جج اگر جان بوجھ یا رشوت لیکر غلط فیصلہ کرے تو وہ بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انما انا بشر و انتم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علیٰ نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشیء من حق اخیه فلا یاخذنه فانما اقطع له قطعةً من النار۔

میں ایک انسان ہوں، میرے پاس کوئی شخص مقدمہ لے کر آتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم میں سے وہ شخص دلیل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز ہو اور میں (اس کے دلائل سے متاثر ہو کر) اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ تو اگر

میں (غلطی سے) کسی مسلمان کا حق دوسرے شخص کو دے دوں، تو یہ اس کے لیے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے، خواہ وہ اسے اُٹھا کر لے جائے یا اسے چھوڑ دے۔ (بخاری، مسلم)

مذکورہ آیت اور حدیث لمحہ فکریہ ہے ان لوگوں کیلئے جو دوسروں کے مال و جائیداد، پلاٹ پر ناجائز قبضہ، دھوکہ دہی، فراڈ، کاغذات کے ہیر پھیر سے قبضہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو جھوٹے مالی مقدمے، جھوٹے انشورنس کلیم، بینیفٹ فراڈ، بے بنیاد انجری کلیم کرتے ہیں وہ بھی اسی حکم کے تحت آتے ہیں۔

آٹھواں رکوع: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ۔۔۔ (البقرہ۔189)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں چاند کے کیلنڈر کی وضاحت اور حکمت کہ یہ اسلامی عبادات کے ایام (مثلاً رمضان، حج، وغیرہ) کا تعین کرتا ہے۔ جاہلانہ رسوم و روایات کی کوئی حقیقت نہیں مثلاً حج سے واپسی پر مخصوص انداز میں گھر داخل ہونے میں کوئی نیکی نہیں۔ مسجد حرام کی حدود میں جنگ ممنوع ہے مگر دفاعی جنگ کی اجازت ہے، انفاق میں احسان کی ہدایت، حج اور عمرے کو اللہ کی رضا کیلئے پورا کرو۔ (واتموا الحج والعمرۃ للہ)، حج اور عمرہ کے احکامات، حج اور عمرہ ایک ہی سفر میں کرنے کی سہولت، مریض اور مجبور کیلئے رعایات، خوف خدا کی تلقین، اللہ کے عذاب سے ڈرنے کی تاکید۔

چاند کا کیلنڈر

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔۔۔(البقرہ۔189)

لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لئے ہے۔ البقرہ۔189

چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک قدرتی منظر ہے، جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام و تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہل عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا برے شگون لینا، بعض تاریخوں کو خوش بخت سمجھنا اور بعض کو منحوس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا بابرکت خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں اہل عرب میں پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں

ان میں رائج تھیں۔انہی چیزوں کی حقیقت نبی ﷺ سے دریافت کی گئی۔جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی کیلنڈر ہے،جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی،تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى

نیکی خوف خدا کا نام ہے۔

حد سے نہ بڑھو

اِنَّ اللّٰہَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔

بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔البقرہ۔190

قتال سے متعلق قرآنی آیات کا سیاق وسباق سے ہٹ کر غلط استعمال

البقرہ۔191

اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔دوسروں کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرو،بے شک اللہ نیک عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(البقرہ۔195)

احسان اور بھلائی کرو

وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (البقرہ۔195)

دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرو،اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(البقرہ۔195)

اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے دو طرح کا ہے:ایک عبادت میں احسان،دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں۔

عبادت میں احسان کی تفسیر حدیث جبرئیل میں خود رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہی ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد میں بروایت حضرت معاذ حضرت رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ: احب للنّاس ما تحب لنفسک۔۔۔ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔

حج اور عمرہ کے احکامات

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ البقرہ۔196

حج اور عمرہ اللہ کی رضا کیلئے پورا کرو

حج اور عمرہ میں دکھلاوا اور ریاکاری

حج اور عمرہ محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے کرنا چاہیئے۔ بالخصوص آج کے شوشل میڈیا کے دور میں اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ حج اور عمرہ ک کا سوشل میڈیا پر خوب چرچا کیا جاتا ہے۔ حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے کہ: انّ اللہ لا یقبل من العمل الّا کان لہ خالصاً۔ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتے جب تک وہ عمل صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے نہ کیا جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک حاجی صاحب نے اپنے مہمانوں کے سامنے اپنے خادم کو کہا کہ: جاؤ! اس گلاس میں زمزم کا پانی لاؤ جو میں دوسرے حج میں ساتھ لایا تھا۔ مجلس میں ایک صاحب علم تشریف فرما تھے انہوں نے بڑا نصیحانہ جملہ ارشاد فرمایا کہ: حاجی صاحب آپ نے اپنے اس ایک جملے میں اپنے دو حج کا ثواب ضائع کر دیا۔

حج اور عمرہ اکٹھا کرنے کی سہولت

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ۔۔۔ (البقرہ۔196)

عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا گناہ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو ختم فرمادیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کرلیں۔ البتہ جو لوگ مکہ کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں انہیں اس رعایت سے مستثنیٰ کردیا کیونکہ ان کے لیے عمرہ کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کرکے احرام کھول لے اور ان پابندیوں سے آزاد ہوجائے، جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں۔ پھر جب حج کے دن آئیں، تو از سر نو احرام باندھ لے۔

نواں رکوع: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ۔۔۔ (البقرہ۔197)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں حج کے احکام، حج کے آداب، خالی ہاتھ حج پر جانے کی ممانعت، زاد راہ لیکر حج پر جاؤ، دوران حج تجارت، بزنس، محنت مزدوری کی اجازت، مزدلفہ میں ذکر کی ہدایت، اللہ کو یاد کرو، دنیا و آخرت کی بہترین دعا (ربنا آتنا فی الدنیا حسنہ وفی الآخرہ حسنہ)، تکبیرات تشریق کا حکم، فتنہ وفساد کی مذمت (واللہ لا یحب الفساد)، دین پر جزوی عمل اور پسند ناپسند کا رویہ چھوڑ کر مکمل دین پر عمل کرو (ادخلوفی السّلم کافّہ)، بالآخر تمام معاملات کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوگا (والی اللہ ترجع الامور)۔

حج کے آداب واحکام

بہترین زادراہ تقویٰ

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو نیک کام تم کروگے، وہ اللہ کے علم

میں ہو گا سفر حج کے لیے زادراہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادراہ پرہیز گاری ہے پس اے ہوش مندو! میری نا فرمانی سے پرہیز کرو۔(البقرہ۔197)

حج کے مہینے: حج کے مہینے یہ ہیں: شوال، ذیقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن۔ مطلب یہ ہے کہ عمرہ تو سال میں ہر وقت جائز ہے لیکن حج صرف مخصوص دنوں میں ہی ہوتا ہے اس لئے اسکا احرام حج کے مہینوں کے علاوہ باندھنا جائز نہیں۔(ابن کثیر)

حج کی فرضیت واہمیت

حج اسلام کے ارکان میں سے ہے۔ حج کی فرضیت قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلّٰہِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلا۔ اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ (آل عمران۔97)

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔(بخاری، مسلم)

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: من حج فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امّہ۔ جس نے حج کیا اور شہوانی باتوں اور فسق وفجور سے بچا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے اس دن پاک تھا جب اسے اس کی ماں نے جنا تھا۔(بخاری، مسلم)

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: الحج المبرور لیس لہ الجزاء الّا الجنّہ۔ ایک مقبول حج کا ثواب سوائے جنت کے کچھ نہیں۔(بخاری، مسلم)

زادراہ لیکر حج پر جاؤ

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ (البقرہ۔197)

جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادراہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں ان کے اس

غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ زاد راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اس آیت میں تقویٰ سے مراد سوال سے بچنا ہے بعض لوگ بغیر زاد راہ لئے حج کے لئے گھر سے نکل پڑتے، کہتے کہ ہمارا اللہ پر توکل ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں لوگ بلا خرچ سفر کو نکل کھڑے ہوتے تھے پھر لوگوں سے مانگتے پھرتے جس پر یہ حکم ہوا۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں۔ اللہ نے توکل کے اس مفہوم کو غلط قرار دیا اور زاد راہ لینے کی تاکید فرمائی۔ ان کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب وسائل کو اپنے مقدور کے مطابق حاصل اور جمع کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین اسلام ایک فطری دین ہے جو انسانوں سے انہیں احکامات کا تقاضا کرتا ہے جن کی وہ استطاعت رکھتے ہیں۔ جس عبادت کی انسان استطاعت نہ رکھے وہ اس کا مکلف اور کرنے کا پابند بھی نہیں۔

احکام حج کے اختتام پر تقویٰ کی دوبارہ تاکید کی گئی (و اتقواللہ واعلمو انکم الیہ تحشرون۔ البقرہ۔203)۔ اس میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے جس کو ادا کرنے کے بعد حج کرنے والے کو حاجی کا ٹائٹل مل جاتا ہے۔ اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈال دیتا ہے جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ حج کے بعد پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ عظیم عبادت ضائع نہ ہو جائے۔

حج کے دوران تجارت یا کاروبار ممنوع نہیں

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ۔

اس میں تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم حج کے دوران اپنے پروردگار سے فضل (رزق) کے طلب گار بھی رہو۔۔۔(البقرہ۔198)

فضل سے مراد تجارت اور کاروبار ہے یعنی سفر حج میں تجارت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

تکمیل حج کے بعد اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کرو

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللہَ۔۔۔۔

پھر جب حج کے ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو۔(البقرہ۔200)

زمانہ جاہلیت میں لوگ مناسک حج سے فراغت کے بعد منیٰ میں میلا لگاتے اور اپنے آباو جداد کے کارناموں کا ذکر کرتے۔یہاں کہا جارہا ہے کہ جب تم 10 ذوی الحجہ کو کنکریاں مارنے، قربانی کرنے، سر منڈانے، طواف کعبہ اور سعی صفامروہ سے فارغ ہو جاؤ تو اس کے بعد جو تین دن منیٰ میں قیام کرنا ہے وہاں خوب اللہ کا ذکر کرو کیونکہ جاہلیت میں تم اپنے آباو جداد کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ ۚ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

نیک اعمال مثلاً حج کے بعد بھی استغفار کرو، دعا کرتے رہو کہ اللہ قبول فرمالے۔

اور اللہ کا ذکر ایسے کرو جیسے اس نے تم کو ہدایت کی۔وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ

جامع ترین دعا

دنیا اور آخرت میں کامیابی کی دعا:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرہ۔201)

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔(آمین)

حضور ﷺ یہ دعا کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔(بخاری)

ہمیں چاہیے کہ اس دعا کو ہر نماز کے بعد پڑھیں۔

حج یا عمرہ کے طواف کے دوران بھی ہر چکر میں یہ دعا پڑھی جائے۔رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان اس دعا کو پڑھنا مسنون عمل ہے۔

یہ دعاء ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون میسر آتا ہے آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے۔یہی وجہ کہ رسول اللہ ﷺ

بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے، رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعاء مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعوی غلط اور خیال خام ہے، انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت وطاعت سب میں دنیاوی ضروریات کا محتاج ہے وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کام کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے انبیاءؑ کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعاء مانگنے کو زہد وبزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقام انبیاءؑ سے بے خبر اور جاہل ہے ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے، بلکہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھی فکر کرے اور اس کے لئے بھی دعاء مانگے۔

اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرہ۔205)

اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ (البقرہ۔205)

دین میں مکمل داخل ہو جاؤ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ البقرہ۔208

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، کیوں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

شان نزول: عکرمہ کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام، اسد بن عبید ثقلبہ وغیرہ جو یہود سے مسلمان ہوئے تھے انہوں نے حضور ﷺ سے گزارش کی ہمیں ہفتہ کے دن کی عزت اور راتوں کے وقت توراۃ پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے جس پر یہ آیت اتری کہ اسلامی احکام پر عمل کرتے رہو۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ بعض اہل کتاب باوجود ایمان لانے کے توراۃ کے بعض احکام پر جمے ہوئے تھے ان سے کہا جارہا ہے کہ دین اسلام میں پوری طرح آجاؤ اس کا کوئی عمل نہ چھوڑو۔ توراۃ پر صرف ایمان رکھنا کافی ہے۔ اہل ایمان کو کہا جارہا ہے کہ اسلام میں خوشدلی کے ساتھ اور پورے داخل ہوجاؤ۔ اس طرح نہ کرو کہ جو باتیں تمہاری مصلحتوں اور خواہشات کے مطابق ہوں ان پر تو عمل کرلو دوسرے حکموں کو نظر انداز کردو۔ اسی طرح جو دین تم چھوڑ آئے ہو اس کی باتیں اسلام میں شامل کرنے کی کوشش مت کرو بلکہ صرف اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ۔ اس سے دین میں بدعات کی بھی نفی کردی گئی اور آجکل کے سیکولر ذہن کی تردید بھی جو اسلام کو مکمل طور پر اپنانے کے لئے تیار نہیں۔

اسی طرح جو لوگ رسوم ورواج اور علاقائی ثقافت اور روایات کو پسند کرتے ہیں اور انہیں چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے جیسے مرگ اور شادی بیاہ کی مسرفانہ رسوم اور دیگر رواج وغیرہ۔

تمام معاملات کا اختیار اللہ کے پاس ہے

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ (البقرہ۔210)

آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔

دسواں رکوع: سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ۔۔۔ (البقرہ۔211)

اس رکوع میں بنی اسرائیل کیلئے آیات بینات کا ذکر، امّت واحدہ کا تصور، مذموم اختلاف کا ذکر، ایمان کے بعد آزمائش لازم وملزوم، اللہ کی نصرت ضرور آئے گی (الا انّ نصر اللہ قریب)، مالی انفاق کی تاکید، بھلائی کے کاموں پر خرچ کرو، تمہاری ہر نیکی اور بھلائی اللہ کے علم میں ہے (وما تفعلو من خیر فانّ اللہ بہ علیم)، ضروری نہیں کہ تمہاری پسند تمہارے لئے بہتر بھی ہو (عسیٰ ان تحبو شیئاًو ھو شرٌ لکم)۔

ساری انسانیت ایک ہی ملت تھی

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (البقرہ۔213)

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب وملت اور عقیدہ وخیال پر تھے جو دین فطرت تھی پھر ان میں مزاج ومذاق اور رائے وفکر کے اختلاف سے بہت سے مختلف خیالات وعقائد پیدا ہوگئے جن میں یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا۔ حق کو واضح کرنے اور صحیح راہ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ بھیجے اور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی انبیاءؑ کی جدوجہد اور تبلیغ واصلاح کے بعد انسان دو گروہوں میں منقسم ہوگئے ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاءؑ کے اطاعت گذار ہوگئے۔ دوسرے وہ جنہوں نے آسمانی ہدایات اور انبیاءؑ کو جھٹلایا۔ حضرت ابن عباس (رض) کا بیان ہے کہ حضرت نوح اور حضرت آدم کے درمیان دس زمانے تھے ان زمانوں کے لوگ حق پر تھے اور دین کے پابند تھے پھر اختلاف ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم دکھانے کیلئے انبیاء (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا۔

وَاللّٰہُ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ۔ (البقرہ۔213)

اور اللہ جسے چاہے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

مسنون دعا: اللھم ارنا الحق حق وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

۔

اے اللہ ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی تابعداری نصیب فرما اور باطل کو باطل دکھا اور اس سے بچا۔ (آمین)

ایمان اور آزمائش

ہم سب کو آزمائش سے گزرنا ہے

جنت میں داخلے کا راستہ: آزمائشوں میں صبر

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ۔ (البقرہ۔214)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہیں وہ (حالات) پیش نہیں آئے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں انہیں سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہو گی سنو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔

ایمان و آزمائش لازم و ملزوم

ایمان کے بعد امتحان اور آزمائش آتی ہے

اس آیت میں متنبہ کیا جارہا ہے کہ دین و ایمان کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر تمہیں سونا ہے، یہ تو ایک عظیم الشّان اور پُر خطر خدمت ہے، جس کا بار اٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب اور آزمائشیں آسکتی ہیں۔

حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے کہ سب سے زیادہ آزمائشیں اور مشکلات انبیاء علیھم السلام کو پیش آئیں: اشد البلاء الانبیاء ثم الامثل۔۔۔

ہر صاحب ایمان کو آزمائش کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ راہ حق میں مشکلات آسکتی ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَۙ۔

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ اور (ان آزماشوں میں) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے۔ (البقرہ۔155)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، بھوک سے مراد روزوں کی بھوک ہے، مال کی کمی سے مراد زکوٰۃ کی ادائیگی ہے، جان کی کمی سے مراد بیماریاں ہیں۔ (واللہ اعلم)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی آزمائش ضرور کرتا ہے کبھی کامیابی، ترقی اور بھلائی کے ذریعے اور کبھی تنزلی اور ناکامی کے ذریعے۔

سچائی، دیانتداری، ایمانداری، حق گوئی کے نتیجے میں مشکلات آسکتی ہیں۔ رزق حلال کی طلب میں کاروباری نقصانات اٹھانے پڑسکتے ہیں۔ اگر ان تمام آزمائشوں میں صبر و ثبات دکھاؤ گے اور تمام مشکلات کا مقابلہ

عزم واستقلال کے ساتھ کروگے تو تم پر ضرور اللہ کی رحمت نازل ہوگی اور اللہ کی نصرت بھی آئے گی۔

اقبال مرحوم نے کہا تھا:

؎ چو می گویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

میں جب کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں

کیوں کہ میں لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد آنے والی مشکلات کو جانتا ہوں۔

انفاق فی سبیل اللہ، ترغیب صدقات، بخل کی مذمت

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ط وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ۔ (البقرہ۔215)

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ البقرہ۔215

نفلی خیرات

مقاتلؒ فرماتے ہیں یہ آیت نفلی خیرات کے بارے میں ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے نبی لوگ تم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کس طرح خرچ کریں تم انہیں کہہ دو کہ ان لوگوں سے سلوک کریں جن کا بیان اس آیت میں ہوا۔ حدیث میں ہے کہ اپنی ماں سے سلوک کر اور اپنے باپ اور اپنی بہن سے اور اپنے بھائی سے اور قریبی لوگوں سے۔ یہ حدیث بیان فرما کر حضرت میمون بن مہران نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا: ان لوگوں کے ساتھ مالی سلوک کیا جائے اور ان پر مال خرچ کیا جائے نہ کہ طبلوں باجوں تصویروں اور دیواروں پر کپڑا چسپاں کرنے میں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ تم جو بھی نیک کام کرو اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ اس پر بہترین بدلہ عطا فرمائے گا وہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔

تم جو کچھ خرچ کرو اللہ اس کا بدلہ دے گا۔ اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ (سورۃ سباء۔34)

حدیث: ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں ایک دعا کرتا ہے اے اللہ تیری راہ میں خرچ کرنے والے کو عزت فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! بخیل کے مال کو ضائع کر۔

حدیث: انسان کہتا رہتا میرا مال میرا مال حالانکہ تیرا مال وہ ہے جسے تو نے کھایا وہ تو فنا ہو چکا اور جسے پہن لیا وہ بوسیدہ ہو گیا ہاں جو تو نے صدقہ میں دیا اسے تو نے باقی رکھ لیا اس کے سوا جو کچھ ہے اسے تو دوسروں کے لئے چھوڑ کر یہاں سے چلا جائے گا۔

حدیث: یا ابن آدم! انفق ، انفق علیک۔ اے ابن آدم تو میری راہ میں خرچ کر میں تجھے دیتا چلا جاؤں گا۔

گیارہواں رکوع: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ ۔۔۔ (البقرہ۔217)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا ذکر، لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنے اور اللہ کی عبادت سے روکنے کی مذمت، فتنہ و فساد جنگ سے بھی برا ہے، ایمان، ہجرت اور اللہ کے راستے میں جدوجہد کی اہمیت، اللہ کی رحمت کے امیدوار لوگ، دین اسلام میں حسن سوال کی روایت، شراب اور جوئے کی حرمت کا تدریجی حکم، یتیموں کے حقوق کا ذکر، نکاح اور شادی کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرو، دینداری کو ترجیح دو بالخصوص عقیدہ کو پیش نظر رکھو تاکہ ملحد یا بے دین سے نکاح نہ کر بیٹھو۔

حسن سوال کی روایت

دین اسلام میں سوال کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اہل علم سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے۔
فاسئلو اہل الذکر۔۔
یسئلونک: وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں، پوچھتے ہیں۔

شراب اور جوئے کی حرمت کے تدریجی مراحل

آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دو ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔۔ البقرہ۔219

تربیت کا اصول۔ تدریج اور حکمت

شراب، نشہ اور جوئے کے دینی، دنیاوی، انفرادی اور سماجی نقصانات

اللہ اور رسولؐ کی یاد سے غفلت،

اچھائی اور برائی، حرام، حلال کی تمیز ختم

کام، محنت اور دل و دماغ کی صلاحیتوں کے استعمال کے بجائے وہمی منافع کی امید،

سستی اور کاہلی،

لڑائی، جھگڑے، فتنہ و فساد، بے سکونی، گھریلو تشدد

اہل و عیال اور متعلقین کا متاثر ہونا،

مالی اور اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ پن

جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی مسائل

اسلامی احکامات کی رو سے ہر طرح کی نشہ آور اشیاء بشمول تمام منشیات حرام ہیں۔

حدیث مبارکہ کے اندر فرمایا گیا: كل مسكر حرام یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔(مسلم)

دوسری حدیث کے اندر فرمایا گیا کہ: ما اسكر كثيره فقليله حرام۔ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کا قلیل استعمال بھی حرام ہے۔(ابو داؤد، ابن ماجہ)

تمباکو نوشی (سموکنگ، حقہ، شیشہ، نسوار وغیرہ) اگرچہ نشہ آور اشیاء کے دائرے میں نہیں آتی مگر دوسری وجوہات مثلاً مکروہ عادت، فضول خرچی اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈالنے کی وجہ سے سخت ناپسندیدہ ہیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرہ۔219)

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو جو ضرورت سے زائد ہو۔۔(البقرہ۔219)

عبداللہ ابن عباس کا ایک قول مروی ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو گیا۔

یہ اخلاقی ہدایت ہے یا پھر یہ حکم ابتدائے اسلام میں دیا گیا جس پر فریضہ زکوٰۃ کے بعد عمل ضروری نہیں رہا تاہم افضل ضرور ہے۔(فتح القدیر)۔

حضرت طاؤس کہتے ہیں ہر چیز میں تھوڑا تھوڑا اللہ کی راہ بھی دیتے رہا کرو۔

ربیع کہتے ہیں افضل اور بہتر مال اللہ کی راہ میں دو۔

سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حاجت سے زائد چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ جو آسان اور سہولت سے ہو اور دل پر شاق (گراں) نہ گزرے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں ایسا نہ کرو کہ سب دے ڈالو اور پھر خود سوال کے لئے بیٹھ جاؤ۔

حدیث: حضور ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا اپنے نفس سے شروع کر پہلے اسی پر صدقہ کر پھر تو اپنے بال بچوں پر پھر باقی بچے تو قرباء پر اور حاجت مندوں پر۔(مسلم)

حدیث: سب سے افضل خیرات وہ ہے جو انسان اپنے خرچ کے مطابق باقی رکھ کر بچی ہوئی چیز کو اللہ کی راہ میں دے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہے، پہلے انہیں دے جن کا خرچ تیرے ذمہ ہے۔(الید العلیا خیر من الید السّفلیٰ، وابدا بمن تعول)

حدیث: اے ابن آدم! جو تیرے پاس اپنی ضرورت سے زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالنا ہی تیرے لئے بہتر ہے اس کا روک رکھنا تیرے لئے برا ہے ہاں اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرنے میں تجھ پر کوئی ملامت نہیں۔

اسلام نے یقیناً انفاق کی بڑی ترغیب دی ہے لیکن یہ اعتدال ملحوظ رکھا ہے کہ ایک تو اپنے زیر کفالت افراد کی خبر گیری اور ان کی ضرویات کو مقدم رکھنے کا حکم دیا ہے دوسرے اس طرح خرچ کرنے سے بھی منع کیا ہے کہ کل کو تمہیں یا تمہارے خاندان کو دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑ جائے۔ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ تمہارا اپنے بچوں کو مالدار چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں غریب اور نادار چھوڑ کر جاؤ۔

یتیم کا مال اور ہماری ذمہ داری

وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى ۖ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ۔ (البقرہ۔220)

اور یتیموں کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں، کہہ دو ان کیلئے اصلاح / بھلائی کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔(البقرہ۔220)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ۔ اللہ جانتا ہے کون فساد پھیلا رہا ہے اور کون اصلاح کر رہا ہے۔(البقرہ۔220)

شان نزول: حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں پہلے یہ حکم ہوا تھا کہ آیت: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰي يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔(الانعام۔152) یعنی یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہترین طریقہ ہو۔ اور فرمایا گیا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔(النساء۔10)۔ یعنی جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ بھڑکتی ہوئی جہنم میں عنقریب داخل ہوں گے۔ تو ان آیتوں کو سن کر ان لوگوں نے جو یتیموں کے والی تھے یتیموں کا کھانا اور ان کا پانی اپنے گھر کے کھانے اور گھر کے پانی سے بالکل جدا کر دیا اب اگر ان کا پکا ہوا کھانا بچ جاتا تو اسے یا تو وہ یتیم خود ہی دوسرے وقت کھائے یا خراب ہو جائے تو یوں ایک طرف تو ان یتیموں کا نقصان ہونے لگا دوسری جانب والیان یتیم بھی تنگ آ گئے کہ کب تک ایک ہی گھر میں اس طرح رکھ رکھاؤ کیا کریں تو ان لوگوں نے آکر حضور ﷺ سے عرض کی جس پر یہ آیت: قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ۔(البقرۃ۔220) نازل ہوئی اور نیک نیتی اور دیانت داری کے ساتھ ان کے مال کو اپنے مال میں ملا لینے کی رخصت دی گئی۔ ابو داود و نسائی میں یہ روایتیں موجود ہیں۔

پھر فرمایا کہ اللہ تمہیں تکلیف و مشقت میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ یتیم کا نگران اگر تنگ دست، مسکین، محتاج ہو تو دستور کے مطابق یتیم کا مال کفالت کی ذمہ داری کے عوض اپنے خرچ میں لا سکتا ہے، اور اگر کسی مالدار نے بوقت ضرورت اس کی چیز کام میں لے لی اور پھر بروقت واپس ادا کر دی تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

نکاح کیلئے رشتہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرو

عقیدہ کو پیش نظر رکھو تا کہ ملحد یا بے دین سے نکاح نہ کر بیٹھو۔

ولا تنکحو المشرکات۔۔۔ البقرہ۔221

اس آیت میں اہل ایمان کو ایمان دار مردوں اور عورتوں سے نکاح کی تاکید کی گئی ہے اور دین کو نظر انداز کرکے محض حسن و جمال کی بنیاد پر نکاح کرنے کو نقصان دہ قرار دیا گیا جس طرح حدیث میں بھی نبی ﷺ نے فرمایا: تنکح المراۃ

لاربع، لمالھا ولجمالھا ولحسبھا ولدینھا۔ لوگ نکاح میں عموماً چار چیزوں کو مد نظر رکھتے ہیں، تم دینداری کو ترجیح دو۔ (بخاری، مسلم)

اسی طرح آپ ﷺ نے نیک عورت کو دنیا کی سب سے بہتر متاع قرار دیا ہے فرمایا: خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (صحیح مسلم)

اہل کتاب (یہودی یا عیسائی) عورتوں سے نکاح کی اجازت قرآن نے دی ہے۔ البتہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی اہل کتاب مرد سے نہیں ہو سکتا۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو ناپسند کیا۔ (ابن کثیر)

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّـةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِہٖ ۚ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ۔

اور اللہ اپنی مہربانی سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنے حکم سے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ البقرہ۔221

بارہواں رکوع: وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ۔۔۔ (البقرہ۔222)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں خواتین کے مخصوص احکامات کا ذکر، توبہ اور طہارت کی اہمیت (انّ اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین)، مطلقہ عورت کی عدت، قسموں کو ڈھال نہ بناؤ، فضول قسمیں کھانے کی مذمت، حقوق الزوجین (میاں بیوی کے حقوق)، حقوق کا پیمانہ، خواتین کے مساوی حقوق (ولھنّ مثل الذی علیھنّ بالمعروف۔۔) البتہ مردوں پر اضافی انتظامی اور مالی ذمہ داریاں۔

خواتین کے مخصوص احکامات

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ۔ البقرہ۔222

شان نزول: زمانہ جاہلیت میں لوگ حائضہ عورتوں کو نہ اپنے ساتھ کھلاتے تھے اور نہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان کو مخصوص ایام میں ایک لحاظ سے اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح دوسرے مذاہب میں عورتوں کے مخصوص ایام میں ان کو نہ صرف ایک قابل نفرت چیز سمجھا جاتا تھا بلکہ ان سے ہر لحاظ سے معاشرتی بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔

صحابہ کرام نے اس بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا جس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ اسلام نے سوائے جماع کے حائضہ عورتوں سے تمام معاشرتی تعلقات کو جائز قرار دیا۔ البتہ عبادات کے حوالے سے عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حیض کی حالت میں نماز، روزہ وغیرہ سے مستثنیٰ ہیں۔ پاکی حاصل کرنے کے بعد انھیں جب سہولت ہو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرنی ہوگی، البتہ چھوٹی ہوئی نمازیں معاف ہیں، ان کی قضا کی ضرورت نہیں۔ اس سے خواتین کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ وہ پڑھی گئی نمازوں پر اتنا اجر دے سکتا ہے جس سے چھوٹی ہوئی نمازوں کی تلافی ہو جائے۔ اس دوران خواتین اذکار، تسبیحات، توبہ و استغفار اور دعاؤں کا اہتمام کر سکتی ہیں۔ بعض فقہاء تلاوتِ قرآن کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: حضور ﷺ کے زمانے میں ہمیں (دوران حیض) صرف چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ (بخاری، مسلم)

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مخصوص ایام میں چھوٹ جانے والی نمازوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی قضا میں عورتوں کے لیے مشقت ہے۔ اس لیے انھیں قضا کا حکم نہیں دیا گیا۔ جب کہ اس دوران چھوٹ جانے والے روزوں کی تعداد کم ہوتی ہے، عورتیں آسانی سے ان کی قضا کر سکتی ہیں، اس لیے انھیں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کا حکم دیا گیا ہے۔ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری)

عورت کے ساتھ نرمی اور رعایت

مخصوص ایّام میں عبادات سے استثناء اسلام کی عادلانہ تعلیمات کی عکاسی کرتا ہے۔ عورت اپنے مخصوص ایام میں ہارمونز کی تبدیلی کی وجہ سے طبیعت کے اتار چڑھاؤ اور موڈ سوئنگ کے زیر اثر رہتی ہے۔ اس مخصوص جذباتی حالت کی وجہ سے اللہ نے اسے اپنی تمام عبادات سے رخصت عطا فرما کر ایک لحاظ سے رعایت عطا فرما دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات رحمدلی اور ہمدردی پر مبنی ہیں۔ لہٰذا خاوند، اہل خانہ اور متعلقہ افراد کو بھی چاہئے کہ وہ بھی ان دنوں میں عورت کے ساتھ روزمرّہ کے باقی امور میں نرمی اور رعایت کا معاملہ کریں۔

مصنوعی طریقے سے ایام حیض کو روکنا یا موخر کرنا

اللہ تعالیٰ نے خواتین کو حیض اور نفاس (پیدائش کے بعد آنے والا خون) کی صورت میں بعض رخصتیں دی ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رمضان لمبارک کے ایام ہوں یا حج و عمرہ کا موقع، حیض کو روکنے اور آگے بڑھانے والی دواؤں کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو فطرت پر پیدا کیا ہے۔ فطرت میں دخل اندازی اور چھیڑ چھاڑ بسا اوقات فساد کا باعث بنتی ہے۔ خواتین میں حیض ایک فطری مظہر ہے۔ اسے مصنوعی تدابیر سے روکنے میں نقصان کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت رمضان میں یا حج و عمرہ کے موقع پر دواؤں کے ذریعے حیض کو روک لے تو کیا اس کا یہ عمل درست ہے؟ اور کیا اس کی عبادت بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک عورت حیض روکنے کے لیے دوا کا استعمال کرتی ہے۔ کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مصنف عبد الرزاق)

خلاصہ یہ کہ عام حالات میں حیض کے معمول کو دواؤں کے ذریعے ڈسٹرب کرنے کی کوششیں نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ اگر کبھی شدید ضرورت محسوس ہو تو کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد ایسی دوا لی جا سکتی ہے جس سے ضَرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

حدیث مبارک میں ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ام المومنین حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھیں۔ اس موقع پر انھیں حیض جاری ہو گیا۔ وہ رونے لگیں کہ اس کی وجہ سے ان کے مناسک چھوٹ جائیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں تسلی دی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: فاقضی ما يقضی الحاج، غير أن لا تطوف بالبيت۔ وہ سب کام کرو جو حاجی کرتا ہے، صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرو۔ (بخاری)

عورت کیلئے مخصوص ایّام میں حج، عمرہ کا طریقہ

مخصوص ایّام میں عورت کیلئے حج یا عمرہ کا احرام باندھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر عورت نے حالتِ حیض میں حج یا عمرہ کا احرام باندھا یا احرام باندھنے کے بعد مخصوص ایام شروع ہو گئے تو اس صورت میں عورت کے لیے تمام افعال کرنا جائز ہیں صرف طواف کرنا اور نماز پڑھنا منع ہے۔ اس لیے احرام کی نیت کرتے وقت جو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے وہ نہ پڑھے، بلکہ غسل یا وضو کر کے قبلہ رخ بیٹھ کر احرام کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لے، اب اگر اس عورت نے صرف حج کا احرام باندھا ہے تو چوں کہ حالتِ حیض میں مسجد میں داخل ہونا اور بیت اللہ کا طواف کرنا جائز نہیں؛ اس لیے مکہ مکرمہ پہنچ کر طوافِ قدوم نہ کرے، اگر منیٰ جانے سے پہلے طہارت حاصل ہو جائے تو غسل کر کے طوافِ قدوم کر

لے، اور اگر منیٰ جانے سے پہلے طہارت نہیں ہوئی تو طوافِ قدوم چھوڑ دے اور منیٰ چلی جائے، طوافِ قدوم چھوڑنے کی وجہ سے کوئی کفارہ یا دم لازم نہیں ہو گا؛ کیوں کہ طوافِ قدوم فرض یا واجب نہیں، بلکہ سنت ہے، البتہ دس ذی الحجہ سے بارہ ذی الحجہ کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جو طواف کیا جاتا ہے جس کو طوافِ زیارت کہتے ہیں، یہ طواف فرض ہے، لہٰذا اگر عورت اس دوران حالتِ حیض میں ہو تو پاک ہونے تک طوافِ زیارت میں تاخیر کرے، پاک ہونے کے بعد غسل کر کے طواف کرے اور چوں کہ یہ تاخیر عذر کے سبب سے ہوئی اس لیے اس تاخیر کی وجہ سے کوئی کفارہ یا دم واجب نہیں ہو گا۔ لیکن اگر پاک ہونے تک وہاں رہنے کی اجازت نہیں ملتی ہے یا محرم واپس آرہا ہے تو اسی حالت میں طوافِ زیارت کرلے اور حدودِ حرم میں ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) قربان کرے۔ جس کی آسان صورت یہ ہے کہ مکہ میں بنک میں رقم جمع کروادی جاتی ہے اور وہ بنک جانور کی قربانی کروا دیتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے رخصت ہونے کے وقت جو طواف کیا جاتا ہے وہ طوافِ وداع کہلاتا ہے، یہ طواف واجب ہے، لیکن اگر مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت عورت حالت حیض میں ہو تو اس طواف کو چھوڑ دے، حیض کی وجہ سے طواف وداع چھوڑنے سے کوئی کفارہ، دم یا قضا لازم نہیں ہو گی۔

اگر عورت نے حالتِ حیض میں عمرہ کا احرام باندھا یا احرام باندھنے کے بعد مخصوص ایام شروع ہو گئے تو مکہ مکرمہ جانے کے بعد پاک ہونے کا انتظار کرے اور پاک ہونے کے بعد غسل کر کے عمرہ کرلے، لیکن اگر واپسی سے پہلے پہلے حیض سے پاک ہو کر عمرہ کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، یعنی ویزا بڑھانے کی یا محرم کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت نہیں تو مجبوراً حالتِ حیض ہی میں عمرہ کرلے اور حرم کی حدود میں ایک دم (بھیڑ یا بکری کی قربانی) دے دے۔

توبہ اور پاکیزگی

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ (البقرہ۔222)

اللہ توبہ کرنے والوں کو اور صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اللہ کے نام کو جھوٹی قسموں کیلئے استعمال نہ کرو

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

اللہ کے نام کو قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو تا کہ تم نیکو کار، پرہیز گار بن سکو۔ اور لوگوں میں صلح کرا سکو اور اللہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ البقرہ۔224

حضور ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے فرمایا اے عبدالرحمن سرداری، امارت کو طلب نہ کر اگر بغیر مانگے دی جائے گا تو اللہ کی جانب سے تیری مدد کی جائے گی اور اگر تو نے خود مانگ کر لی ہے تو تجھے اس کی طرف سونپ دیا جائے گا۔ تو اگر کوئی قسم کھالے اور اس کے خلاف بھلائی دیکھ لے تو اپنی قسم کا کفارہ دے دے اور اس نیک کام کو کر لے۔ (بخاری و مسلم)

قسموں کو مذاق نہ بناؤ

فضول قسمیں نہ اٹھاؤ

فیملی کے معاملات

نکاح اور طلاق کے احکامات

حقوق الزّوجین۔ میاں بیوی کے باہمی حقوق

حقوق وواجبات کا پیمانہ یکساں ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِى عَلَيهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيهِنَّ دَرَجَةٌ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (البقرہ۔228)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ البقرہ۔228

عورت کا مقام: اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اولیاء جس کے حوالے

کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود گھریلو اشیاء کی طرح مال وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کرڈالے اس کو پوچھنے کو بھی کوئی حق نہ تھا بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین ومذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا اس کو عبادت کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ در گور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سَتی کر دیا جاتا تھا۔

الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام ومذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل ودانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل وانصاف سے۔

قربان جایئے رحمۃ للعالمین ﷺ اور آپ کے لائے ہوئے دین حق پر جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں۔ انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل وانصاف کا قانون جاری کیا۔ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں (ولھنّ مثل الذی علیھنّ بالمعروف)، اس کو آزاد وخود مختار بنایا، وہ اپنی جان ومال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی، وہ اپنی کمائی کی مکمل حقدار ہے جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے اگر نامنظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے۔ اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا واجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ با اختیار ہے، کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر ڈال دی گئیں اس کے باوجود میراث میں اس کا حصہ مقرر ہے، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو دین اسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو اداء حقوق پر ورنہ طلاق پر مجبور کر سکتی ہے، شوہر کی طرف سے حقوق کی عدم ادائیگی پر اسے فسخ نکاح اور خلع کا حق دیا گیا۔

اگرچہ دنیا میں مرد کو کچھ اضافی انتظامی ذمہ داریاں دی گئیں لیکن یہ بات واضح کر دی گئی کہ مرد وعورت کا اجر وثواب برابر ہے۔ مرد اور عورت میں اخروی لحاظ سے کوئی فرق نہیں: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ

مُؤْ مِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ (16:97) یعنی جو مرد و عورت نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔

اسی طرح آیت: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔ (یعنی عورتوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو مردوں کے حقوق ہیں)۔ اس آیت میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا گیا، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور طاقت کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

تیرھواں رکوع: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ ۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ ۢ بِاِحْسَانٍ۔۔۔ (البقرہ۔229)

اس رکوع میں طلاق اور خلع کے مسائل اور احکام، خانگی مسائل کے دوران اخلاقی رویّے، طلاق میں احسان اور بھلائی والا رویہ اختیار کرنے کی تاکید، بیوی کو اذیت یا تنگ کرنے کیلئے روکے رکھنے کی ممانعت، عورت سے ہر حال میں حسن سلوک کی تاکید، یہ اللہ کی حدود ہیں ان کی ہر حال میں پابندی کرو، حق مہر کے احکامات، دو طلاق کے بعد بھی میاں، بیوی کے درمیان دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ دوسرے شوہر سے طلاق یا بیوہ ہو جانے کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ۔ اللہ کے احسانات کو یاد کرو، تقوٰی اور خوف خدا کی روش اختیار کرو۔ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔

طلاق کی تعداد، ان کے درمیان وقفہ اور اس کے پس منظر میں حکمتیں

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ ۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ ۢ بِاِحْسَانٍ۔

طلاق دو دفعہ تک ہی ہے۔ یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا اچھے سلوک کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنا ہے۔

البقرہ۔229

یعنی وہ طلاق جس میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے وہ دو مرتبہ ہے پہلی مرتبہ طلاق کے بعد بھی اور دوسری مرتبہ طلاق کے بعد بھی رجوع ہو سکتا ہے تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کی اجازت نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں خاوند کا حق طلاق ورجوع غیر محدود تھا جس سے عورتوں کی حق تلفی کا راستہ کھل جاتا لہٰذا اسلام نے اس کی حد بندی فرمادی۔ طلاق کی تعداد بھی مقرر فرمادی اور عورت کو خلع اور فسخ نکاح کا حق بھی دے دیا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا، وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں۔(البقرہ۔229)

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ۔

اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور وہ عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں یا تو حسن سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا اچھے طریقے سے رخصت کر دو اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہئے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ اور خدا نے تم کو جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے ان کو یاد کرو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔(البقرہ۔231)

نکاح وطلاق کو کھیل نہ بناؤ

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ مذاق میں طلاق دے دیتے یا نکاح کر لیتے تھے پھر کہتے میں نے تو مذاق کیا تھا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ اللہ نے اسے آیات الٰہی سے استہزاء قرار دیا جس سے مقصود اس سے روکنا ہے۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مذاق سے بھی اگر کوئی مذکورہ کام کرے گا تو وہ حقیقت ہی سمجھا جائے گا۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ثلاث جدہن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة۔ یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد وارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے ایک نکاح دوسرے طلاق تیسری رجعت۔

ایک اور حدیث کے اندر فرمایا کہ مذاق کی طلاق، نکاح یا غلامی سے آزادی نافذ ہو جائے گی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قرآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا بلکہ مربیانہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت ومصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان

کی مضرت ونقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر نہ ہو ان جرائم پر اقدام کرہی نہیں سکتا۔ ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف و آخرت کا حساب دلایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ادا ساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے۔ ہر قرآنی حکم کے آگے پیچھے اِتَّقُوا اللّٰهَ یا اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ جیسے جملے ملتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں جہاں بھی گناہ کا ذکر ہے اس کے بعد عموماً توبہ و استغفار کے دروازے کا بھی ذکر ہے کہ اگر سچی توبہ کرلو تو اللہ پچھلے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔

چودھواں رکوع: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ۔۔۔ (البقرہ۔232)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں طلاق، رضاعت کے احکامات، مدت رضاعت، عدت وفات، عدت کے پس منظر میں حکمت اور مصلحت، عدت کے بعد عورت اپنے مستقبل کے معاملات میں بااختیار ہے۔

رضاعت اور کفالت کے احکامات

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ۔۔۔(البقرہ۔233)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔۔۔

عدت کے مسائل

عدت کے احکامات اور حکمتیں

مطلقہ کی عدت تین مہینے

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔۔۔(البقرہ۔228)

بیوہ کی عدت: چار مہینے دس دن

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ

تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اُن کے پیچھے اگر اُن کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن (عقد ثانی سے) روکے رکھیں۔ البقرہ۔234

عدت کے بعد عورت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں بااختیار ہے:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔

پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے، تو انہیں اختیار ہے، اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں، کریں تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ البقرہ۔234

عدت وفات ہر عورت کے لئے ہے چاہے گھر میں رہے یا گھر کے باہر، جوان ہو یا بوڑھی۔ البتہ اس سے حاملہ عورت مستثنٰی ہے کیونکہ اسکی مدت عدت وضع حمل ہے۔ اس عدت وفات میں عورت کو زیب وزینت کی اور مرحوم شوہر کے گھر کو چھوڑ کر کسی اور جگہ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بیوہ یا مطلقہ کسی اور جگہ نکاح کریں تو اس میں کوئی حرج یا قباحت نہیں۔ اس آیت (البقرہ:234) سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ بیوہ یا مطلقہ کے عقد ثانی کو برا نہیں سمجھنا چاہئے نہ اس میں رکاوٹ ڈالنی چاہئے جیسا کہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرتی ماحول میں اس کو مذموم سمجھا جاتا ہے۔

پندرھواں رکوع: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ۔۔۔ (البقرہ۔236)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں طلاق، علیحدگی اور حق مہر کے مزید احکامات کا تذکرہ، نمازوں کی پابندی اور حفاظت کی تاکید بالخصوص صلوٰۃ الوسطٰی کی اہمیت، نماز میں اعتدال اور قنوت کا حکم (قوموللہ قانتین)، مخصوص حالات مثلاً بدامنی اور خطرہ کی صورت میں پیدل یا سواری پر نماز کی اجازت۔

نماز کی پابندی اور حفاظت

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔(البقرہ۔238)

سب نمازوں کی حفاظت کیا کرو اور (خاص کر) درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب اور خشوع سے کھڑے رہا کرو۔ البقرہ۔238

نماز کی پابندی: بہترین عمل

رسول اللہ ﷺ سے حضرت عبداللہ بن مسعود سوال کرتے ہیں کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نماز کو وقت پر پڑھنا۔۔۔(بخاری، مسلم)

سولہواں رکوع: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ۔۔۔ (البقرہ۔243)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی حکایت، موت یا وباء کے ڈر سے بھاگنے کا واقعہ، دوسری آیت میں اللہ کے فضل و کرم کا خصوصی تذکرہ ہے(انّ اللہ لذو فضل علی النّاس)، انسانوں کا ناشکرا پن، اللہ کی راہ میں ہر طرح کی قربانی ،اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اللہ کو قرض حسنہ دو(من ذالذی یقرض اللہ قرض حسنہ۔۔)،طاقت اور اقتدار کی کشمکش، طالوت اور جالوت کا قصہ، کچھ تاریخی کردار اور ان سے حاصل ہونے والا سبق۔

موت یا وباء کے ڈر سے بھاگنا

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔۔۔ (البقرہ۔243)

تم نے اُن لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟۔۔۔

جس بستی میں کوئی وباء طاعون وغیرہ ہو اس میں جانا یا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانا دونوں درست نہیں

حدیث: ان ھذا السقم عذب بہ الامم قبلکم فاذا سمعتم بہ فی الارض فلا تدخلوہا واذا وقع بارض و انتم بہا فلا تخرجوا فراراً ۔ (بخاری و مسلم،ابن کثیر)یعنی اس بیماری (طاعون) کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر کسی بستی میں یہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا سرحد شام پر تبوک کے قریب ایک مقام سَرَغ ہے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے۔ یہ طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اول یہ طاعون عمواس نامی ایک بستی میں شروع ہوا۔ فاروق اعظم نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملک شام میں اس وقت جانا چاہیے یا واپس ہونا مناسب ہے اس

وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کوئی حکم نہ سنا ہو بعد میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے اطلاع دی کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:
ان رسول اللہ ﷺ ذکر الوجع فقال رجز وعذابٌ عُذِبَ به الامم ثم بقی منه بقية فيذهب المرة ويأتی الاخریٰ فمن سمع به بارض فلا يقدم عليه ومن كان بارض وقع بها فلا يخرج فراراً منه ۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے (طاعونی گلٹی کے) درد کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک عذاب ہے جس سے بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا اب اس کا یہ حال ہے کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے تو جو شخص یہ سنے کہ فلاں خطہ زمین میں یہ عذاب آیا ہوا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس خطہ زمین میں نہ جائے اور جو شخص اس خطہ میں پہلے سے موجود ہے تو طاعون سے بھاگنے کے لئے وہاں سے نہ نکلے۔ (بخاری)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دے دیا۔ حضرت ابو عبیدہ ملک شام کے عامل وامیر (گورنر) بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظم کا یہ حکم سن کر فرمانے لگے: افراراً من قدر الله یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فاروق اعظم نے جواب میں فرمایا ابو عبیدہ کاش یہ بات کوئی اور کہتا یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابل تعجب ہے اور پھر فرمایا: نعم نفر من قدر الله الی قدر الله، بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثناء

حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا فراراً منہ آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں۔ اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وباء پھیلی ہوئی ہے اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہو گا۔

اللہ بڑے فضل و کرم والے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ

بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ البقرہ۔243

اللہ کو قرض حسنہ دو

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (البقرہ۔245)

کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے پھر وہ اس کے لئے اسے کئی گنا بڑھا دے گا؟ تنگی اور کشادگی دونوں اللہ کے اختیار میں ہے اور اُسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔البقرہ۔245

اللہ کو قرض حسنہ دینے سے کیا مراد ہے؟

قرض حسن کا لفظی ترجمہ اچھا قرض ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بغیر سود کے، ہمدردی کے ساتھ کسی کو دیا جائے۔اس طرح جو مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کر دوں گا، بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ قرض حسنہ سے مراد اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا یعنی مالی قربانی دینا۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے اور ان کی مالی حاجت پوری کی جائے۔

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک اہم اور ضروری چیز مال ہے۔ جس کے پاس ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے مال نہ ہو اسے قرض کی ضرورت پڑتی۔ایسے ہی ضرورت مند اور حاجت مندوں کا خیال رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ، صدقہ اور قرض جیسی چیزوں کو مشروع کیا اور زکوٰۃ وصدقہ کی طرح قرض حسنہ کو بھی باعث ثواب قرار دیا۔

حدیث میں قرض دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ کسی مالی پریشانی کے شکار آدمی کو قرض حسنہ دینا بہت بڑی نیکی ہے۔

حدیث: ما من مسلم یقرض مسلماً قرضاً مرۃ الا کان کصدقتہ مرتین ۔

جو مسلمان دوسرے مسلمان کو قرض دے دیتا ہے یہ قرض دینا اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس مال کے دو دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے۔(ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان کی تکلیف کو دُور کرے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی تکالیف کو دور کرے گا۔

قرض دینے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مقروض اگر حقیقت میں قرض کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو اسے کچھ دنوں تک مہلت دیں۔اس لیے کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ۔ تمھارا قرض دار تنگدست ہو، تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو۔(البقرہ:280)

دوسرے پارے کا آخری رکوع: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ۔۔۔ (البقرہ۔249)

رکوع کے تفسیری نکات

اس رکوع میں دو کردار (بہادری اور بزدلی) کا تذکرہ، تاریخی واقعات اور ان سے سبق، پانی اور پیاس کی آزمائش، قیادت کے اوصاف (علم، صلاحیّت، استقامت اور شجاعت نہ کہ حسب ونسب اور مال ودولت)، فتح عددی اکثریت سے مشروط نہیں (كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله)، کامیابی کا نسخہ اللہ پر بھروسہ اور توکل، رجوع الی اللہ، صبر واستقامت، صبر واستقامت کی دعا (ربّنا افرغ علينا صبراً و ثبت اقدامنا۔)، حضرت طالوت کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم، اختیار اور طاقت کی نعمت کا تذکرہ، افراد اور قوموں کے عروج وزوال کے پیچھے حکمتیں۔

طالوت اور جالوت کا قصّہ

قیادت کے اوصاف (علم، صلاحیّت، استقامت اور شجاعت نہ کہ حسب ونسب اور مال ودولت)

فتح عددی قوت سے مشروط نہیں

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔

بارہا بڑی جماعت پر چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

البقرہ۔249

اللہ کی تائید کے لئے صبر واستقامت کا اہتمام ضروری ہے۔

صبر واستقامت کی دعا:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَؕ۔ البقرہ۔252

معرکہ آرائی کے وقت اہل ایمان نے بارگاہ الٰہی میں صبر واستقامت اور فتح وکامیابی کی دعا مانگی۔ گویا مادی اسباب کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ نصرت الٰہی کے لئے دعا بھی کرتے رہیں، جیسے جنگ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے نہایت آہ وزاری سے کامیابی اور نصرت کی دعائیں مانگیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور ایک نہایت قلیل تعداد کو غلبہ عطا فرمایا۔

افراد اور قوموں کے عروج وزوال کے پیچھے حکمتیں

اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حد خاص تک تو زمین میں غلبہ وطاقت حاصل کرنے دیتا ہے، مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو کسی دوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے (ہر فرعون راموسیٰ)۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک ہی پارٹی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی فرعونیت لازوال ہوتی، تو یقیناً دنیا میں بہت بڑا فساد برپا ہو جاتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔۔۔ (البقرہ۔251)

اللہ تعالیٰ پوری کائنات پر مہربان ہیں

اللہ تعالیٰ تمام مخلوق پر فضل وکرم کرتا ہے

وَلٰـكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ (البقرہ۔251)

لیکن اللہ جہان والوں پر بہت مہربان ہے۔ (البقرہ۔251)

پارہ – 3

قرآن مجید کا تیسرا پارہ سورۃ البقرہ کی بقیہ آیات: 253 تا 286 اور سورہ آل عمران کی پہلی 91 آیات پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (البقرہ۔253)

رکوع کے تفسیری نکات

تیسرے پارے کی ابتدائی آیات میں انبیاء کے مراتب اور فضائل کا بیان ہے۔ انبیاؑ کا خاص مقام و مرتبہ، ان کے ادب کے تقاضے، سب انبیاء کا ادب و احترام اس رکوع کے اسباق ہیں۔ اس رکوع کا بیشتر حصہ دوسرے پارے کی آخری آیات میں گذر چکا ہے۔

انبیاء کے مراتب اور فضیلتیں۔ ذِکر مدارج الانبیاءؑ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ--- (البقرہ۔253)

یہ سب رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا۔ بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو صریح معجزے دیے تھے اور اسے پاکیزہ روح (جبرائیلؑ) کے ساتھ قوت دی تھی۔ (البقرہ۔253)

یہاں یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ رسولوں میں بھی مراتب ہیں، جیسے دوسری جگہ فرمایا: وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ۔ (الاسراء:55) ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔

بعض نبیوں کو باقی انبیاء پر فضیلت اور اور تمام پیغمبروں اور رسولوں پر نبی اکرم ﷺ کی فضیلت واشرفیت امّت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے۔

البتہ نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ لا تخیرونی من بین الأنبیآء (بخاری، مسلم) کہ تم مجھے انبیاء کے درمیان فضیلت مت دو۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ۔ انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔

ان احادیث سے انبیاءؑ کی باہمی فضیلتوں کا انکار لازم نہیں آتا بلکہ ان کے ذریعے امت کو انبیاء علیہ السلام کی بابت ایک خاص ادب اور احترام سکھایا گیا ہے کہ تم میری فضیلت بھی اس طرح بیان نہ کرنا جس سے دوسرے انبیاء کی شان میں کمی کا تاثر پیدا ہو۔

اس اشکال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر محض اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو۔ اس لئے کہ کسی نبی کے افضل ہونے کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا لیکن قرآن وسنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء (علیہم السلام) کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

حدیث: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا تُطْروني كما أَطْرت النصارى ابنَ مريم؛ إنما أنا عبده، فقولوا: عبد الله ورسوله۔ میری تعریف میں ایسے حد سے نہ گزرو، جیسے نصاریٰ اپنے نبی عیسیٰ ابن مریمؑ کی تعریف میں حد سے گزر گئے۔ میں تو محض ایک بندہ ہوں۔ اس لیے یوں کہو کہ یہ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔ (بخاری)

آیت کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی تھا۔ سلسلہ رسالت کی ہر کڑی نے وہی دعوت دی ہے جو اسلام کی ہے۔ جیسا کہ اسی سورت کی آخری آیات میں فرمایا گیا: لا نفرق بین احد من رسلہ۔ ہم انبیاءؑ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے۔

حدیث: ایک حدیث مبارکہ کے اندر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: والأنبياء إخوة لعلات، أمهاتهم شتىٰ ودينهم واحد۔

تمام انبیاء آپس میں علاّتی بھائیوں کی طرح ہیں۔ اگرچہ ان کی مائیں مختلف تھیں مگر ان سب کا دین ایک ہی تھا۔ (بخاری، مسلم)

عیسیٰ علیہ اسلام کا ذکر

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ۔

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

دوسرا رکوع: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔۔۔ (البقرہ۔254)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

انفاق فی سبیل اللہ، آیۃ الکرسی، دین اختیار کرنے میں کسی پر جبر نہیں: لا اکراہ فی الدین، طاغوت سے انکار کا حکم، تاریکی سے روشنی کا سفر (من الظلمات الی النور) کے موضوعات شامل ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔۔۔

اے ایمان والو جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو۔۔۔البقرہ۔254

راہ خدا میں مالی قربانیاں

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ راہ خدا میں مالی قربانیاں برداشت کریں، ہر بھلائی کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کا ثواب جمع رہے، اور پھر فرمایا کہ اپنی زندگی میں ہی خیرات وصدقات کرلو، قیامت کے دن نہ تو خرید وفروخت ہوگی نہ کسی کا نسب اور دوستی ومحبت کچھ کام آسکتی ہے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ۔ یعنی جب صور پھونکا جائے گا اس دن نہ تو نسب رہے گا نہ کوئی کسی کا پرسان حال ہوگا۔ (المؤمنون:101)

آیۃ الکرسی کی فضیلت واہمیت

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِؕ مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَاۚ وَهُوَ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ۔

اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں

جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے،

جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند،

اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں۔

کون جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے،

مخلوقات کے تمام حاضر اور غائب حالات کو جانتا ہے۔

اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جتنا چاہے،

اس کی کرسی کی وسعت نے زمین اور آسمان کو گھیر رکھا ہے

اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے،

بس وہی سب سے بلند و برتر ذات ہے۔

یہ آیت الکرسی ہے جس کی بڑی فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے مثلاً یہ آیت قرآن کی عظیم ترین آیت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلال اس کی علو شان اور اس کی قدرت و عظمت پر مبنی نہایت جامع ترین آیت ہے۔

اس آیت میں ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، اس جہان کی سب سے بڑی حقیقت جس پر نظام کائنات قائم ہے وہی ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ کسی کے اللہ کو ماننے یا نہ ماننے سے اس سچائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق آتا ہے۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبور کیا جائے۔ جو اسے مان لے گا، وہ خود ہی فائدے میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا، وہ آپ نقصان اٹھائے گا۔

اس ایک آیت میں اللہ رب العالمین کی دس صفات کا تذکرہ ہے۔

جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، حیی یا زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے

عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے باقی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی ایسے علم محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز باہر نہ رہے۔

آیۃ الکرسی کے پڑھنے سے رات کو شیطان سے تحفظ رہتا ہے۔

سخت پریشانی اور تکلیف کی دعا:

حدیث: نبی اکرم ﷺ کو جب کوئی کام سخت تکلیف اور پریشانی میں ڈال دیتا تو آپؐ یہ دعا پڑھتے:

یا حی و قیوم! برحمتک استغیث۔

اے زندہ اور ہمیشہ رہنے والے! تیری رحمت کے وسیلے سے تیری مدد چاہتا ہوں۔ (ترمذی)

آیت لکرسی کی فضیلت

حدیث میں ہے جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لے اسے جنت میں جانے سے کوئی چیز نہیں روکے گی سوائے موت کے۔ (نسائی)

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدہ آیات القرآن ہے وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔

کرسی سے کیا مراد ہے؟

کرسی سے بعض نے موضع قدمین (قدم رکھنے کی جگہ) بعض نے اللہ کا علم بعض نے اللہ کی قدرت وعظمت بعض نے بادشاہی اور بعض نے اللہ کا عرش مراد لیا ہے۔

لیکن صفات باری تعالیٰ کے بارے میں مفسرین و محدثین کا یہ مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات جس طرح قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں ان کی بغیر تاویل اور کیفیت بیان کیے ان پر ایمان رکھا جائے۔ اس لیے یہی ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ کرسی ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟

اس پر اللہ ربّ العالمین کیسے جلوہ افروز ہوتے ہیں؟ اس کو ہم بیان نہیں کرسکتے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔۔۔ ان کا مطلب سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ (آل عمران۔7)

دین میں جبر نہیں۔لا اکراہ فی الدّین

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙۦ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔۔۔(البقرہ۔256)

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے بے شک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔۔۔

شان نزول: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ نصاریٰ میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا پھر اپنے بچوں کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال پوچھا کہ کیا میں اپنے بچوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں؟ حضور ﷺ اس سوال پر خاموش رہے یہاں تک کہ یہ آیت لا اکراہ فی الدین۔۔ نازل ہوئی جس میں کسی کو زبردستی مسلمان بنانے سے روک دیا گیا۔

اس آیت میں دین سے مراد اللہ کے متعلق وہ عقیدہ ہے جو اوپر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے،اور وہ پورا نظام زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے۔آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی مسلط نہیں کیا جاسکتا۔

یہ آیت حکم کے اعتبار سے عام ہے یعنی کسی پر بھی قبول اسلام کے لیے جبر نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی دونوں کو واضح کر دیا ہے۔ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے اللہ رب العزت ہدایت دے گا وہ ہدایت قبول کرلے گا لہٰذا ہمیں کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی کیا ضرورت ہے۔۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ رشد وہدایت کو واضح کر دیا گیا ہے اور انسان کو ہدایت کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا آپشن دے دیا گیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: انّا ھدینٰہ النّجدین، امّا شاکراً وامّا کفوراً۔ ہم نے انسان کو دونوں راستے بتادئے،اب چاہے تو شکر کرے اور چاہے تو انکار کرے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا: فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔ یعنی حق کو واضح کرنے کے بعد فرمایا دیا گیا کہ اب انسان کو اختیار ہے کہ چاہے اس ہدایت کو قبول کر کے کامیابی حاصل کرے اور چاہے تو اس کا انکار کر کے آخرت میں ناکام ونامراد رہے۔

دین میں جبر واکراہ ممکن ہی نہیں

تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو در حقیقت دین وایمان کے قبول پر جبر واکراہ ممکن بھی نہیں ہے۔اس لئے کہ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام نہیں بلکہ اس کا تعلق در حقیقت قلب (تصدیق بالقلب) کے ساتھ ہے اور جبر واکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے۔اسی طرح تمام اعمال میں بھی اخلاص اور للٰہیت شرط ہے۔حدیث مبارکہ

کے اندر آتا ہے کہ کوئی بھی نیک عمل اخلاص کے بغیر بارگاہ الٰہی میں قبول ہی نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: انّ اللہ لا یقبل من العمل الاّ کان لہ خالصاً۔ اللہ تعالیٰ کسی نیک عمل کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتے جب تک وہ صرف اللہ کی رضا کیلئے نہ کیا جائے۔ اسی طرح ایک اور حدیث کے اندرع فرمایا گیا کہ: من صلّیٰ یرائی فقد اشرک،من صام یرائی فقد اشرک، من تصدق یرائی فقد اشرک۔۔یعنی جس نے دکھلاوے کیلئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھلاوے کیلئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھلاوے کیلئے صدقہ وخیرات کیا اس نے شرک کیا۔

دین یا نظریہ ایک ایسی چیز ہے کہ بیان وادراک کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کی چیز ہے، زبردستی مسلط کرنے کی چیز نہیں۔ جبر و تشدد کے ذریعے مذاہب و نظریات نہیں پھیلائے جاسکتے اور یہی پالیسی اسلام نے دین اسلام کی بابت اختیار رکی ہے۔ دین اسلام اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ غور وفکر کرنے والے دماغوں کو خطاب کرتا ہے۔ اسلام فطرت سلیمہ کو خطاب کرکے انسانی فہم وادراک کو دعوت دیتا ہے اور جبر و تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ اسلام کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو دباؤ اور جبر کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل کرے، اس معاملہ میں اسلام صرف دعوت و تبلیغ سے کام لے کر لوگوں کے دل ودماغ کو مطمئن کرتا ہے۔

جبر اور اکراہ سے صرف ظاہری اعضاء تو متاثر ہوسکتے ہیں مگر اعمال میں خلوص پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاؑ نے دلوں پر محنت کی اور لوگوں کو قبول اسلام کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا۔ اس امّت میں بھی فریضہ دعوت و تبلیغ اور فریضہ امر بالمعروف کے سلسلے میں پہلی ہدایت: ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمتہ و الموعظۃ الحسنہ دی گئی۔ یعنی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں حکمت ،موعظہ حسنہ، نرم رویہ، ہمیشہ مثبت اور تعمیری دلائل کا طریقہ اپناتے ہوئے ایسا دعوتی ماحول بنایا جائے کہ لوگ خوشی سے اسلام کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں اور ان پر عمل کی کوشش کریں۔

طاغوت سے انکار کا حکم

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔256)

پھر جو شخص شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط سہارا پکڑ لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(البقرہ۔256)

طاغوت سے کیا مراد ہے؟

الطاغوت، طغیان سے ہے۔ طاغوت لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص جو صحیح فکر سے تجاوز کر جائے جو حق سے سرکشی کرے۔ جو ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے قائم کی ہیں۔

اللہ کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین درجے ہیں۔

1۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔

2۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے لگے۔ یہ بندگی رب سے انکار ہے۔

3۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کھلم کھلا بغاوت شروع کر دے اور بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔

پس راہ راست پر وہی شخص ہے جو طاغوت کی تمام شکلوں اور تمام صورتوں سے انکار اور کنارہ کشی اختیار کرے اور صرف اللہ وحدہ پر ایمان لائے اور وہی کامیاب ہے۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک شخص مشکل حالات میں ایک مضبوط سہارا تھام لے جو گرنے والا نہ ہو۔

اندھیرے سے اجالے کی طرف

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔۔۔

اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے اور انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔۔۔ آل عمران-257

ایمان نور اور روشنی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک نور اور خاص روشنی کا نام ہے۔ وہ اپنے مزاج اور حقیقت کے اعتبار سے ایک منفرد نور ہے ۔ ایک بندہ مومن کی شخصیت نورانی ہوتی ہے۔ اس کی روح بھی پاکیزہ اور روشن ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مومن اپنے ماحول میں روشنی اور اچھائی پھیلاتا ہے۔ اس کا ماحول روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی روشنی ہے جو صرف ایک اور منفرد راستہ دکھاتی ہے۔

اس نور کے متضاد مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ شہوت وخودسری کی تاریکی، فسق وفجور کی تاریکی، کبر و غرور اور انکار و سرکشی کی تاریکی، ریاکاری اور نفاق کی تاریکی، لالچ اور نفع اندوزی کی تاریکی، شک اور بے چینی کی تاریکی۔ غرض بیشمار اور لاتعداد ظلمات ہیں جو گمراہی کی تاریکیاں ہیں اور سب کا مزاج یہ ہے کہ ان میں گھرا ہوا انسان اللہ کی راہ سے مختلف سمت کی طرف چل پڑتا ہے۔ وہ غیر اللہ سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور غیر اسلامی زندگی بسر کرتا ہے۔ جو لوگ ان اندھیروں میں زندگی بسر کرتے ہیں: أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ یہ لوگ آگ والے ہیں اور یہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ (البقرہ۔257)

تیسرا رکوع: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ۔۔۔ (البقرہ۔258)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں تین آیات ہیں اور ان کا موضوع اسلامی عقائد کے اہم پہلو یعنی اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت،، عقیدہ آخرت، زندگی اور موت کی حقیقت۔ اس رکوع میں حیات بعد الموت کو تین واقعات کی روشنی میں بیان کیا گیا:

1۔ ابراہیمؑ اور نمرود کا مکالمہ

2۔ ایک شخص کا ایک شہر کی تباہی پر غور و فکر

3۔ ابراہیمؑ کا اطمینان قلب کیلئے سوال

یہ آیات ایک بندہ مومن میں صحیح اسلامی تصور حیات پیدا کرتی ہیں۔ ان موضوعات پر اللہ تعالیٰ ایسے آثار و شواہد پیش کرتا ہے جو فطرت کے قریب اور انسان کے روزمرہ کے مشاہدے میں شامل ہیں۔

حیات بعد الموت اسلامی عقائد کا ایک اہم پہلو ہے۔ جس پر قرآن مجید میں بحث کی گئی ہے اور اس پارہ کے آغاز سے ہی اس پر بحث کی گئی ہے۔ نیز ان آیات کا ان صفات الٰہی کے ساتھ بھی براہ راست تعلق ہے جو آیت الکرسی میں بیان کی گئی ہیں۔

ابراہیمؑ اور نمـــرود کا مکالمہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ۔ (البقرہ۔258)

کیا تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اِس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی جب ابراہیمؑ نے کہا کہ "میرا رب وہ ہے، جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اُس نے جواب دیا: "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے" ابراہیمؑ نے کہا: "اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا" یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا، مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔ (آل عمران۔258)

نمـــرود اللـــہ کی ربوبیت کا منکر تھا لیـــکن ابراہیمؑ نے اسے لاجوابـــ کر دیا۔

قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔

ابراہیم نے کہا کہ خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے آپ اسے مغرب سے نکال دیجئے۔ (آل عمران۔258)

ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دور کے بادشاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو یا مکالمہ کو نقل کیا گیا ہے۔ یہاں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا، اس لئے کہ یہاں اس کے نام کے ذکر سے اصل بات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا ۔

آیت میں الَّذِيْ (ایک شخص) سے کون مراد ہے؟ اگرچہ قرآن میں نام کا ذکر نہیں کہ یہاں کون مراد ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر نمـــرود کو مراد لیا ہے۔

ایک نکتہ اور سبق اس آیت سے یہ ملتا ہے کہ کسی گناہگار کے تذکرے میں گناہ گار کا نام اہم نہیں بلکہ گناہ کا وہ فعل قابل مذمّت ہے جو اس سے سرزد ہوا، جس سے دوسرے لوگوں کو بچنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں گناہ سے نفـــرتـــ کرو، گناہگار سے نہیں۔

دوسرا ان آیات مکالمہ سے انبیاء کی ایک عظیم سنّت بھی معلوم ہوتی ہے کہ انبیاؑ ہمیشہ دلیل سے بات کرتے اور مخالف کی بات سنتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ دلائل، بات چیت اور ڈائیلاگ سے سخت ترین منکر اور مخالف کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتے۔

اس آیت سے مناظرہ اور مباحثہ کے احکام اور آداب بھی معلوم ہوتے ہیں۔اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ مخالفین اور منکرین سے ڈائیلاگ، مباحثہ اور مناظرہ کرنا جائز ہے۔بلکہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے' ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ نے اہل کتاب سے مباحثہ کیا۔

کسی بھی ڈسکشن یا مباحثہ میں انانیت' ہٹ دھرمی' کج بحثی اور اپنی ضد پر قائم رہنا اور اپنے مؤقف پر اڑے رہنا بحث کے آداب کے خلاف ہے۔اسی طرح دلیل، سوال یا اعتراض کا جواب جہالت اور بدتمیزی سے دینا کم ازکم علماء حق کی شان نہیں ہو سکتی۔

بقول شاعر:

ملّا کو جب میں نے اس کے کفر پر ٹوکا

شرع کے لہجہ میں، میں نے اس سے گالیاں سنیں

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم کو بادشاہ کہنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے اس کو ملک دیا تھا۔(ان آتٰہ اللہ الملک)۔بادشاہت اور اقتدار و اختیار ایک خداداد نعمت ہے جو اللہ بطور آزمائش اپنے بندوں میں سے کسی کو بھی عطا کر سکتا ہے(توتی الملک من تشاء)۔

نمرود کون تھا؟

نمرود بن کنعان حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں ایک بادشاہ گزرا ہے جس کا پایہ تخت بابل (قدیم عراق) تھا۔بعض مورخین کہتے ہیں کہ نمرود اصل میں لقب تھا کسی کا نام نہیں تھا۔جیسے فارس کے ہر بادشاہ کو کسریٰ اور روم کے ہر بادشاہ کو قیصر اور مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون اور حبشہ کے ہر بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کی مشرق مغرب کی سلطنت رکھنے والے چار بادشاہ گذرے جن میں سے دو مومن اور دو کافر۔مومن بادشاہوں میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت ذوالقرنین، اور کافروں میں نمرود اور بخت نصر شامل تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں شرک تقریباً اپنی ساری صورتوں کے ساتھ موجود تھا، لوگ بتوں کو پوجتے تھے، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ وقت کو رب بھی مانتے تھے۔

نمرود جو خود (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا مدعی تھا اور اپنے آپ کو اوتار بادشاہ یعنی God King کہتا تھا۔

جیسا کہ اس کے بعد فرعون نے بھی اسی طرح کا دعویٰ کیا تھا۔

نمرود کے دماغ میں رعونت اور انانیت آگئی تھی، سرکشی اور تکبر، نخوت اور غرور طبیعت میں سما گیا تھا جس کے نتیجے میں خدائی کا اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھا۔ وہ اپنے آپ کو عوام سے سجدہ کرواتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے سامنے آئے تو سجدہ نہ کیا نمرود نے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ اس نے کہا رب تو میں ہوں، انہوں نے جواب دیا کہ میں حاکم کو رب نہیں کہتا رب وہ ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہے۔

نمرود کی ناک میں مچھر کے گھسنے اور ہتھوڑوں یا جوتوں سے اپنے سر کو پٹوانے کے واقعات نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں نہ کسی صحابی سے۔

قوموں اور بستیوں کی تباہی۔ لمحہ فکریہ

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ--- (البقرہ۔259)

یا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک مسمار بستی کے پاس سے گزرا تو کہنے لگا کہ یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: "بتاؤ، کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اُس نے کہا: ایک دن یا چند گھنٹے، فرمایا: تم پر سو برس اِسی حالت میں گزر چکے ہیں---(البقرہ۔259)

اس آیت میں دنیا کی زندگی کی حقیقت کو ایک واقعاتی تمثیل کے ذریعے بیان کیا گیا۔ یہ شخص کون تھا جس کا گزر ایک بستی پر ہوا۔ وہ کون سی بستی تھی جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے۔

مفسرین کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ ہے جن کا گزر یروشلم شہر پر ہوا تھا جو تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بابل قدیم عراق کے بادشاہ بخت نصر نے 586 ق۔م میں فلسطین پر حملہ کیا تھا اور یروشلم کو مکمل تباہ و برباد کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہاں کوئی متنفس نہیں بچا تھا، جو زندہ بچے تھے ان کو وہ اپنے ساتھ قید کر کے لے گیا تھا۔۔ تو جس زمانے میں یہ شہر اجڑا ہوا تھا تو حضرت عزیر علیہ السلام کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی متنفسّ زندہ نہیں اور کوئی عمارت سلامت نہیں تو ان کے دل میں سوال پیدا ہوا: قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِہَا۔۔۔ کہ اللہ اس ویرانے کو دوبارہ کیسے آباد کرے گا؟ وہاں ٹھہر کر سوچنے لگے کہ بھلا ایسا بڑا پر رونق شہر جو اس طرح اجڑا ہے یہ پھر کیسے آباد ہو گا؟ ان کا یہ سوال اظہار حیرت کی نوعیت کا تھا کہ اس طرح اجڑی ہوئی بستی میں دوبارہ کیسے احیا ہو سکتا ہے؟ دوبارہ کیسے اس میں لوگ آکر آباد ہو سکتے ہیں؟ اس تباہی میں سے تعمیر کس طرح نمودار ہو گی؟

فَاَمَاتَهُ اللّٰہُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کر لی۔ وہ سو برس اسی حالت میں رہے۔ پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی بخشی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام پر موت نازل فرمائی، تو وہ اسی حالت میں رہے اس دوران وہاں بیت المقدس پھر آباد ہو گیا، شہر کھچا کھچ بھر گیا، وہی اگلی سی رونق اور چہل پہل ہو گئی، اب سو سال کامل کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے صرف زبانی طور پر یہ نہ کہا کہ انہیں اس طرح زندہ کیا جائے گا۔ بلکہ حضرت عزیر علیہ السلام کو واقعات کی دنیا میں بطور تجربہ دکھایا گیا۔ ان پر حیات بعد الموت کا تجربہ کیا گیا۔ اس لئے کہ تاثر اور شعور بعض اوقات اس قدر گہرے اور مشکل ہوتے ہیں کہ عقلی دلائل سے انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا، نہ منطق اور وجدان سے وہ تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ عام اور پیش افتادہ واقعات سے بھی ایسا تاثر اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شعور اور تاثر صرف براہ راست ذاتی تجربے ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے تجربے کے بعد یہ شعور انسان کے احساسات پر چھا جاتا ہے۔ دل اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر کسی مزید یقین دہانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قَالَ کَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ۔۔۔ اللہ نے اس سے پوچھا، بتاؤ کتنی مدت اس حالت میں رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ شاید ایک دن یا چند گھنٹے اس حالت میں رہا ہوں۔

انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ کتنی مدت اس حالت میں رہے۔ زمانے کا احساس اور شعور تب ہوتا ہے جب انسان زندہ ہو اور اس کی سمجھ کام کر رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ انسانی حس دراصل ادراک حقیقت کے لئے صحیح معیار بھی نہیں

ہے۔ اس لئے کہ حس اور ادراک حقیقت میں کبھی دھوکہ دیتی ہے اور کبھی دھوکہ کھا جاتی ہے۔ مثلاً حس نے یہاں ایک طویل زمانے کے ادراک میں دھوکہ کھایا اور اسے ایک دن یا اس سے بھی مختصر زمانہ سمجھا۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسانی حس ایک مختصر زمانے کو ایک طویل عرصہ تصور کرتی ہے۔

قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ... اللہ نے فرمایا: بلکہ تو نے اس حالت میں سو سال گزار دیئے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس طرح وقوع پذیر ہوا؟

یہ اسی طرح ہوا جس طرح تمام معجزات وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح کرہ ارض پر پہلی زندگی کو وجود میں لانے کا معجزہ رونما ہوا۔ ہم یقینی طور پر نہیں جانتے کہ آغاز حیات کیونکر ہوا؟

ڈارون علمائے حیاتیات میں ایک اونچے درجے کا سائنسدان تھا۔ وہ اپنے نظریات کو لے کر درجہ بدرجہ نیچے آتا رہا۔ زندگی کی گہرائیوں میں دور تک سرگرداں رہا اور آخر کار وہ اسے یہاں تک پہنچا سکا کہ اس کا آغاز ایک زندہ خلیے سے ہوتا ہے۔ یہاں آکر وہ رک جاتا ہے کیوں کہ اس سے آگے کا راستہ بند ہے۔ اس زندہ خلیے میں زندگی کہاں سے داخل ہوئی؟ اس راز کو آج تک کوئی سائنسدان نہیں پا سکا۔

ابراہیمؑ کا اطمینان قلب کیلئے سوال:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۔ (البقرہ۔260)

اور (وہ واقعہ بھی یاد کریں) جب ابراہیمؑ نے عرض کیا: میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تُو مُردوں کو کس طرح زندہ فرماتا ہے؟ ارشاد ہوا: کیا تم یقین نہیں رکھتے؟ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں (یقین رکھتا ہوں) لیکن (چاہتا ہوں کہ میرے دل کو بھی خوب سکون نصیب ہو جائے، ارشاد فرمایا: سو تم چار پرندے پکڑ لو پھر انہیں اپنی طرف مانوس کر لو پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر ان کو پکار، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے، اور جان لو کہ یقیناً اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔ (البقرہ۔260)

اس رکوع میں جو تین واقعات بیان کئے گئے یہ ان میں سے تیسرا واقعہ ہے جس کا موضوع اور مقصد بھی حیات بعد الموت ہے۔ اس سے پہلی آیت میں حضرت عزیر (علیہ السلام) کو حیات بعد الموت کے مشاہدہ کرانے اور

ان کے تعجب کو زائل کرنے کا ذکر تھا' اور اس آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو حیات بعد الموت کے مشاہدہ کرانے کا ذکر ہے۔

عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں بر آمد ہوتی ہے، پھر کہیں ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعیدہ میں پھیل جاتا ہے ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا اپنے ہی وجود میں غور کرلے تو اسے نظر آئے گا کہ ایک انسان کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء وذرات کا مجموعہ ہے۔ انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے اور جن غذاؤں سے ان کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود دنیا کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں۔ پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انہوں نے کھائے ہیں یہ گھاس دانے معلوم نہیں کس کس خطہ زمین میں سے آئے ہیں اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان میں شامل کر دیا ہے اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور سبزیاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرما دیئے اگر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بیشمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، جو قدرت کے نظام نے اس کے بدن میں جمع فرما دیئے ہیں اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرما دینا اس کی قدرت کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرما دیا تھا۔ (وما ذالک علی اللہ بعزیز)

پرندوں کا واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا مشاہدہ خاص تھا جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ ان مشاہدات میں سے ہے جو ذاتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کرائے گئے کہ ان کو اطمینانِ قلب اور شرح صدر کی دولت حاصل ہو۔ اس قسم کے مشاہدات حضرات انبیاء علیہم السلام کو اس لیے کرائے جاتے ہیں کہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس بار عظیم کے اٹھانے کے لیے پوری اہل ہو جائیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ تمام انبیاء کرام علیہ السلام کا معاملہ ہے کہ انہیں عین الیقین اور حق الیقین کے درجے کا ایمان عطا کیا

جاتا ہے۔ ان کے ایمان ویقین کے لیے ان کو ایسے مشاہدات کروادیے جاتے ہیں کہ ایمان ان کے لیے صرف ایمان بالغیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایمان بالشھادۃ بھی ہو جاتا ہے۔ سورۃ الانعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے نظام حکومت کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو معراج کے موقع پر آسمانوں پر لے جایا گیا تاکہ وہ ہر شے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان مشاہدات سے انبیاء کو ان ایمانی حقائق پر یقین کامل ہو جاتا ہے جن کی وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی درخواست شرح صدر کے لیے تھی۔ ان کا یہ جواب دینا کہ ہاں ایمان تو ہے لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ یہ آیت تمام آیتوں سے زیادہ امید دلانے والی معلوم ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایماندار کے دل میں اگر کوئی خطرہ یا وسوسہ شیطانی پیدا ہو تو اس پر پکڑ نہیں ہاں جب تک اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ (حدیث: إن الله تجاوز عن أمتي ما حدثت به أنفسها ما لم تعمل أو تتكلم)۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ملاقات ہوتی ہے تو پوچھتے ہیں کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید پیدا کرنے والی آیت کون سی ہے؟ عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں آیت: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ (الزمر:53) جس میں ارشاد ہے کہ اے میرے گنہگار بندو میری رحمت سے ناامید نہ ہونا میں سب گناہوں کو بخش سکتا ہوں، ابن عباس نے فرمایا: میرے نزدیک تو اس امت کیلئے سب سے زیادہ پر امید آیت حضرت ابراہیم کا یہ قول، پھر رب دو عالم کا سوال اور آپ کا جواب ہے (یعنی البقرہ کی آیت 260)۔

آیت کے آخر میں اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرادیں مگر پھر ایمان بالغیب کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

چوتھا رکوع: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔۔۔ (البقرہ۔261)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

رکوع کا موضوع انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت و آداب، انفاق جی سبیل اللہ کا اجر: سو گنا یا اس سے بھی زیادہ، (کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ)، قبولیت صدقات کی شرائط، انفاق میں ریاکاری، سائل کے ساتھ نرمی، اپنی خیرات کو ضائع مت کرو(لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى)، سدابہار نیک اعمال۔

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر 261 سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے لے کر تقریباً اس سورت کے اختتام تک اب بیان کا رخ ان معاشی اصولوں کی طرف ہے جو اسلام کے اقتصادی نظام کا حصہ ہیں۔ یہ اجتماعی نظام دراصل باہم تعاون اور تکافل پر مبنی ہے اور جس کی تشکیل عشر وز کوٰۃ اور خیرات و صدقات پر مبنی ہے۔ اور یہ معاشی نظام اس سودی نظام سے بالکل مختلف ہے جو دور جاہلیت میں رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صدقہ کی فضیلت اور آداب کا بیان کیا جاتا ہے اور ربا کی مذمت کی جاتی ہے۔ قرضہ حسنہ اور تجارت یا بزنس کے اساسی اصول بیان کئے گئے ہیں اور مجموعی طور پر یہ سب چیزیں اسلام کے اقتصادی نظام کا حصہ ہیں اور اسلام کی اجتماعی زندگی ان پر قائم ہے۔

سورہ بقرۃ کے اگلے چار رکوع یعنی آیت نمبر 261 سے 283 تک کل 23 آیات ہیں جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح عمل پیرا ہو جائے تو بہت سارے معاشی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے جس کے دو حصے ہیں۔

1۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنا جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

2۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات ہیں۔

ان چار رکوع میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلقہ احکام و ہدایات بیان کئے گئے۔ اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے۔ پھر ایسی چیزوں کا بیان ہے جو انسان کے صدقہ و خیرات کو فاسد اور برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔ اس سے اگلے دو رکوع سودی کاروبار کی حرمت و ممانعت اور قرض کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کے موضوع پر ان ساری آیات پر نظر ڈالی جائے تو صدقہ و خیرات کا اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط کا ذکر ملتا ہے:

1۔اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

2۔دوسرے سنت طریقے کے مطابق خرچ کرنا۔

3۔تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا۔

4۔چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا۔

5۔پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے ان لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے۔

6۔چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

اس رکوع میں صدقہ و خیرات کو ضائع کرنے والے اعمال کا بھی ذکر ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا اجر: سو گنا یا اس سے بھی زیادہ

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (البقرہ۔261)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے (اس سے بھی) اضافہ فرمادیتا ہے۔ کہ وہ صاحب وسعت بھی ہے اور علیم و دانا بھی۔ البقرہ۔261

یہ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت ہے۔ اس سے مراد تمام مصارف خیر ہیں گویا نفقات و صدقات کا اجر و ثواب دیگر امور خیر سے زیادہ ہے۔

جس قدر اخلاص عمل میں ہو اسی قدر ثواب میں زیادتی ہوتی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر صبح دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور ایک دعا کرتا ہے کہ اے اللہ سخی کو اسکا بدلہ عنایت فرما اور دوسرا یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ بخیل کے مال کو ہلاک فرما۔ بخاری و مسلم

قبولیت صدقات کی شرائط

دانہ گندم کی مثال کیوں دی گئی؟

قرآن حکیم نے انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت واہمیت کو لفظوں میں بیان کرنے کے بیج یا دانہ کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا۔

قرآن کریم کے انداز گفتگو کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ انسان اور اس زمین کے قدرتی سرسبز ماحول کے درمیان فاصلے کم کر دیتا ہے اور انسان کو فطرت کے قریب لے آتا ہے۔ جیسے اس مثال میں پودے یا کھیتی کی مثال دی گئی۔ اس سے اگلی آیات میں بھی بارش، پانی کی نہریں، پھلوں کے باغات کی مثالیں دی گئیں۔

دانہ یا بیج کی مثال میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب وہ تین شرائط پوری کرے:

1۔ کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو۔

2۔ دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری سے پورا واقف ہو۔

3۔ اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو۔

کیونکہ اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا، ایک دانہ بھی نہ نکلے گا یا پھر ایسا بارآور نہ ہو گا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ:

1۔ پہلی شرط کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

2۔ دوسرے خرچ کرنے والے کی نیت درست ہو اور صالح ہو۔ بدنیتی یا نام ونمود کے لئے خرچ کرنے والا، اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

3۔ تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ وخیرات کا مستحق ہو۔ کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے۔

اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی کہ مال حلال سے خرچ کرے اور خرچ کرنے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو اور مستحقین کو تلاش کر کے ان پر خرچ کرے محض جیب سے نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

انفاق میں ریاکاری

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًیۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ۔262)

جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذاء دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو کچھ خوف ہے نہ وہ اداس ہونگے۔ (البقرہ۔262)

قبولیت صدقہ کی مزید شرائط

اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو مزید شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل وخوار نہ سمجھیں اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت وذلت محسوس کرے یا اس کو ایذاء یا تکلیف پہنچے۔

انفاق میں اخلاص ضروری ہے ورنہ ریاکاری اور احسان جتلانے سے عمل بے کار ہو جائے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی مذکورہ فضیلت صرف اس شخص کو حاصل ہو گی جو مال خرچ کر کے احسان نہیں جتلاتا ، نہ زبان سے ایسا کلمہ کہتا ہے جس سے کسی غریب، محتاج کی عزت نفس مجروح ہو کیونکہ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں فرمائے گا، ان میں سے ایک المنّان یعنی احسان جتلانے والا ہے۔(مسلم)

سائل کے ساتھ نرمی اور مروّت سے پیش آنا

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًیؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ۔ (البقرہ۔263)

نرم بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذاء رسانی ہو۔(البقرہ۔263)

سائل سے نرمی اور شفقت سے بولنا یا دعائیہ کلمات سے اس کو جواب دینا قول معروف ہے اور مغفرت کا مطلب سائل کے فقر اور اس کی حاجت کا لوگوں کے سامنے عدم اظہار اور اس کی پردہ پوشی ہے اور اگر سائل کے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل جائے تو یہ چشم پوشی بھی اس میں شامل ہے یعنی سائل سے نرم اور شفقت اور چشم پوشی، پردہ پوشی، اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد اس کو لوگوں میں ذلیل اور رسوا کر کے اسے تکلیف پہنچائی جائے۔ اس لئے حدیث

میں کہا گیا ہے۔ الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ۔ پاکیزہ کلمہ بھی صدقہ ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تم کسی بھی معروف (نیکی) کو حقیر مت سمجھو، اگرچہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی ہو۔ لا تحقرن من المعروف شیئا ولو ان تلقی اخاک بوجہ طلق۔ (مسلم کتاب البر)

سائل اگر پیشہ ور بھکاری ہے اور خیرات کا حقدار اور مستحق نہیں بھی ہے پھر بھی اس کے ساتھ بد تمیزی اور بد اخلاقی کی ہمارا دین اجازت نہیں دیتا۔ حکمت کے ساتھ اسے ٹالا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی اور اصلاح میں حکمت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

اپنی خیرات کو ضائع مت کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (البقرہ۔264)

اے ایمان والو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذاء پہنچا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے نہ قیامت پر، اس کی مثال اس صاف پتھر کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو پھر اس پر زور دار مینہ برسے اور وہ اس کو بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے، ان ریاکاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی اور اللہ تعالیٰ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (البقرہ۔264)

اس میں ایک تو یہ کہا گیا ہے صدقہ اور خیرات کر کے احسان جتلانا اور تکلیف دہ باتیں کرنا اہل ایمان کا شیوا نہیں بلکہ ان لوگوں کا وطیرہ ہے جن میں نفاق ہے اور جو ریاکاری کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

دوسرے ایسے خرچ کی مثال صاف پتھر چٹان کی طرح ہے جس پر مٹی ہو کوئی شخص پیداوار حاصل کرنے کے لئے اس میں بیج بو دے لیکن بارش کا ایک جھٹکا پڑتے ہی وہ ساری مٹی اس سے اتر جائے اور وہ پتھر مٹی سے بالکل صاف ہو جائے۔

اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اس جذبے اور نیت کی خرابی ہے، جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے، جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ بارش کا فطری نتیجہ تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور

کھیتی نشونما پائے۔ لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپر ہی اوپر ہو، اور اس اوپری تہہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو، تو بارش مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہو گی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشونما دینے کی قوت رکھتی ہے، مگر اس کے نافع ہونے کے لیے نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابر کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاع مال ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جس طرح بارش اس پتھر کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوئی اسی طرح ریاکار کو اس کے صدقے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

سدابہار نیک اعمال

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔

(البقرہ۔265)

ان لوگوں کی مثال ہے جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں دل کی خوشی اور یقین کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اس باغ جیسی ہے جو اونچی زمین پر ہو اور زوردار بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دوگنا لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی برسی تو ہلکی پھوار یا شبنم ہی کافی ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (البقرہ۔265)

اس آیت میں اخلاص نیت اور باقی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب ثواب ہے۔ یہ ان اہل ایمان کی مثال ہے جو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کا خرچ کیا ہوا مال اس باغ کی مانند ہے جو پر فضا اور بلند چوٹی پر ہو کہ اگر زوردار بارش ہو تو اپنا پھل دوگنا دے ورنہ ہلکی سی پھوار اور شبنم بھی اسکو کافی ہو جاتی ہے اس طرح ان کے صدقہ و خیرات چاہے کم ہو یا زیادہ عند اللہ کئی کئی گنا اجر و ثواب کے باعث ہونگے۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے خرچ کیا جائے کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

جَنْۃٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں اتنی کثرت سے درخت ہوں جو زمین کو ڈھانک لیں۔ یہ جن سے ماخوذ ہے جن اس مخلوق کا نام ہے جو نظر نہیں آتی۔ پیٹ کے بچے کو جنین کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نظر نہیں آتا۔ دیوانگی کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس میں بھی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور جنت کو اس لئے جنت کہتے ہیں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہے۔

ریاکاری، ناشکری اور بڑھاپا

البقرہ آیت:266

اس آیت میں ریاکاری کے نقصانات کو واضح کرنے اور اس سے بچنے کے لیے ایک باغ والے شخص کی مثال دی جارہی ہے۔ جس طرح ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر طرح کے پھل ہوں (یعنی بھرپور آمدنی کی امید ہو) وہ شخص بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں ضعیفی کی وجہ سے محنت اور مشقت سے عاجز ہو چکا ہو اور اولاد بھی اسکے بڑھاپے کا بوجھ اٹھانے کی بجائے خود اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہ ہو اس حالت میں تیز اور تند ہوائیں چلیں اور سارا باغ جل جائے اب نہ وہ خود دوبارہ اس باغ کو آباد کرنے کے قابل رہا اور نہ اس کی اولاد۔

اس بوڑھے شخص کی حالت کتنی حسرت ناک ہو گی، جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ ہی تھا اور وہ باغ عین عالم پیری میں اس وقت جل گیا، جبکہ نہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے اور نہ اس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

یہی حال ان ریاکار خرچ کرنے والوں کا قیامت کے دن ہو گا کہ ریاکاری کی وجہ سے ان کے سارے اعمال اکارت چلے جائیں گے۔ جب کہ وہاں نیکیوں کی شدید ضرورت ہو گی اور دوبارہ اعمال خیر کرنے کی مہلت و فرصت نہیں ہو گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھی یہی حال ہو؟

حضرت عبد بن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت البقرہ:266 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق وہ مالدار شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے کام کرتا ہے پھر شیطان اسے بہکاتا ہے اور وہ گناہوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے نیک اعمال کو کھو دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)۔

پس یہ روایت اس آیت کی پوری تفسیر ہے اس میں بیان ہو رہا ہے کہ ایک شخص نے ابتداء اچھے عمل کئے پھر اس کے بعد اس کی حالت بدل گئی اور برائیوں میں پھنس گیا اور پہلے کی نیکیوں کا ذخیرہ برباد کر دیا، اور آخری وقت جبکہ نیکیوں کی بہت زیادہ ضرورت تھی یہ خالی ہاتھ رہ گیا۔

دعا: رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا یہ بھی تھی: **اللهم اجعل اوسع رزقک علی عند کبر سنی و انقضاء عمری۔** اے اللہ اپنی روزی کو سب سے زیادہ مجھے اس وقت عنایت فرما جب میری عمر بڑی ہو جائے اور ختم ہونے کو آئے (تاکہ میں پیرانہ سالی میں کسی پر بوجھ اور دوسروں کا محتاج نہ بنوں)۔ (مستدرک حاکم)

پانچواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ۔۔۔ (البقرہ۔267)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع کا موضوع بھی انفاق فی سبیل اللہ اور اس کے آداب ہیں۔ اچھی اور پاکیزہ چیزیں خرچ کرو، شیطان کا ڈراوا: تنگدستی اور فقر، حکمت ودانائی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، نذر یا منت کا ذکر، اعلانیہ و پوشیدہ صدقات و خیرات، صدقہ و خیرات کے ثمرات، سفید پوش فقراء کا بھی خیال رکھو۔

پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا اب اسی سے متعلق مزید ہدایات اس رکوع کی سات آیات میں دی گئی ہیں۔ زکوٰۃ کے علاوہ زرعی پیداوار پر عشر لاگو ہوتا ہے جسے زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے۔

اچھی اور معیاری چیزیں خیرات میں دو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ (البقرہ۔267)

اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے اچھی اور صاف ستھری چیزیں خرچ کرو اور اس چیز میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے، تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم چشم پوشی کر جاؤ۔ تمہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے۔ (البقرہ۔267)

صدقے کی قبولیت کے لئے جس طرح ضروری ہے کہ ریاکاری سے پاک ہو جیسا کہ گذشتہ رکوع میں بتایا گیا ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حلال اور پاکیزہ آمدن سے ہو چاہے محنت مزدوری کی کمائی سے ہو، چاہے وہ کاروبار یا بزنس کے ذریعے سے ہو یا فصل اور باغات کی پیداوار سے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنی پاک کمائی سے ایک کھجور بھی خیرات کرے اسے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی داہنے ہاتھ لیتا ہے پھر اس مال کو بڑھاتا ہے اور اس کا ثواب پہاڑ کے برابر بنا دیتا ہے اور پاک چیز کے سوا وہ ناپاک چیز کو قبول نہیں فرماتا۔ (بخاری)

پھر فرمایا: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ۔۔۔ کہ ناکارہ چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ اس سے ایک تو وہ چیزیں مراد ہیں جو غلط کمائی سے ہوں اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا۔ حدیث میں ہے: ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا۔۔۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے پاک و حلال چیز ہی قبول فرماتا ہے۔

دوسرے خبیث کے معنی بے کار چیز کے ہیں۔ ردی اور بے کار چیزیں بھی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کی جائیں جیسا کہ آیت: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران:92) کا بھی یہی مفہوم ہے۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول کی روایت میں بتلایا گیا ہے کہ مدینہ کے بعض لوگ خراب اور ردی کھجوریں بطور صدقہ مسجد میں دے جاتے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (فتح القدیر۔ بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ)

شیطان کا ڈراوا: تنگدستی اور فقر

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔268)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ (البقرہ۔268)

شیطانی رویّہ

یعنی بھلے کام میں مال خرچ کرنا ہو تو شیطان ڈراتا ہے کہ مفلس اور قلاش ہو جاؤ گے لیکن برے کام پر خرچ کرنا ہو تو ایسے اندیشوں کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا بلکہ ان برے کاموں کو اس طرح سجا اور سنوار کر پیش کرتا ہے جس پر انسان بڑی سے بڑی رقم بلا تردد خرچ کر ڈالتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کار خیر کے لئے تو صاحب مال بار بار اپنے حساب کی جانچ پڑتال کرتا ہے مانگنے والے کو بسا اوقات کئی کئی بار دوڑاتا اور پلٹاتا ہے لیکن یہی شخص جب عیاشی، شراب نوشی، بدکاری اور جواء بازی وغیرہ کے جال میں پھنستا ہے تو اپنا مال بے تحاشہ خرچ کرتا ہے اور اسے کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور تردد کا ظہور نہیں ہوتا۔ اس طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بندہ اپنے رب سے دور اور شیطان کے قریب ہے۔ حالانکہ اللہ کا وعدہ مغفرت اور فضل و کرم ہے۔ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے اور اللہ بہت وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔

حکمت ودانائی: اللہ کی بہت بڑی نعمت

يُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (البقرہ۔269)

اللہ جس کو چاہتا ہے سمجھ دے دیتا ہے اور جسے سمجھ دی گئی تو اسے بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔(البقرہ۔269)

حکمۃ سے کیا مراد ہے؟

حکمۃ سے بعض کے نزدیک عقل وفہم، علم اور بعض کے نزدیک اصابت رائے، قوت فیصلہ اور بعض کے نزدیک صرف سنت یا کتاب وسنّت کا علم وفہم ہے۔ بعض کے نزدیک حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوت فیصلہ ہے۔ اس سے
Common Sense بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہ سارے ہی مفہوم اس کے مصداق میں شامل ہو سکتے ہیں۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: دو شخصوں پر رشک کرنا جائز ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ اسے راہ حق میں خرچ کرتا ہے دوسرا وہ جسے اللہ نے حکمت دی جس سے وہ فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، مسلم)

حدیث: رأس الحكمه مخافة الله یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔

نذر یا منت کے احکامات

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (البقرہ۔270)

اور جو تم خیرات کے طور پر خرچ کرو گے یا تم کوئی منت مانو گے تو بے شک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔(البقرہ۔270)

منت یا نذر سے کیا مراد ہے؟

نَذَر کا ایک مطلب یہ ہے کہ میرا فلاں کام ہو گیا، کامیابی مل گئی یا فلاں مشکل سے نجات مل گئی تو میں اللہ کی راہ میں اتنا صدقہ کرونگا۔ نذر اگر جائز کام یا نیک کام کی ہو تو اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی نافرمانی یا ناجائز کام کی نذر مانی ہے تو اس کو پورا نہیں کرنا چاہئے بلکہ قسم کا کفارہ دے کر اس نذر سے نجات حاصل کر لینی چاہئے۔

نذر پوری کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جو کچھ آدمی پر شرعی طور پر لازم یا واجب کیا گیا ہو اسے وہ پورا کرے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہو، یا بالفاظ دیگر جس کام کے کرنے کا اس نے عہد کیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔

نذر کا عام مفہوم یہی ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے پورا ہونے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی عبادت کو اپنے اوپر لازم کر لے، جو اس کے ذمے فرض یا واجب نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔

نذر کی اقسام

فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

1۔ ایک یہ کہ ایک آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔

2۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔

پہلی دونوں قسم کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر تبرر یعنی نیکی کی نذر کہتے ہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب یا ضروری ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ: یوفون بالنذر۔۔ یعنی وہ اپنی نذروں کو پورا کرتے ہیں۔(76:7)

3۔ تیسرے یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی فرض یا واجب کام نہ کرنے کا عہد کرلے۔

4۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مباح کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کر لے، یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔

آخری دونوں قسموں کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر لجاج جہالت اور جھگڑالو پن اور ضد کی نذر کہتے ہیں۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ اور چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ فقہاء شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ نذر بھی سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی۔ فقہاء احناف کے نزدیک ان دونوں قسموں کی نذروں پر کفارہ لازم آتا ہے۔ (عمدۃ القاری)

فضول اور ناجائز کام کی نذر نہیں ماننی چاہئے

جس کام میں بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور آدمی نے خواہ مخواہ کسی فضول کام، ناقابل برداشت مشقت یا محض تعذیب نفس کو نیکی سمجھ کر اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اس کی نذر پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اس معاملہ میں نبی اکرمؐ کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔

حدیث: حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا ہے۔ آپؐ نے پوچھا یہ کون ہے اور کیوں کھڑا ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ ابو اسرائیل ہیں، انہوں نے نذر مانی ہے کہ نفلی روزہ اس طرح رکھیں گے کہ اس روزے کے دوران وہ کھڑے رہیں گے بیٹھیں گے نہیں، سارا دن دھوپ میں رہیں گے، نہ اپنے اوپر سایہ کریں گے، نہ کسی سے بات کریں گے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: مروه فليكلم وليستظل وليقعد، وليتم صومه۔ ان سے کہو بات چیت شروع کر دیں، سایہ میں آئیں، بیٹھ جائیں، البتہ اپنا روزہ پورا کریں۔ (بخاری، ابوداؤد، ابن ماجہ)

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے ایسی نذر ماننے سے منع فرمایا ہے جو یہ سمجھتے ہوئے مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی، یا جس میں کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے لیے بطور شکر کرنے کے بجائے آدمی اللہ تعالیٰ کو بطور معاوضہ یہ پیشکش کرے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں آپ کے لیے فلاں نیک کام کر دوں گا۔

حدیث: نذر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انه لا يأتى بخير، وانما يستخرج به من البخيل۔

یہ (نذر) کوئی بھلائی نہیں لاتی تاہم اس سے بخیل کا کچھ مال (خیرات میں) نکل جاتا ہے۔ (بخاری)

ہمارے ہاں ایک یہ بھی رجحان پایا جاتا ہے کہ لوگ جب بیمار ہوتے ہیں، یا کسی مصیبت میں ہوتے ہیں تو نذر مانتے ہیں تو اس وقت ان کا خیال ہوتا ہے کہ نذر ماننے سے یہ کام ہو جائے گا، حالانکہ کسی کے صحتیاب ہونے یا پریشانی ٹلنے میں نذر کو کوئی دخل نہیں۔ ہر پریشانی، ہر بیماری اللہ کی طرف سے ہی ہوتی اور وہی اسے لے جانے والا ہے۔ بہتر یہ

ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے اللہ تعالیٰ سے وہ ہمارے تمام مسائل دعا سے حل کر سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً صدقہ دیناچاہیئے کہ الصدقۃ رد البلاء۔ صدقہ وخیرات مصیبتوں اور آفات کو ٹالتا ہے۔

میت یا مرحوم کی نذر

میت کے ذمہ اگر کوئی نذر رہ گئی ہو تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب ہے یا نہیں؟

فقہاء احناف کہتے ہیں کہ نذر اگر بدنی عبادت (نماز یا روزہ) کی ہو تو وارثوں پر اس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، اور اگر مالی عبادت کی ہو اور مرنے والے نے اپنے وارثوں کو اسے پورا کرنے کی وصیت نہ کی ہو تو اسے پورا کرنا واجب نہیں، البتہ اگر اس نے وصیت کی ہو تو اس کے ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک نذر پوری کرنی واجب ہو گی۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے رسول اللہ ﷺ سے فتویٰ پوچھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ ایک نذر تھی جو انہوں نے پوری نہیں کی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا تم اس کی طرف سے پوری کر دو۔ (ابو داؤد، مسلم)

نذر بھی نماز روزہ کی طرح عبادت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام کی نذر ماننا درست نہیں۔

اعلانیہ اور پوشیدہ صدقات وخیرات

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ (البقرہ۔271)

اگر اپنے صدقات علانیہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے تمہاری بہت سی برائیاں اِس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہوئے اللہ کو بہر حال اُس کی خبر ہے۔ (البقرہ۔271)

خیرات وصدقات اعلانیہ دو یا پوشیدہ دونوں طریقے سے جائز ہے۔ (بشرطیکہ نیت درست ہو)

اس سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں خفیہ طور پر صدقہ کرنا افضل ہے سوائے کسی ایسی صورت کے کہ اعلانیہ صدقہ دینے میں لوگوں کے لئے ترغیب کا پہلو ہو اور اس میں ریاکاری کا جذبہ شامل نہ ہو۔ تاہم اس قسم کی مخصوص صورتوں کے علاوہ دیگر مواقع پر خاموشی سے صدقہ وخیرات کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے بارے میں اتری۔ حضرت عمر اپنا آدھا مال حضور ﷺ کے پاس لائے اور حضرت صدیق اکبر جو کچھ تھا لا کر رکھ دیا۔ آپؐ نے پوچھا اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو؟ فاروق نے جواب دیا اتنا ہی۔ ابو بکر صدیق کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے اور چپکے سے سارا مال حضور اکرم ﷺ کے حوالے کر چکے تھے، لیکن جب ان سے پوچھا گیا تو کہنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کافی ہے۔ حضرت عمر فاروق یہ سن کر رو دیئے اور فرمانے لگے: اللہ کی قسم! جس کسی نیکی کے کام کی طرف ہم لپکے ہیں اس میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آگے ہی پاتے ہیں۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ سات افراد کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہو گا:

1۔ عادل بادشاہ

2۔ وہ نوجوان جو اپنی جوانی اللہ کی عبادت اور شریعت کی فرمانبرداری میں گزارے۔

3۔ وہ دو شخص جو اللہ تعالیٰ کیلئے آپس میں محبت رکھیں، اسی پر جمع ہوں اور اسی پر جدا ہوں۔

4۔ وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہے نکلنے کے وقت سے دوبارہ جانے کے وقت تک۔

5۔ وہ شخص جو خلوت میں اللہ کا ذکر کر کے رو دے۔

6۔ وہ شخص جسے کوئی منصب و جمال والی عورت بدکاری کی طرف بلائے اور وہ کہہ دے کہ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

7۔ وہ شخص جو اپنا صدقہ اس قدر چھپا کر دے کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے خرچ کی خبر تک نہ ہو۔ (بخاری، مسلم)

صدقہ و خیرات کے ثمرات

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭوَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

(البقرہ۔272)

لوگوں کوہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں بلکہ ہدایت اللہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے فائدہ مند ہے آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کروگے، اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہر گز نہ ہوگی۔ (البقرہ۔272)

مالی انفاق سب کیلئے کرو

شان نزول: تفسیری روایات میں اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتے داروں اور عام غیر مسلم حاجت مندوں کی مدد کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ پہلے مسلمان ہو جائیں پھر ان کی مالی مدد کریں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں اس غلط فہمی کو دور کیا گیا۔ ارشاد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے۔ اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ ہدایت دینا یا کسی کو صراط مستقیم پر چلانا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ رہا دنیوی مال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انہوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کروگے، اس کا اجر اللہ تمہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کروگے اس کا پورا اجر ملے گا جس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کسی کے ساتھ بھی بھلائی کی جائے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اس بھلائی کا اجر و ثواب اللہ پورا پورا عطا فرمائے گا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہو کہ غیر مسلم رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا باعث اجر ہے۔

جب یہ آیت اتری تو آپ ﷺ نے فرمایا ہر سائل کو دو، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ (ابن ابی حاتم بحوالہ ابن کثیر)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدقہ و خیرات کسی غیر مسلم کو بھی دیا جاسکتا ہے۔

سفید پوش فقراء کا خصوصی خیال رکھو

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔273)

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔ (البقرہ-273)

شانِ نزول: بعض مفسرین کے مطابق یہ آیت اصحاب صفّہ کے بارے میں نازل ہوئی جو مسجد نبویؐ میں ہی رہتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور حسب ضرورت رضاکارانہ خدمات بھی سر انجام دیتے تھے۔ ہمہ وقت حضور کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر خدمت کے لیے حاضر تھے۔ حضورؐ جس مہم پر چاہتے انہیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا، اس وقت یہ دوسرے بندگانِ خدا کو علم دین کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ یہ لوگ ہمہ وقت دین کی اشاعت اور خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ دین کے فل ٹائم ورکر یا کارکن تھے۔ یہ لوگ اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے، بالکل خالی ہاتھ تھے کیونکہ ہجرت کے نتیجے میں اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ ان کے پاس اپنا گھر تک بھی نہیں تھا۔ خودداری کے نتیجے میں کسی سے اپنی ضرورت کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے اور نہ کسی سے کوئی چیز مانگتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے لوگ تمہاری زکوٰۃ و صدقات کے بہترین مستحق ہیں۔

صحابہ کرام کا استغناء

صحابہ کرام دوسروں سے مالی مدد لینے میں اور مالی سوال کرنے میں کتنی احتیاط کرتے۔ حافظ طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ، محمد بن سیرین سے روایت کی ہے کہ حارث (ایک شخص جو قریشی تھے اور شام میں رہتے تھے) ان کو خبر ملی کہ حضرت ابوذرؓ کے مالی حالات ٹھیک نہیں تو اس نے انہیں تین سو دینار بھجوائے۔ ابوذر نے جواب دیا: کیا عبد اللہ کو مجھ سے زیادہ تنگ دست اور کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو اس نے الحاف کیا (یعنی مانگنے میں حد سے تجاوز کیا)۔ ابوذر کے خاندان کے پاس چالیس درہم موجود ہیں ایک بکری اور دو خادم بھی ہیں۔

چھٹا رکوع: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً--- (البقرہ-274)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں اللہ کے راستے میں باقاعدگی اور اعتدال سے خرچ کرنے کا ذکر ہے۔اس کے بعد سود کی حرمت ،بزنس اور سود میں اصولی فرق،ایمان اور نیک اعمال کا اجر،قرض حسنہ کی فضیلت۔آخر میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس دلایا گیا۔

اللہ کے راستے میں باقاعدگی سے خرچ کرو

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَـهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّـهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَـهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ۔274)

جولوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں شب وروز،پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں توان کے لیے اپنے رب کے ہاں ثواب ہے، ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔البقرہ۔274

انفاق میں بھی اعتدال

اسلام نے اپنے تمام اصول وضع کرتے وقت میانہ روی اور اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔انفاق فی سبیل اللہ میں بھی حد سے تجاوز کو منع کیا گیا ہے۔مالی انفاق کو ایک حد سے زیادہ منع کر دیا گیا بالخصوص اس وقت جب انسان کی اپنی حاجات اور ضروریات بھی ہوں۔مالی ہدایات کے حوالے سے اسراف سے بھی منع کیا گیا ہے۔اس طرح انسان کی ضروریات زندگی کی مد میں اخراجات کو بھی دائرہ اعتدال میں محدود کیا گیا ہے۔جائز ضروریات کے بعد جو بچ جاتا ہے اسی پر زکوۃ اور صدقات نافلہ کی تاکید ہے۔ایک بندہ مومن کو یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو نفع بخش کاروبار میں لگائے اور اس میں انفاق کے ذریعے اضافہ کرتا رہے۔

سود کی حرمت

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔۔۔ (البقرہ:275)

اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام

سود کی تعریف:

كل قرض جر منفعة فهو ربا۔ قرض پر لیا گیا نفع سود ہے۔

یہ قرضہ ذاتی ضرورت کے لیے لیا گیا ہو چاہے کمرشل (بزنس یا کاروبار کے لئے) دونوں قسم کے قرضوں پر سود حرام ہے۔

البتہ نفع، نقصان کی بنیاد پر مالی اور تجارتی لین دین، بزنس، کاروبار کی مکمل اجازت ہے۔

سات ہلاکت میں ڈالنے والے گناہ

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: اجتنبو السبع الموبقات۔۔۔ سات تباہ کرنے والی چیزوں سے بچو:

1۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا

2۔ جادو کرنا

3۔ کسی انسانی جان کو ناحق قتل کرنا۔

4۔ سود کھانا۔

5۔ یتیم کا مال کھانا۔

6۔ جنگ کے دن بھاگ جانا

7۔ پاک دامن عورتوں پر الزام لگانا جو گناہ سے بے خبر ہوں۔ (البیہقی)

بزنس اور سود میں فرق

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا۔۔۔ (البقرہ۔275)

اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔۔۔ (البقرہ۔275)

تجارت اور سود کا اصولی فرق

سودی مال میں برکت نہیں ہوتی

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِی الصَّدَقَاتِ۔ يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِی الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۔ (البقرہ۔276)

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ البقرہ۔276

اس آیت میں ایک ایسی صداقت بیان کی گئی ہے جو اخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی سراسر درست ہے اور معاشی و تمدنی حیثیت سے بھی۔ اگرچہ بظاہر سود سے دولت بڑھتی نظر آتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اللہ کا قانون فطرت یہی ہے کہ سود اخلاقی و روحانی اور معاشی و تمدنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ زوال کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس صدقات سے (جن میں قرض حسن بھی شامل ہے) اخلاق و روحانیت اور تمدن و معیشت ہر چیز کو نشونما نصیب ہوتا ہے۔

اخلاقی و روحانی حیثیت سے دیکھیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سود دراصل خود غرضی، بخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس صدقات کے نتیجہ میں فیاضی، ہمدردی، فراخ دلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا، اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔

معاشرتی لحاظ سے دیکھا جائے تو جس سوسائیٹی میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مالدار طبقوں کا مفاد عوام الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائیٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی محبت کے بجائے باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نشونما پائے گی۔ اس کے اجزا ہمیشہ انتشار کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لیے مددگار ہو جائیں، تو ایسی سوسائیٹی کے اجزا کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائیٹی کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دوسرے کی حاجت کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں باوسیلہ لوگ بے وسیلہ لوگوں سے ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسی سوسائیٹی میں آپس کی محبت، خیر خواہی اور دلچسپی نشونما پائے گی۔ اس کے اجزا ایک دوسرے کے ساتھ پیوست اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلی قسم کی سوسائیٹی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہو گی۔

اس لحاظ سے اس آیت میں سود کے معنوی اور روحانی نقصانات اور خیرات کی برکتوں کا بیان ہے۔ سود میں بظاہر بڑھوتری نظر آتی ہے لیکن معنوی حساب سے یامال انجام کے اعتبار سے سودی رقم ہلاکت و بربادی ہی کا باعث بنتی ہے۔ سود کا کاروبار برکت سے محروم ہوتا ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا:

ان الربوٰا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل۔ یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قلت ہے۔

حقیقی سکون واطمینان ایمان اور اعمال صالحہ میں ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ۔277)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ دیتے رہے تو ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے اور ان پر کوئی خوف نہ ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ البقرہ۔277

یہ قرآن حکیم کا وہ خاص حکیمانہ انداز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے کہ جب بھی کوئی شرعی حکم دیا جاتا ہے جس پر عمل دشوار معلوم ہو تو ان آیات کے ساتھ توبہ، اللہ کی رحمدلانہ صفات رحمت ورحملی، اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب وثواب کا ذکر کر کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ انداز مربیانہ ہے جو اسے ایک حاکمانہ کتاب کے بجائے ایک حکیمانہ کتاب بناتا ہے۔

ہمدردی کے جذبے سے بلا سود قرضہ دینے کی فضیلت

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ۔280)

تمہارا قرض دار تنگ دست ہو، تو آسانی تک اُسے مہلت دو، اور صدقہ کرو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تمہیں علم ہو۔ (البقرہ۔280)

اللہ ربّ العالمین کا ارشاد ہے: وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ۔ تمہارا قرض دار تنگدست ہو، تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو۔ (البقرہ:280)

زمانہ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں سود در سود اصل رقم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا جس سے تھوڑی سی رقم ایک پہاڑ بن جاتی تھی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی تھی اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی

تنگ دست ہو تو (سود لینا تو در کنار اصل مال لینے میں بھی) آسانی تک اسے مہلت دے دو اور اگر قرض بالکل ہی معاف کر دو تو زیادہ بہتر ہے۔ کتنا فرق ہے ان دونوں نظریات میں ایک سراسر ظلم، سنگدلی اور خود غرضی پر مبنی سوچ اور دوسری طرف اسلام کی تعلیمات ہمدردی، تعاون اور ایک دوسرے کو سہارا دینے والی تعلیمات۔

قرآن کے مطابق مال و دولت دراصل اللہ کا فضل ہے۔ اور اللہ کے فضل کا صحیح شکریہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے، اسی طرح بندہ بھی اللہ کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اس کی بہترین صورت تو یہ ہے کہ وہ صدقہ و خیرات کرتا رہے یا کم از کم نادار لوگوں کو قرض حسنہ دے کر ان کی مدد کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس اللہ کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ دوسرے بندوں کی دولت پر ناجائز قبضہ کرے اور ان کا مال ہڑپ کر جائے تو حقیقت میں وہ صرف ناشکرا ہی نہیں بلکہ ظالم اور بد عمل بھی ہے۔

احادیث میں تنگدست مقروض کے ساتھ رعایت کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

حدیث: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بندہ اللہ کے سامنے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس سے سوال کرے گا کہ بتا میرے لئے تونے کیا نیکی ہے؟۔۔۔ وہ جواب دے گا کہ اور تو کوئی خاص نیکی نہیں البتہ تونے اپنے فضل سے کچھ مال مجھے دے رکھا تھا۔ میں تجارت پیشہ شخص تھا، لوگ ادھار لے جاتے تھے، میں اگر دیکھتا کہ یہ شخص غریب ہے اور وعدہ پر قرض نہ ادا کر سکتا تو میں اسے کچھ اور مہلت دے دیتا۔ اسی طرح عیال داروں پر سختی نہ کرتا، اگر کوئی مقروض زیادہ تنگ دست ہوتا تو اس کو معاف بھی کر دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو میرے بندوں پر آسانی کرتا تھا میں آج تجھ پر آسانی اور رحم کرتا ہوں اور تیری بخشش کرتا ہوں۔ (مسلم)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی نادار پر آسانی کر دے یا اسے معاف کر دے اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی گرمی سے بچا لے گا۔

(مسند احمد)

ایک صحابی فرماتے ہیں: سنو میری دونوں آنکھوں نے دیکھا اور میرے ان دونوں کانوں نے سنا اور میرے اس دل نے اسے خوب یاد رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ڈھیل دے یا معاف کر دے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ (بحوالہ ابن کثیر)

حدیث: رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے جو شخص نادار قرضدار کو ڈھیل دے یا اپنا قرضہ معاف کر دے وہ قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سائے تلے ہو گا۔(بروایت ابو قتادہ۔ صحیح مسلم)

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعاء قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مقروض کو مہلت دے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مفلس آدمی پر اپنا قرض وصول کرنے میں نرمی کرے اور اسے مہلت دے اس کو جتنے دن وہ قرض کی رقم ادا نہ کر سکے اتنے دنوں تک ہر دن اتنی رقم خیرات کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ (مسند احمد)

اللہ کے سامنے حاضری اور جوابدہی کا احساس

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (البقرہ۔281)

اور اس دن سے ڈرو جس دن اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔البقرہ۔281

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اس کے چند روز بعد آپ ﷺ دنیا سے رحلت فرما گئے۔(ابن کثیر)

ساتواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔۔۔ (البقرہ۔282)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں آیت مداینت ہے جو قران کی طویل ترین آیت ہے۔اس میں قرض اور مالی معاملات کے بارے میں اہم ہدایات ہیں۔ گواہی کی اہمیت، گواہی کو مت چھپاؤ۔

آیت مداینت: قرض سے متعلق آیت

قرآن کی طویل ترین آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔۔(البقرہ۔282)

اے ایمان والو جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقررہ پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔۔(البقرہ۔282)

اس آیت کی روشنی میں قرض یا مالی معاملات کے سلسلے میں ضروری ہدایات:

اس آیت میں قرض کے سلسلے میں چند واضح ہدایات دی گئیں:

1۔قرض کی مدت کا تعین کرلو کہ کب واپس کرنا ہے۔

2۔دوسرا یہ کہ اسے لکھ لو، دستاویزی شکل دے دو۔

3۔تیسرا یہ کہ اس پر گواہ بنالو۔

قرض ایک ناگزیر ضرورت ہے۔اگرچہ قرض لینے سے ہر ممکن بچنا چاہئے لیکن بعض دفعہ مجبوراً اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔اسی لئے احادیث میں قرض دینے کا بڑا ثواب بھی بیان کیا گیا ہے۔عموماً قرض اور دوسرے مالی لین دین جھگڑوں کا باعث بھی بن سکتے ہیں، اس لئے اس آیت میں جسے آیتہ الدین کہا جاتا ہے اور جو قرآن کی سب سے لمبی آیت ہے اللہ تعالیٰ نے قرض کے سلسلے میں ضروری ہدایات دی ہیں تاکہ یہ ناگزیر ضرورت لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنیں۔عموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی معاملات کو تحریر یا دستاویزی شکل میں لانا چاہیے اور اس پر گواہی ثبت کرالینی چاہیے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔کیونکہ قرض کا معاملہ بہت نازک بھی ہے۔

احادیث میں قرض واپس ادا نہ کرنے کی شدید الفاظ میں مذمت بیان کی گئی:

حدیث: جو شخص کسی سے اس نیت سے قرض لے کہ وہ اس کو ادا کردے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے قرض کی ادائیگی کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے اور اگر قرض لیتے وقت اس کا ارادہ ہڑپ کرنے کا ہے تو اللہ تعالیٰ اس طرح کے اسباب پیدا کرتا ہے، جس سے وہ مال ہی برباد ہو جاتا ہے۔(بخاری)

حدیث: مطل الغنی ظلم۔ قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود وقت پر ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

(بخاری)

حدیث: اللہ تعالیٰ شہید کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، مگر قرض معاف نہیں کرتا۔(مسلم)

فقہاء کرام کہتے ہیں کہ قرض اور مالی معاملات پر دو گواہ ہونے چاہئیں لیکن بعض حالات میں ایک گواہ کی گواہی بھی معتبر ہے۔ دلیل کے طور پر وہ مسند احمد کی حدیث (جو نیچے درج ہے) پیش کرتے ہیں جس میں آپؐ نے ایک گواہی کو قبول فرمایا۔

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی دو گواہیوں کے برابر

(تلخیص حدیث): حضور ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑے کا سودا کیا اور فرمایا کہ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں گھر جا کر اس کی ادائیگی کر دیتا ہوں۔ راستے میں لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ گھوڑا بک چکا ہے۔ انہوں نے اس کی قیمت لگانا شروع کر دی یہاں تک کہ جتنے داموں میں اس اعرابی نے آپؐ کے ہاتھ بیچا تھا اس سے زیادہ دام لگ گئے۔ اعرابی کی نیت بدل گئی اور اس نے آپؐ کو آواز دے کر کہا: یا تو گھوڑا اسی وقت نقد دے کر لے لیں یا میں کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے۔ اس نے کہا کہ آپؐ گواہ پیش کریں۔ اتنے میں حضرت خزیمہ آ گئے اور اعرابی کے اس قول کو سن کر فرمانے لگے میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے بیچ دیا ہے اور حضورؐ کے ہاتھ تو فروخت کر چکا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تو کیسے شہادت دے رہا ہے، حضرت خزیمہ نے فرمایا آپؐ کی صداقت اور سچائی کی بنیاد پر یہ شہادت دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج سے حضرت خزیمہ کی گواہی دو گواہوں کے برابر ہے۔(مسند احمد)

اس حدیث کی بنیاد پر بعض فقہاء مالی لین دین اور قرض پر دو گواہوں کو ضروری قرار نہیں دیتے اور ایک کو بھی کافی سمجھتے ہیں۔

گواہی کو مت چھپاؤ

۔۔۔وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔283)

۔۔۔اور گواہی کو مت چھپانا اور جو گواہی چھپائے گا تو اندر سے اسکا دل گنہگار ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔(البقرہ۔283)

اسلام میں گواہی دینے کی فضیلت ہے جبکہ حق، سچ بات اور گواہی کا چھپانا کبیرہ گناہ ہے۔ قرآن وحدیث میں گواہی کے چھپانے پر سخت وعید بیان کی گئی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں جھوٹی شہادت دینا یا گواہی کو چھپانا گناہ کبیرہ ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔الا اخبرکم بخیر الشهداء ؟ الذی یاتی بشهادته قبل ان یسئالها۔ وہ سب سے بہتر گواہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی از خود گواہی کے لئے پیش ہو جائے۔(صحیح مسلم کتاب الاقضیۃ، باب بیان خیر الشھود)

ایک دوسری روایت میں بدترین گواہ کی نشان دہی بھی فرمادی گئی ہے: الا اخبرکم بشر الشهداء ؟ الذین عشهون قبل ان یستشهدوا۔ کیا میں تمہیں وہ گواہ نہ بتلاؤں جو بدترین گواہ ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی گواہی دیتے ہیں (مطلب ہے جھوٹی گواہی دے کر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں)۔(صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ)۔

نیز آیت میں دل کا خاص ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ کتمان یعنی چھپانا دل کا فعل ہے۔

حدیث: الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله، واذا فسدت فسد الجسد کله، الا! وهی القلب۔ سنو! جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر یہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور اگر اس میں فساد آجائے تو سارا جسم فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے۔(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ الدینہ)۔

آٹھواں رکوع: لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِؕ۔۔۔ (البقرہ۔284)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

سورۃ البقرہ کے آخری رکوع میں انسان کے ضمیر سے خطاب کرتے ہوئے آخرت میں جوابدہی کا احساس دلایا گیا: وان تبدوما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ، ایمانیات کی تجدید، سمع واطاعت، کوئی شخص اپنی طاقت سے بڑھ کر اعمال کا مکلف نہیں (لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا)، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار (لھا ما کسبت وعلیھا ما کتسبت)، اس رکوع کے آکر میں ایک جامع دعا ہے۔ دعا کے اجزاء: اس دعا میں کیا مانگا گیا؟

انسان کے ضمیر سے خطاب: اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (البقرہ۔284)

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، اور اگر تم اپنے دل کی بات ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جس کو چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب کرے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (البقرہ۔284)

آیت کی تفسیر: احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پریشان ہوئے کہ جن اعمال کا ہمیں حکم دیا گیا ہے (مثلاً نماز، روزے وغیرہ) ہم بجالاتے ہیں لیکن دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور وسوسوں پر تو ہمارا اختیار ہی نہیں وہ تو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو منسوخ فرمادیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل میں آنے والی باتوں، خیالات کو معاف کر دیا ہے۔ البتہ ان پر گرفت ہوگی جن پر عمل کیا جائے یا جن کا اظہار زبان سے کیا جائے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے قلبی خیالات سے درگزر فرمالیا، گرفت اسی پر ہوگی جو کہیں یا کریں۔

حدیث: حضور ﷺ نے ایک حدیث قدسی کے اندر فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میرا بندہ گناہ کا ارادہ کرے تو اسے نہ لکھو جب تک اس سے گناہ سرزد نہ ہو، اگر گناہ کر گزرے تو ایک گناہ لکھو اور جب نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ سے ہی نیکی لکھ لو اور اگر نیکی کر بھی لے تو ایک کے بدلے دس نیکیاں لکھو۔ (بخاری، مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور وسوسوں پر محاسبہ نہیں ہوگا۔ صرف ان گناہوں پر محاسبہ ہوگا جن کا انسان ارتکاب کرے گا۔

سورہ البقرہ کی آخری آیات

ایمانیات

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟۔ (البقرہ۔285)

رسول نے مان لیا جو کچھ اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا ہے اور جو لوگ اِس رسول کے ماننے والے ہیں، انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔۔۔ (البقرہ۔285)

اس آیت میں ان ایمانیات کا ذکر ہے جن پر اہل ایمان کو ایمان رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ خاتمہ کلام ہے۔اس لیے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا،اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی ان تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔

تجدید ایمان

سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں بھی ایمانیات کا ذکر تھا۔اب اس سورۃ کی آخری آیات میں بھی بنیادی عقائد اور ایمانیات کی تجدید کی جارہی ہے۔

حدیث: قال رسول الله ﷺ جددوا إيمانكم قيل يا رسول الله وكيف نجدد إيماننا قال أكثروا من قول لا إله إلا الله۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ایمان کی تجدید کر لیا کرو۔پوچھا گیا: کیسے ہم اپنے ایمان کی تجدید کریں۔فرمایا: لا الہ الا اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو۔(مسند احمد)

سمع واطاعت

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ (البقرہ۔285)

اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور مان لیا اے ہمارے رب تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (البقرہ۔285)

آمنّا وصدّقنا: ایک مومنانہ صفت

کوئی شخص اپنی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ--- (البقرہ۔286)

اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا۔(البقرہ۔286)

اس آیت: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا--- میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شفقت اور اس کے فضل وکرم کا تذکرہ ہے کہ اس نے انسانوں کو کسی ایسی بات کا مکلف نہیں کیا جو ان کی طاقت سے بالا ہو۔

ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ۔۔۔ (البقرہ۔286)

ہر شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لئے ہے اور جو برائی سمیٹی اس کا وبال اسی پر ہے۔۔۔(البقرہ۔286)

ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا نیز سزا بھی کسی کو صرف اس کے جرم کی ملے گی جو وہ خود کرے گا۔ ہر کوئی اپنے کئے کا ذمہ دار خود ہو گا۔ ہر شخص اپنے رب کے سامنے خود اپنا اعمال نامہ لے کر جائے گا۔ اور اس میں وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا، جس کا اس نے ارتکاب کیا۔ کوئی شخص وہاں حیلہ بہانہ نہ کر سکے گا۔ نہ وہاں کسی کو کسی کی مدد یا سفارش کی امید ہو گی۔ انسان انفرادی طور پر اپنے رب جوابدہ ہو گا۔ جب انفرادی مسئولیت کا یہ تصور کسی مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے، تو ہر فرد اپنے اللہ کے جو حقوق اس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں ان کا ذمہ دار بن جاتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ اپنے نفس اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کے بارے میں ذاتی طور پر خود جوابدہ ہے۔

اسلامی عقائد اور تعلیمات کا خلاصہ

سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اور اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)۔ اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ یہ پانچ امور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ ان عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے، اسے وہ بسر و چشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حسن عمل پر غرور نہ کرے، بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

جامع دعا:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (البقرہ۔286)

اے ہمارے رب اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو تو ہمیں نہ پکڑنا اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہم سے در گزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا مالک ہے، ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔(البقرہ۔286)

اس دعا کا پس منظر

سورہ بقرہ کی آخری آیات دعائیہ کلمات پر مشتمل ہیں۔اس دعا کا پس منظر بہت اہم ہے۔اس دعا کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، جبکہ مکہ میں اسلام اور دشمنان اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ سر زمین عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندہ خدا نے دین حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی سر زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا طریقہ بتا دئے اور اس کیلئے الفاظ بھی عطا کر دے تو اس دعا کے قبول ہونے کا یقین خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔اس لیے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکین قلب کی موجب ہوئی۔

دعاء کے اہم اجزاء

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ: اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔

اس دعا سے اہل ایمان کے اس شعور کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ پروردگار، ہم پر رحم کر اور تکلیف مالایطاق سے ہمیں بچا تاکہ تعمیل احکام میں عجز و قصور کا ارتکاب نہ ہو، ورنہ وہ تو پختہ ارادہ رکھتے ہیں کہ مکمل تسلیم وانقیاد کا مظاہرہ کریں گے۔ وہ اپنی تقصیرات کا اعتراف کرتے ہیں اور وہ تقصیریں صرف اسی صورت میں معاف اور بے اثر ہو سکتی ہیں جب اللہ کا فضل شامل حال ہو۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا: ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے در گزر فرما، ہم پر رحم فرما۔

انسان جس قدر محنت سے بھی اطاعت و فرمانبر داری کرے، اس کے کام میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے۔اس لئے اس امتحان میں کامیاب ہونے کی واحد گارنٹی صرف اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔اور اگر اللہ کا فضل، عفو در گذر اور رحمت و نرمی شامل حال نہ ہو تو انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حدیث: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہو گا۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا، رسول اللہ ﷺ آپ بھی؟ تو رسول ﷺ نے فرمایا۔ "اور میں بھی، الا یہ کہ اللہ نے مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا ہے۔

ایک بندہ مومن کے احساس میں یہی اصل بات ہے۔ وہ حتی المقدور عمل کرتا ہے لیکن اپنی تقصیرات کا اسے پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے پوری امید ہوتی ہے کہ اللہ اس کی تقصیرات سے عفوودرگزر فرمائے گا۔ اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔

سورہ بقرہ کی آخری آیات: حفاظت کا ذریعہ

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں رات کو پڑھ لیتا ہے تو یہ اس کو کافی ہو جاتی ہیں۔ (صحیح بخاری)

حدیث: نبی اکرم ﷺ کو معراج کی رات جو تین چیزیں ملیں ان میں سے ایک سورۃ بقرہ کی یہ دو آخری آیات بھی ہیں۔ (صحیح مسلم)

کئی روایات میں ہے کہ اس سورۃ کی آخری آیات آپ ﷺ کو ایک خزانے سے عطا کی گئیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے اور یہ آیات آپ کے سوا کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔

سورہ بقرہ کی دس آیات

شعبی رحمہ اللہ سے مروی ہے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
جو کوئی رات میں سورۃ البقرہ کی دس آیات پڑھے گا اس گھر میں اس رات صبح تک شیطان داخل نہیں ہو گا۔
وہ دس آیات یہ ہیں: سورۃ البقرہ کی پہلی چار آیات (الم سے لیکر اولٓئک ہم الفلحون تک) اور آیت الکرسی اور اس کے متصل بعد کی دو آیتیں اور سورۃ البقرہ کی آخری تین آیات جو لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔۔۔ سے شروع ہوتی ہیں۔ (سنن دارمی)

سورۃ البقرہ کا اختتام دعائیہ آیات پر ہوتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس صورت کے خاتمے پر آمین کہا کرتے تھے۔ (ابن جریر)

سورہ آل عمران

سورہ آل عمران مدنی سورت ہے اور اس میں 200 آیات ہیں۔

سورہ آل عمران۔ خیر و برکت کا ذریعہ

سورۃ آل عمران کا موضوع: دعوت اسلام، غیر اسلامی عقائد و نظریات کی تردید، مکالمہ بین المذاہب، اسلامی عبادات کے احکامات، اتحاد و اتفاق کی اہمیت (واعتصمو بحبل اللہ جمیعاًولا تفرقو)، امت مسلمہ کی ذمہ داریاں دعوت و تبلیغ، جنگ احد پر تبصرہ۔

سورۃ آل عمران کا شان نزول

سورۃ آل عمران کی بیشتر آیات کے نزول کا سبب نجران کے نصاریٰ کا وفد تھا۔ یہ ساٹھ افراد کا وفد 9 ھجری میں مدینہ منورۃ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد نبویؐ میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ رسول اللہؐ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اس وفد میں بڑے بڑے پادری اور بشپ شامل تھے۔ وفد میں شامل کچھ افراد دل سے آپؐ کی نبوت کے قائل اور آپؐ کی صفات اور شان سے واقف تھے کیونکہ اگلی کتابوں میں آپؐ سے متعلق پڑھ چکے تھے لیکن اپنے مذہب کے ماحول میں جو ان کی تکریم و تعظیم تھی اور وہاں جو جاہ و منصب انہیں حاصل تھا اس کے چھن جانے کے خوف سے راہ حق کی طرف آنے میں ہچکچاہٹ تھی۔

آپؐ نے اس مہمان وفد کی مہمان نوازی کی اور ہر طرح سے ان کے آرام کا خیال رکھا۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہوا تو انہوں نے عبادت کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے رواداری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرتے ہوئے اس کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ گھر رب کی عبادت کیلئے ہی ہے جس کے بعد انہوں نے مشرق کی طرف منہ کرکے مسجد نبویؐ میں ہی اپنے طریق پر نماز ادا کرلی۔

حضورؐ کے ساتھ اس وفد کی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ لوگ حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سوالات کررہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی تردید اور ان کے سوالات کے جواب میں سورۃ آل عمران کی تقریباًاسی سے زیادہ آیات نازل ہوئیں۔ اس گفتگو اور نظریاتی مباحثہ کی مزید تفصیل اس سورت میں آئے گی۔ البتہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ عیسیٰؑ سے متعلق یہ ساری آیات وفد نجران کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔

نواں رکوع: الٓمّٓ۔ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ (آل عمران۔2)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

سورۃ آل عمران کے پہلے رکوع کے موضوعات میں بیان توحید، صفات الٰہی حیّ وقیوم کا بیان، تعارف قرآن: قرآن سچی کتاب، فرقان اور ساری انسانیت کیلئے ہدایت ہے۔ اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، تخلیق انسانی، محکمات و متشابہات، راسخون فی العلم کا ذکر، آخر میں ہدایت میں استقامت کی دعا: ربنالا تزع قلوبنابعد اذ ھدیتنا۔ اللہ کا صفاتی نام: الوھاب

حروف مقطعات

الٓمّٓ۔

الف۔لام۔میم (آل عمران۔1)

عظیم نام والی آیت

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ۔ (آل عمران۔2)

اللہ، وہ زندہ جاوید ہستی، جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔(آل عمران۔2)

احادیث میں آتا ہے کہ تین آیات میں اللہ کا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سے دعا کی جائے تو رد نہیں ہوتی۔ ایک یہ آل عمران کی آیت، دوسری آیت الکرسی اور تیسری سورۃ طٰہٰ۔(ابن کثیر تفسیر آیت الکرسی)

سچی کتاب

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَۙ۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (آل عمران۔3۔4)

اس نے تم پر یہ سچی کتاب نازل فرمائی جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے اس کتاب سے پہلے تورات اور انجیل نازل فرمائی۔ اور اس نے فرقان اتاری ہے(جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)اب جو لوگ اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اللہ زبردست ہے(اور برائی کا) بدلہ لینے والا ہے۔(آل عمران۔3۔4)

قرآن پوری انسانیت کیلئے ہدایت ہے۔ ھدی للناس (آل عمران۔4)

اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ۔ (آل عمران۔5)

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں۔(آل عمران۔5)

تخلیق انسانی کے مراحل

ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (آل۔عمران۔6)

وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔(آل عمران۔6)

محکمات و متشابہات

ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ج وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (آل عمران۔7)

وہی ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات (جن کے معنی واضح ہیں) جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات (جن کے معنی معلوم یا معین نہیں)۔ سو جن لوگوں کے دل میں ٹیڑھ ہے اور فتنے کی تلاش میں ہیں وہ گمراہی پھیلانے کی غرض سے متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان آیات کا مطلب سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور پختہ علم والے کہتے ہیں: ہمارا ان سب پر ایمان ہے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ مانتے ہیں جو عقلمند ہیں۔(آل عمران۔7)

تفسیر کی چار اقسام

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

تفسیر چار قسم کی ہے:

1۔ایک وہ جس کے سمجھنے میں کسی کو مشکل نہیں۔

2۔ایک وہ جسے اہل زبان اپنی عربی لغت سے سمجھتے ہیں۔

3۔ایک وہ جسے جید علماء اور اہل علم ہی جانتے ہیں۔

4۔ایک وہ تفسیر ہے جسے بجز ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔(بحوالہ ابن کثیر)

آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جن میں عبادات، اوامر ونواہی، احکام ومسائل ہیں جن کا مفہوم واضح اور قابل فہم ہے اور ان کے سمجھنے میں کسی کو اشکال پیش نہیں آتا۔ یہ آیات کتاب کی اصل بنیاد ہیں، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے، اس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ انہی میں دنیا کو اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے، انہی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، انہی میں گمراہیوں کی تردید اور راہ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ انہی میں دین کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالب حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیات محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرۃً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

اس کے برعکس آیات متشابہات وہ ہیں جو انسانی سمجھ سے بلند ہیں۔ مثلاً اللہ کی ہستی، اللہ کی مخصوص صفات، قضاوقدر کے مسائل، جنت ودوزخ، ملائکہ وغیرہ جن کی حقیقت سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہو یا ان میں ایسی تاویل کی گنجائش ہو یا کم از کم ایسا ابہام ہو جس سے عوام کو گمراہی میں ڈالنا ممکن ہو۔ اس لئے آگے کہا جارہا ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ آیات متشابہ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے سے فتنے برپا کرتے ہیں۔ ایک بندہ مومن محکمات پر عمل کرتا ہے اور متشابھات کے مفہوم کو حکمت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ فتنے سے بھی محفوظ رہتا ہے اور عقائد کی گمراہی سے بھی۔

راسخون فی العلم سے کون لوگ مراد ہیں؟

حدیث: حضور ﷺ سے سوال ہوتا ہے کہ پختہ علم والے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

من برت یمینہ و صدق لسانہ، واستقام قلبہ ومن اعف بطنہ و فرجہ فذالک من الرّاسخین فی العلم۔

1۔ جس کی قسم سچی ہو۔

2۔ جس کی زبان سچ بولتی ہو۔

3۔ جو استقامت والا دل رکھتا ہو۔

4۔ جس کا پیٹ حرام سے بچا ہو۔

5۔ جس کی شرم گاہ بدکاری سے محفوظ ہو۔

ان صفات کے حامل لوگ راسخون فی العلم یعنی مضبوط علم والے ہیں۔ (ابن ابی حاتم بحوالہ ابن کثیر)

امت پر تین فتنوں کا ڈر

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا:

مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا ڈر ہے:

1۔ مال کی کثرت کا جس سے حسد و بغض پیدا ہو گا اور آپس کی لڑائی شروع ہو گی۔

2۔ دوسرا یہ کہ کتاب اللہ کی تاویل کا سلسلہ شروع ہو گا حالانکہ اصلی مطلب ان کا اللہ ہی جانتا ہے اور اہل علم کہیں گے کہ ہمارا اس پر ایمان ہے۔

3۔ تیسرے یہ کہ علم حاصل کرنے کے بعد اسے بے پرواہی سے ضائع کر دیں گے۔ (معجم کبیر)

قرآن کی غلط تاویل یا تفسیر نہ کرو

حدیث: حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے چند لوگوں کو دیکھا کہ وہ قرآن کریم کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

انّما ھلک من کان قبلکم بھٰذا، ضربو کتاب اللہ بعضہ ببعض، وانّما انزل کتاب اللہ لیصدق بعضہ بعضاً، فلا تکذبوا ببعضہ بعض، فما علمتم منہ فقولو، فما جھلتم عنہ فکلوہ الٰی عالمہ۔

سنو! تم سے پہلے لوگ بھی اسی میں ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی آیتوں کو ایک دوسرے کیخلاف بتا کر اختلاف کیا۔ حالانکہ کتاب اللہ کی ہر آیت، دوسری آیت کی تصدیق کرتی ہے۔ تم ان میں اختلاف پیدا کرکے ایک کو دوسرے کے متضاد نہ کہو۔ جس آیت کا علم رکھتے ہو وہی بیان کرو، جس آیت کا علم نہیں رکھتے اسے اہل علم کے سپرد کرو۔ (مسند احمد، ابن ماجہ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کیلئے حضور ﷺ کی دعا

حدیث: حضور ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عباس کیلئے ان الفاظ میں دعا فرمائی:

اللہم فقہہ فی الدین وعلمہ التاویل۔

اے اللہ انہیں دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر کا علم سمجھا دے۔ (صحیح ابن حبان۔ حدیث:7055)

ہدایت پر استقامت اور رحمت خداوندی کی طلب کی دعا:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ (آل عمران۔8۔9)

اے رب ہمارے! جب تو ہم کو ہدایت کر چکا تو ہمارے دلوں کو نہ پھیر اور اپنے ہاں سے ہمیں رحمت عطا فرما، بے شک تو بہت زیادہ دینے والا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ایک دن سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں بے شک اللہ اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔ (آل عمران۔8۔9)

حدیث: رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:

یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک۔

اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ، پھر یہ دعا پڑھتے: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔۔۔ (آل عمران۔ آیت 8)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مغرب کی نماز کی تیسری رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد اس آیت: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔۔ (آل عمران۔ آیت:8) کی تلاوت فرماتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جب تک یہ روایت نہیں سنی تھی آپ اس رکعت میں قل ھو اللہ (یعنی سورۃ اخلاص) پڑھا کرتے تھے لیکن یہ حدیث سننے کے بعد امیر المومنین نے بھی اسی کو معمول بنالیا۔ (بحوالہ ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام: الوھاب

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

دسواں رکوع: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ۔۔۔ (آل عمران۔10)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

دنیا اور آخرت کا موازنہ، سب سے بڑی کامیابی: رضائے الٰہی کا حصول، مغفرت کی اہمیت اور بخشش کی دعا، متقی لوگوں کا تعارف، آیت شہادت یعنی اللہ، فرشتے اور اہل علم خدا کی وحدانیت کے شاہد، اللہ کے ہاں قابل قبول دین اسلام (ان الدّین عند اللہ الاسلام)، بے بنیاد اختلافات اور فرقہ بندیاں، سب بندے اللہ کی نظر میں ہیں (واللہ بصیر بالعباد)۔

دنیا کے حسن اور آخرت کے جمال کا تقابل

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ (آل عمران۔14)

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ (آل عمران۔14)

شَہَوَات سے کیا مراد ہے؟

شہوات سے مراد وہ چیزیں جو طبعی اور فطری طور پر انسان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اس لئے ان میں رغبت اور ان کی محبت ناپسندیدہ نہیں ہے بشرطیکہ اعتدال کے اندر اور دین کے دائرے میں ہو۔ ان چیزوں کی خوبصورتی اور تزئین بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ سب سے پہلے عورت کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ہر بالغ انسان کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور سب سے زیادہ مرغوب بھی۔

نبی اکرم ﷺ نے نیک عورت کو دنیا کی سب سے بہترین نعمت اور متاع قرار دیا ہے۔

اس لئے اس کی محبت دین کی حدود سے تجاوز نہ کرے تو یہ بہترین رفیق زندگی بھی ہے اور زاد آخرت بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ آزمائش بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: میرے بعد جو فتنے رونما ہونگے ان میں مردوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ عورتوں کا ہے۔

اسی طرح اولاد کی محبت ہے۔ اگر اولاد حصول آخرت کا ذریعہ ہو اور صدقہ جاریہ بنے تو محمود ہے اور حصول جنت کا ذریعہ ہے۔

اس آیت سے رہبانیت کی تردید بھی ثابت ہوتی ہے۔

مال و دولت سے مقصود استحکام معیشت، صلہ رحمی، صدقہ و خیرات اور امور خیر پر خرچ کرنا اور سوال سے بچنا ہے تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ ان مقاصد کے تحت حصول دولت بھی عین مطلوب ہے ورنہ مذموم۔

خزانے یعنی سونے چاندی اور مال و دولت کی فروانی اور کثرت، گھوڑوں اور دیگر جانوروں سے مثبت مقاصد، فارمنگ، روزی کے حصول کا ذریعہ ہو تو یہ سب پسندیدہ ہیں اور اگر مقصود محض دنیا کمانا اور پھر اس پر فخر اور غرور کا اظہار کرنا اور یاد الٰہی سے غافل ہو کر عیش و عشرت سے زندگی گزارنا ہے تو سب مفید چیزیں اس کے لئے وبال جان ثابت ہو نگی۔

دنیا متاع حسن ہے

قرآن نے دینا کو متاع غرور یعنی دھوکے کا سامان بھی کہا ہے مگر دوسری جگہ دنیا کو متاع حسن یعنی اچھا سامان بھی قرار دیا ہے: يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا۔۔۔ (سورۃ ھود۔3)، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آخرت سے غافل ہو کر متاع دنیا سے استفادہ کرلے گا، اس کے لئے یہ متاع غرور ہے، کیونکہ اس کے بعد اسے برے انجام سے دو چار ہونا ہے اور جو آخرت کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس سے فائدہ اٹھائے گا، اس کے لئے یہ چندروزہ سامان زندگی متاع حسن ہے۔

حدیث: حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: کاد الفقر ان یکون کفراً۔ یعنی تنگدستی انسان کو بعض اوقات آدمی کو کفر تک لے جاسکتی ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: كان المال فيما مضى يكره فاما اليوم فهوترس المومن۔ یعنی زمانہ ماضی میں مال کو پاس رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ مال مومن کی ڈھال اور ضرورت ہے۔ پھر فرمایا: من كان فى يده من هذه شيأ فليصلحه فانه زمان ان احتاج كان اول من يبدل دينه۔ یعنی جس کے پاس درہم و دینار میں سے کچھ موجود ہو اسے چاہئے کہ اس مال کو مناسب طریقہ پر کام میں لائے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر کچھ حاجت پیش آگئی تو انسان سب سے پہلے حاجت پوری کرنے کے لئے اپنا دین بیچ ڈالے گا۔

سب سے بڑی کامیابی: رضائے الٰہی کا حصول

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰ لِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۚ۔ (آل عمران۔15)

آپ کہہ دیجئے! کیا میں تمہیں اس سے بہت ہی بہتر چیز نہ بتاؤں؟ تقویٰ والوں کے لئے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اور سب بندے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ (آل عمران۔15)

اس آیت میں اہل ایمان کو بتلایا جارہا ہے کہ دنیا کی مذکورہ چیزوں میں ہی مت کھو جانا بلکہ ان سے بہتر وہ زندگی اور نعمتیں ہیں جو رب کے پاس ہیں جن کے مستحق اہل تقویٰ ہی ہونگے اس لئے تم تقویٰ اختیار کرو اگر یہ تمہارے اندر پیدا ہو گیا تو یقیناً تم دین دنیا کی بھلائیاں اپنے دامن میں سمیٹ لوگے۔

سورۃ براءت کی آیت میں فرمایا: ورضوان من الله اكبر۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے راضی ہو جانا یعنی رب کی رضا کا حاصل ہو جانا تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

مغفرت کی دعا:

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ۔ (آل عمران۔16)

اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے ہیں سو ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ (آل عمران۔16)

متقی لوگوں کا تعارف

اگلی دو آیات میں اہل تقویٰ کی صفات کا تذکرہ ہے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۔ (آل عمران۔17)

جو صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرمانبرداری کرنے والے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں کرنے والے۔(آل عمران۔17)

متقی لوگ کون؟

متقی لوگ اللہ کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ حرام چیزوں سے الگ رہتے ہیں۔ صبر کے سہارے کام لیتے ہیں اور اپنے ایمان کے دعوے میں بھی سچے ہیں، تمام اعمال صالحہ بجالاتے ہیں خواہ وہ ان کے نفس کو کتنے بھاری پڑیں۔ اطاعت اور خشوع خضوع والے ہیں، اپنے مال اللہ کی راہ میں جہاں جہاں حکم ہے خرچ کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں۔ نیکی اور اچھائی میں تعاون کرتے ہیں، آپس میں ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں، حاجت مندوں، مسکینوں اور فقیروں کے ساتھ احسان کرنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں اور سحری کے وقت پچھلی رات کو اٹھ اٹھ کر توبہ واستغفار کرتے ہیں۔ سحری کے وقت توبہ واستغفار افضل ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات کے آخری حصے میں آسمان دنیا پر نزول فرما کر فرماتے ہیں: کیا کوئی سائل ہے جسے میں عطا کروں؟ کوئی دعا مانگنے والا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ میں اسے بخش دوں؟۔(بخاری، مسلم)

آیت شہادت: اللہ وحدہ لاشریک اپنی وحدت کا خود شاہد

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُؕ۔ (آل عمران۔18)

اللہ نے اس بات پر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور فرشتوں نے اور علم والے بھی اس پر گواہ ہیں۔ آل عمران۔18

شان نزول: یہ آیت شہادت ایک خاص شان رکھتی ہے، امام بغویؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہود کے دو بڑے عالم ملک شام سے مدینہ طیبہ میں وارد ہوئے، مدینہ کی بستی کو دیکھ کر آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ یہ بستی تو اس طرح

کی ہے جس کے لئے توراۃ میں پیشگوئی آئی ہے کہ اس میں نبی آخر الزمان قیام پذیر ہوں گے، اس کے بعد ان کو اطلاع ملی کہ یہاں کوئی بزرگ ہیں جن کو لوگ نبی کہتے ہیں، یہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ پر نظر پڑتے ہی وہ تمام صفات سامنے آگئیں جو توراۃ میں آپؐ کے لئے بتلائی گئی تھیں، حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ محمدؐ ہیں؟ آپؐ نے فرمایاہاں، پھر عرض کیا کہ آپ احمد ہیں، آپؐ نے فرمایاہاں، میں محمد ہوں اور احمد ہوں، پھر عرض کیا کہ ہم آپؐ سے ایک سوال کرتے ہیں اگر آپ اس کا صحیح جواب دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپؐ نے فرمایادریافت کرو، انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے بڑی شہادت کون سی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ آیت شہادت نازل ہوئی، آپ نے ان کو پڑھ کر سنادی، یہ دونوں اسی وقت مسلمان ہو گئے۔

آیت کا مفہوم: شہادت کے معنی بیان کرنے اور آگاہ کرنے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اور بیان کیا اس کے ذریعے سے اس نے اپنی وحدانیت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہ راست علم رکھتاہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہاہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اس کی شہادت ہے۔۔۔ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہو گی۔۔۔ کہ پورے عالم وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے، جو خدائی کی صفات سے متصف ہو، خدائی کے اقتدار کی مالک ہو، اور خدائی کے حقوق کی مستحق ہو۔

اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے، کیونکہ وہ سلطنت کائنات کے انتظامی اہل کار ہیں اور وہ براہ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے، جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں۔

فرشتوں کے بعد اہل علم بھی اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ اس میں اہل علم کی بڑی فضیلت اور عظمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ناموں کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے عرفات میں اس آیت کی تلاوت کی اور الحکیم تک پڑھ کر فرمایا: وانا علی ذالک من الشاھدین یا رب۔ میں بھی اس (توحید الٰہی) پر گواہ ہوں اے ربّ العالمین۔ (مسند احمد)

حدیث: اس آیت کے حوالے سے امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ ایک حدیث نقل فرمائی ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ہر نماز فرض کے بعد سورۃ فاتحہ اور آیۃ الکرسی اور آیت شہادت (شھد اللہ انہ۔۔) اور آیت الملک (قل اللھم مالک الملک۔۔ آل عمران: 26-27) پڑھا کرے تو اللہ

تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمائیں گے اور اسے جنت میں جگہ عطا فرمائیں گے اور اس کی ستر حاجتیں پوری فرمائیں گے، جن میں سے کم سے کم حاجت اس کی مغفرت ہے۔(روح المعانی)

اللہ کے ہاں قابل قبول دین: اسلام

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران۔19)

بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔(آل عمران۔19)

اسلام وہی دین ہے جس کی دعوت و تعلیم ہر پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں دیتے رہے ہیں۔ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اسلام کی کامل ترین شکل وہ ہے جسے نبی آخر الزّماں حضرت محمد ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دین اسلام کی دعوت ایک پر امن اور عالمگیر دعوت ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے وقت کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کو خطوط تحریر فرمائے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی۔ دعوت دین امّت مسلمہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔(بلّغوعنی ولو آیۃ۔ حدیث)۔ بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ اسلام کے پیغام دعوت و محبت کو حکمت کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے عام کیا جائے۔

بے بنیاد اختلافات اور فرقہ بندی

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا ۢ بَیْنَهُمْ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ (آل عمران۔19)

اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انہوں نے صحیح علم ہونے کے بعد آپس کی ضد کے باعث اختلاف کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام وہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی ہے۔(آل عمران۔19)

باہمی اختلاف سے مراد ایک تو وہ اختلاف ہے جو اہل کتاب کے درمیان آپس میں تھا جس کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے تم کسی چیز پر نہیں ہو۔

اس میں وہ اختلاف بھی شامل ہے جو ایک ہی دین کے ماننے والوں نے بغیر دلائل کے آپس میں پیدا کیا۔ یہ سارے اختلافات دلائل کی بنیاد پر نہیں تھے محض حسد اور بغض وعناد کی وجہ سے تھے یعنی وہ لوگ حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود محض اپنی خام خیالی، خود فریبی، دنیاوی مفاد کے چکر میں غلط بات پر جمے رہتے۔

بد قسمتی سے آج امت مسلمہ کے اندر بھی اسی طرح کا اختلاف اور فرقہ بندی رونما ہو چکی ہے جس کی قرآن و حدیث میں سختی کے ساتھ ممانعت اور مذمت بیان کی گئی۔

اللہ اپنے بندوں کی دیکھ بھال کرتا ہے

۔۔۔وَاللهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران۔20)

۔۔۔اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔(آل عمران۔20)

گیارہواں رکوع: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔۔۔ (آل عمران۔21)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

ہر ایماندار صاحب عمل کیلئے پورا اجر و ثواب، آیت الملک، ناظم کائنات ہستی، محبت و دوستی کا معیار، ہر چیز اللہ کے علم میں، اللہ ہر چیز پر قادر، فکر آخرت: ہر آدمی کا نامہ اعمال سامنے ہو گا، اللہ اپنے بندوں پر مہربان (واللہ رؤف بالعباد)۔

ہر ایک کیلئے پورا اجر

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔25)

پس کیا حال ہو گا جبکہ ہم انہیں اس دن جمع کریں گے؟ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(آل عمران۔25)

آیت الملک

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭبِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭاِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران۔26)

آپ کہہ دیجئے اے اللہ! اے تمام جہان کے مالک! تو جسے چاہے اقتدار دے، جس سے چاہے سلب کر لے، جس کو چاہے عزت دے، تو جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (آل عمران۔26)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت وطاقت کا اظہار ہے۔ شاہ کو گدا بنا دے، گدا کو شاہ بنا دے، تمام اختیارات کا مالک ہے یعنی تمام بھلائیاں صرف تیرے ہی ہاتھ میں ہیں تیرے سوا کوئی بھلائی دینے والا نہیں۔ شر کا خالق بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن ذکر صرف خیر کا کیا گیا ہے شر کا نہیں اس لئے کہ خیر اللہ کا فضل محض ہے بخلاف شر کے یہ انسان کے اپنے عمل کا بدلہ ہے جو اسے پہنچتا ہے یا اسلئے کہ شر بھی اس کے قضاوقدر کا حصہ ہے جو خیر کو متضمن ہے اس اعتبار سے اس کے تمام افعال خیر ہیں۔ (فتح القدیر)

حدیث میں ہے اللہ کا سب سے عظیم نام یعنی اسم اعظم اس آیت (قل اللھم۔۔۔) میں ہے کہ جب اس نام سے اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول فرمالیتا ہے۔ (طبرانی)

قرض کی ادائیگی میں معاون دعائیں

بعض روایات میں ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اپنے اوپر قرض کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم آیت: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ۔۔۔ (آل عمران۔26) پڑھا کرو پھر یہ دعا کرو: رَحْمَانُ الدُّنْيَا وَلْآخِرَةِ و رحيمهما تعطى من تشاء منهما وتمنع من تشاء ارحمنى رحمة تغنينى بها عن رحمة من سواک اللهم اغننى من الفقر واقض عنى الدين۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ ایسی دعا ہے کہ تم پر احد پہاڑ جتنا قرض بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کا تمہارے لئے انتظام فرما دے گا۔ (مجمع الزوائد)

قرض کی ادائیگی کے لیے یہ دعا بھی پڑھا کریں:

اللَّهُمَّ اكْفِنِی بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ، وَأَغْنِنِی بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَأَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ۔

منتظم کائنات ہستی

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (آل عمران۔27)

تورات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے تو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔(آل عمران۔27)

رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مطلب موسمی تغیرات ہیں۔

دوستی کے آداب

اسلام کے دشمنوں سے دوستی اور محبت جائز نہیں

دوستی اور محبت کا معیار

آل عمران۔ آیت۔28

اس آیت کی تفسیر کو سمجھنے کیلئے قرآن کی ایک آیت اور نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے: قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔(162:6)

آپ فرمایئے! کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اور جب انسان کی زندگی کا مقصد اللہ رب العالمین کی اطاعت وعبادت ٹھہرا تو دنیا کے تمام معاملات اور عائلی تعلقات سب اس کے تابع ٹھہرے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ان الشیطان لکم عدوا فاتخذوہ عددوا۔(6:35)۔

یعنی شیطان تمہارا دشمن ہے اس دشمن کو یاد رکھو۔

اسی مضمون کو صحیحین کی ایک حدیث میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے: من احب للہ وابغض للہ فقد استکمل ایمانہ۔ (بخاری، مسلم)۔

یعنی جس شخص نے اپنی دوستی اور دشمنی کو صرف اللہ کے لئے وقف کر دیا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ تذکیر بالقرآن۔پارہ 28، سورۃ الممتحنہ آیت۔8 کی تفسیر میں موجود ہے۔

عام غیر مسلموں سے دوستی، بھلائی اور انصاف میں کوئی حرج نہیں

قرآن کی بہت سی آیات سے اور رسول کریم ﷺ کے ارشادات اور عمل سے خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان و سلوک اور ہمدردی و غمخواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہیں۔

رسول کریم ﷺ جو رحمۃ للعالمین بن کر اس دنیا میں تشریف لائے، آپؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کئے، اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے۔

مکہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپؐ کو اپنے وطن سے نکالا تھا، ان کی خود امداد فرمائی۔

پھر مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپؐ کے سب دشمن آپؐ کے قابو میں آ گئے تو سب کو یہ فرما کر آزاد کر دیا کہ (لا تثریب علیکم الیوم)۔ یعنی آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے۔

غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ حسن سلوک کیا جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا۔

قریش مکہ نے آپؐ اور آپ کے جان نثار ساتھیوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، کبھی آپؐ کا ہاتھ انتقام کے لئے نہیں اٹھا۔ زبان مبارک سے بددعا بھی نہیں فرمائی۔

نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ مقدس مقام تھا۔

فاروق اعظمؓ نے غیر مسلم محتاج ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفے دیئے۔

خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ اجمعین کے حالات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔

سورۃ ممتحنہ کے اندر واضح طور پر فرمایا گیا:

لاینہٰکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین، ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروہم وتقسطوا الیہم۔

اللہ تمہیں منع نہیں کرتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاو کرو جو تم سے دین کی بنیاد پر جنگ نہیں کرتے اور نہ تمہیں اپنے گھروں سے نکالتے ہیں۔ (الممتحنۃ:8)

انّ اللہ یحبّ المقسطین۔ بے شک اللہ (سب کے ساتھ) انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ہر چیز اللہ کے علم میں ہے

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (آل عمران۔29)

کہہ دیجئے! کہ تم اپنے سینوں کی باتیں چھپاؤ خواہ ظاہر کرو، اللہ تعالیٰ بہر حال جانتا ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسے معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ آل عمران۔29

ہر آدمی کا اعمال نامہ سامنے موجود ہوگا

یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۛۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۛۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗۤ اَمَدًاۢ بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران۔30)

جس دن ہر نفس (شخص) اپنی کی ہوئی نیکیوں کو اور اپنی کی ہوئی برائیوں کو موجود پالے گا، آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور برائیوں کے درمیان بہت سی دوری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ (آل عمران۔30)

بارہوں رکوع: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔۔۔ (آل عمران۔31)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ سے محبت کا معیار اور کسوٹی، محبت الٰہی رسولؐ کی اطاعت سے مشروط، اخروی نجات کا فارمولہ: اتباعِ سنّت، مبارک اور مقدس ہستیاں، آلِ عمران، امّ مریم کی دعا، قبولیت، مریم کے کفیل حضرت زکریاؑ کا تذکرہ، حصول اولاد کی دعا، حاصل دعا: حضرت یحیٰؑ کا تذکرہ، اللہ کو صبح وشام کثرت کے ساتھ یاد کرنے کا حکم: واذکر ربک کثیراً وسبّح بالعشی والابکار۔

اللہ سے محبت کا معیار

اللہ کی محبت کا دعویٰ، رسولؐ کی اطاعت سے مشروط

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (آل عمران۔31)

کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری فرمانبرداری کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (آل عمران۔31)

خدا تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ: اتباع سنّت

ربّ العالمین تک پہنچنے کیلئے رحمت للعالمینؐ کی پیروی ضروری ہے

ہر مذہب کا پیروکار اللہ کا قرب اور اس کی رضا و محبت چاہتا ہے۔ تمام مذاہب کے پیروکار یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دعووں اور خودساختہ طریقوں سے اللہ کی محبت اور اس کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میرے آخری پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اس کی پیروی کرو۔ اس آیت نے تمام دعوے داران محبت کے لئے ایک کسوٹی اور معیار مہیا کر دیا ہے کہ محبت الٰہی کا طالب اگر اتباع محمد ﷺ کے ذریعے سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر تو یقیناً وہ کامیاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی محبت کا معیار بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعوٰی ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس کو اتباع رسول ﷺ کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص اپنے دعوی میں جتنا سچا ہو گا اتنا ہی حضور اکرمؐ کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا، اور آپؐ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بنائے گا، اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہو گا اسی قدر آپؐ کی اطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔

حدیث: ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أَبَى قيل: ومَنْ يَأْبَى يا رسول الله؟ قال: من أطاعني دخل الجنة، ومن عصاني فقد أَبَى۔ میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے، ماسوا ان کے جنھوں نے انکار کیا۔ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! جنت میں جانے سے انکار کرنے والے کون ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے گویا خود ہی جنت میں جانے سے انکار کر دیا۔ (بخاری)

اخروی نجات کا فارمولہ: اللہ، رسولؐ کی اطاعت

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آل عمران۔32)

کہہ دیجئے! کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر یہ منہ پھیر لیں تو بیشک یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔ (آل عمران۔32)

اس آیت میں پیروی رسول ﷺ سے گریز کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے۔

اس آیت میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی پھر تاکید کر کے واضح کر دیا کہ اب نجات اگر ہے تو صرف اتباع رسول ﷺ اور اطاعت محمدیؐ میں ہے اور اس سے انحراف ایمان سے انحراف ہے اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا چاہے وہ اللہ کی محبت اور قرب کے کتنے ہی دعوے دار ہوں۔

مبارک اور مقدس ہستیاں

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَۙ۔ (آل عمران۔33)

اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آل ابراہیم اور آل عمران کو سارے جہان سے چن لیا ہے۔(آل عمران۔33)

آل عمران سے کون مراد ہے؟

انبیاء علیہ السلام کے خاندانوں میں دو عمران گذرے ہیں ایک حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے والد اور دوسرے حضرت مریم علیہ السلام کے والد۔ اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک یہی دوسرے عمران یعنی حضرت مریمؑ کے والد مراد ہیں جو ایک روایت کے مطابق مسجد اقصیٰ کے امام اور متولی بھی تھے۔ اس خاندان کو بلند مرتبہ حضرت مریم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے حاصل ہوا۔ حضرت مریم علیہ السلام کی والدہ کا نام مفسرین نے حنّہ بنت فاقوذ لکھا ہے۔(بحوالہ تفسیر قرطبی وابن کثیر)

تین عظیم ہستیاں اور خاندان

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آل عمران کے علاوہ مزید تین خاندانوں کا تذکرہ فرمایا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وقت میں جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

ان میں پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں جنہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔

دوسرے حضرت نوح علیہ السلام ہیں انہیں اس وقت کا رسول بنا کر بھیجا گیا جب لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنالیا انہیں عمر طویل عطا کی گئی انہوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال دین کی دعوت دی لیکن چند افراد کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔

تیسرے آل ابراہیمؑ کو یہ فضیلت عطا کی گئی کہ ان میں انبیاء کا سلسلہ قائم کیا اور بیشتر پیغمبر آپ ہی کی نسل سے ہوئے حتیٰ کہ کائنات میں سب سے افضل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا تعلق بھی آل ابراہیمؑ یعنی حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو جدانبیاء کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج رات میرے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی اور میں نے اس کا نام اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کے نام پر ابراہیم رکھا۔ (بخاری، مسلم)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہستیوں کو تمام جہان پر فضیلت اور مرتبہ عنایت فرمایا۔

قرآن میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیوں؟

سورۃ آل عمران کی اس آیت:33 میں اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ سابقین کا ذکر فرمایا تو حضرت آدم، حضرت نوح، آل ابراہیم، آل عمران علیہم السلام۔ سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمالا کرنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے بعد تقریبا تین رکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ اور ان کے خاندان کا ذکر اس تفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء ﷺ جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، حضرت عیسیٰؑ کی نانی کا ذکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کا تفصیلی ذکر، حضرت عیسیٰؑ کا بطن مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن و تشنیع، ولادت میں ان کو بطور معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، ان کی مخالفت، حوارین کی امداد، ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا جانا وغیرہ۔ پھر احادیث متواترہ میں ان کی مزید صفات، شکل وصورت، ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن وحدیث میں کسی نبی ورسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے۔ یہ بات دعوت فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا؟

اگر غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے نبی کریمؐ چونکہ آخری نبی ورسول ہیں کوئی دوسرا نبی آپؐ کے بعد آنے والا نہیں، اس لئے آپؐ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل امت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دیدیں، اس لئے آپؐ نے ایک طرف تو اس کا اہتمام فرمایا کہ آپؐ کے بعد قابل اتباع کون لوگ ہوں گے، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے امت کو خطرہ تھا۔ بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح دجال تھا، جس کا فتنہ گمراہ کن تھا اس کے اتنے حالات وصفات بیان فرمادیئے کہ اس کے آنے کے وقت امت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابل اقتداء ہستیوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰؑ ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے نبوت ورسالت سے نوازا، اور قرب قیامت میں فتنہ دجال کی سرکوبی کے لئے ان کو آسمان میں زندہ رکھا۔ اس

لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وصفات بھی امت کو ایسے صاف اور واضح بتلائے جائیں جن کے بعد نزول عیسیٰؑ کے وقت کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصالح ہیں۔

اول یہ کہ اگر امت کو حضرت عیسی علیہ السلام کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آجائے تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰؑ اگرچہ اس وقت فرائض نبوت ورسالت پر مامور ہو کر دنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ امت کی قیادت وامامت کے لئے بحیثیت خلیفہ رسول ﷺ تشریف لائیں گے۔ مگر ذاتی طور پر جو ان کو منصب نبوت ورسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے۔ امت مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر قرآنی ارشادات کی بناء پر ایمان لائے ہوئے ہے، اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو انکار میں مبتلا ہو جائے گی، اس لئے ان کی علامات وصفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزول عیسیٰؑ کا واقعہ تو دنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگر ان کی علامات وحالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی دعوی کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوں، ان علامات کے ذریعہ اس کی تردید کی جاسکے گی۔ جیسا کہ ہندوستان میں ایک شخص نے دعوی کیا تھا کہ میں مسیح موعود ہوں تو علماء امت نے انہی علامات کی بناء پر اس کے قول کو رد کیا۔

امّ عیسیٰ مریمؑ بنت عمران کا ذکر

آل عمران۔ آیات۔ 32 تا 47

حضرت مریمؑ کی والدہ کی دعا کا تذکرہ

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ (آل عمران۔35)

جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہو گا میری اس منت کو قبول فرما تو سننے اور جاننے والا ہے۔ (آل عمران۔35)

اولاد کو دین کیلئے وقف کرنا

انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی شریعت میں ایک طریقہ عبادت کا یہ بھی تھا کہ اپنی اولاد میں سے کسی بچے کو اللہ کے لئے مخصوص کر دیں یعنی اللہ کے دین کیلیۓ اس طرح وقف کر دیں کہ اس سے دنیا کی کوئی خدمت نہ لیں۔

حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ نے اسی قاعدہ کے مطابق اپنے حمل کے متعلق یہ منت مان لی کہ اس کو خاص بیت المقدس کی خدمت کے لئے رکھوں گی، دنیا کے کام میں نہ لگاؤں گی، مگر جب حمل سے لڑکی پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے افسوس کیا کہ لڑکی شاید دین کی خدمت کا کام نہ کر سکے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی برکت سے اس لڑکی کو نہ صرف قبول فرمالیا بلکہ اس کو خاص عالیشان مرتبہ عطا فرمادیا اور ساری دنیا کی عورتوں سے ممتاز کر دیا اور ایک خاص فضیلت عطا فرمادی۔

والدہ کو اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماں کو اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک لحاظ سے ولایت، سرپرستی اور اختیار حاصل ہے، کیونکہ اگر ماں کو بچے پر ولایت حاصل نہ ہوتی تو حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ نذر نہ مانتیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ ماں کو بھی حق ہے کہ اپنے بچے کا نام خود تجویز کر لے۔ (جصاص)

نو مولود کا نام

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ۔ (آل عمران۔36)

پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے۔ اور جو کچھ اس نے جنا ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے اور بیٹا بیٹی کی طرح نہیں ہوتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا۔۔۔ (آل عمران۔36)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت سے اور حدیث نبوی سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے بچے کا نام ولادت کے پہلے روز رکھنا چاہیے۔ لیکن حافظ ابن القیمؒ نے تمام احادیث پر بحث کر کے آخر میں لکھا ہے کہ پہلے روز، تیسرے روز یا ساتویں روز بھی نام رکھا جاسکتا ہے۔

تاہم اگر کوئی ان مخصوص ایام میں بچے کا نام نہیں بھی رکھ سکا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ بچے کے نام کیلیۓ دن کی تعیین صرف ایک مستحب عمل ہے۔

بچے کا نام پہلا تحفہ ہے جو والدین اولاد کو دیتے ہیں۔ لہٰذا نو مولود کا نام سوچ سمجھ کر رکھنا چاہیۓ۔ آج کل نئے نام یا یونیک نام کی تلاش میں بے معنی اور بعض دفعہ غلط مطلب کے حامل نام رکھ دیے جاتے ہیں۔ کوشش کی جائے کہ

بچے کا نام اسماء الحسنیٰ کی نسبت سے مثلاً عبد اللہ، عبد الرّحمٰن یا انبیاء کرامؑ یا صحابہ اور صحابیات کے نام پر یا کسی نیک ہستی کے نام پر رکھا جائے۔ یا کم از کم ایسا نام ہو جسکا کوئی مثبت معنیٰ ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نام کا بچے کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔

نومولود کی حفاظت کی دعا

وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (آل عمران۔35)

اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے بچا کر تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ (آل عمران۔36)

اس آیت میں پیدائش کے وقت بچے کی حفاظت کی دعا کا ذکر ہے: وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُھَابِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے بچا کر تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ام مریمؑ کی اس دعا کو قبول فرمایا۔

حدیث میں ہے کہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کو مس کرتا ہے (چھوتا) ہے۔ جس سے وہ روتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مس شیطان سے حضرت مریم علیہا السلام کو اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محفوظ رکھا۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)۔

اس حدیث کو بیان فرما کر حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں اگر تم چاہو تو تم بھی (بچے کی پیدائش پر) اس آیت کو پڑھ لو:

وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُھَابِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (آل عمران۔36)

بچوں کی حفاظت کیلئے دعائیں اور اعمال

قرآن و حدیث کے مطالعے سے اولاد اور بچوں کی حفاظت کی کئی دعائیں اور اعمال ملتے ہیں جن کا پابندی سے اہتمام کرنا چاہئے:

1۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا۔

2۔ آیت شفاء : وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ (الشعراء۔86)

3۔ مسنون دعا: أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ۔

میں ہر شیطان اور موذی جاندار اور ہر نظر بد سے اللہ کے کامل اور پر اثر کلمات کے ذریعے پناہ مانگتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ اس دعا کے ساتھ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کیلئے پناہ مانگا کرتے تھے۔

4۔ سورۃ الفاتحہ، آیۃ الکرسی، سورۃ اخلاص، معوذتین کی تلاوت بھی ایک مسنون عمل ہے۔

5۔ والدین کی اپنے بچوں کیلئے دعا: انسان اپنی فطرت کے باعث اولاد کی بیماری اور دکھ درد برداشت نہیں کر سکتا۔ بچوں کیلئے والدین کی دعا بہت کارگر ہوتی ہے کیونکہ اس دعا میں اخلاص ہوتا ہے۔ حدیث کے اندر بھی آتا ہے کہ والدین کی دعا اولاد کیلئے قبول ہوتی ہے۔ بے شمار ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ والدین کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اولاد کی لاعلاج بیماریوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بہت سے کاموں میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، وہی ذات بہتر جانتی ہے کہ بچے کی اس تکلیف میں کیا حکمت اور انجامِ کار کیا نتائج حاصل ہوں گے۔

6۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کثرت سے کریں، اور تہجد کے اوقات میں گڑگڑا کر دعا کیجیے۔

7۔ صدقہ وخیرات: صدقہ آفات اور بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ صدقہ وخیرات کا اہتمام باقاعدگی سے کرنا چاہیے۔

8۔ توبہ واستغفار ہر حال میں کرتے رہنا چاہیے، انسان گناہ گار ہوتا ہی ہے، بہترین خطاکار وہ ہے جو توبہ کرنے والا ہو۔

ام مریمؑ کی دعا کی قبولیت

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (آل عمران۔37)

تو پروردگار نے اس کو پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور اس کی بہترین نشوونما کا انتظام فرمادیا اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست اور کفیل بنادیا۔ زکریاؑ جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا پوچھتا مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔(آل عمران۔37)

حضرت زکریاعلیہ السلام کاتعارف

ام مریمؑ کی نذر کو اللہ تعالیٰ نے بخوشی قبول فرمالیا اور اسے بہترین پرورش اور نشوونما بخشی، ظاہری خوبی بھی عطافرمائی اور باطنی خوبی سے بھی نوازا اور اپنے نیک بندوں میں ان کی تربیت کرائی تاکہ علم، خیر اور دین سیکھ لیں، حضرت زکریا کو ان کا کفیل بنادیا۔ ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں یہ اس لئے کہ حضرت مریمؑ یتیم ہوگئی تھیں، لیکن دوسرے روایت میں ہے کہ قحط سالی کی وجہ سے ان کی کفالت کا بوجھ حضرت زکریانے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں وجوہات اتفاقاً آپس میں مل گئی ہوں۔ حضرت زکریاؑ حضرت مریمؑ کے خالو بھی تھے اور اپنے وقت کے پیغمبر بھی۔ اس لحاظ سے وہی سب سے بہتر کفیل بن سکتے تھے جو حضرت مریم علیہاالسلام کی مادی ضروریات اور علمی واخلاقی تربیت کے تقاضوں کا صحیح اہتمام کرسکتے تھے۔ چونکہ زکریاعلیہ السلام حضرت مریم علیہاالسلام کے خالو بھی تھے اس لحاظ سے حضرت مریم گویا اپنی خالہ کے گھر اور ان کی پرورش میں تھیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم صاحبزادی عمرہ کو ان کی خالہ حضرت جعفر بن ابوطالب کی بیوی کے سپرد کیا تھا اور فرمایا تھا کہ: خالہ قائم مقام ماں کے ہے۔

محراب سے کیا مراد ہے؟

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَۙ: اس آیت میں محراب کا ذکر ہے۔ محراب کے لفظ سے لوگوں کا ذہن بالعموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں سے محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انہیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔

زکریاؑ کی نیک اولاد کے حصول کی دعا:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ۔

(آل عمران۔38)

اس وقت زکریانے اپنے پروردگار سے دعا کی کہا: اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطافرما بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ (آل عمران۔38)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دعا کرنا انبیاءؑ کی سنت ہے۔

ایک دوسری آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولقد ارسلنا رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا و ذریۃ۔(13-38)

یعنی بیویوں اور اولاد کی نعمت انبیاءؑ سابقین کو بھی دی گئی تھی۔اب اگر کوئی شخص شادی اور فیملی لائف سے اعراض کرے تو وہ نہ صرف فطرت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گا بلکہ انبیاءؑ کی ایک مشترک اور متفق علیہ سنت سے بھی محروم ہو گا۔حضور اکرم ﷺ نے نکاح اور اولاد کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ آپؐ نے اس شخص کو اپنی امت میں شامل نہیں کیا جو شادی اور اولاد سے باوجود قدرت کے اعراض کرتا ہو۔

چناچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

1۔النکاح من سنتی۔کہ نکاح شادی میری سنت ہے۔

2۔فمن ر غب عن سنتی فلیس منّی ۔جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہو گا۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو اولاد اور شریک حیات کے حصول اور ان کے نیک صالح ہونے کے لئے دعائیں کرتے ہیں: والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین۔(74:25)

یعنی اللہ کے فرمانبردار لوگ ایسے ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بیوی بچے ایسے عنایت فرما جنہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور قلب مسرور ہو۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرمؐ سے ام سلیمؓ نے درخواست کی کہ آپؐ اپنے خادم انس کے لئے کوئی دعا فرمائیں ۔تو آپؐ نے ان کے لئے ان الفاظ میں دعا کی: اللھم اکثر مالہ و ولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ۔

یعنی اے اللہ اس (انس) کے مال اور اولاد میں اضافہ فرما اور اس چیز میں برکت عطا کر جو کہ آپ نے اس کو عطا کی ہے ۔

اسی دعا کا اثر تھا کہ حضرت انسؓ کو اللہ نے کثرت اولاد سے نوازا اور انہیں اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت بھی عطا فرمائی۔

حاصل دعا: حضرت یحییٰ علیہ السلام

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِى الْمِحْرَابِۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (آل عمران۔39)

پس فرشتوں نے انہیں آواز دی، جب وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا سردار، ضبط نفس کرنے والا (پاکیزہ کردار) اور خاص نیکوکار بندوں میں سے نبی ہوگا۔(آل عمران۔39)

حضرت مریمؑ کی پرورش کے دوران ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں (بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود) یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ انہیں بھی اسی طرح اولاد سے نواز دے۔ چنانچہ بے اختیار دعا کے لئے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں اُٹھ گئے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا۔

لمحہ قبولیت: حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے کہ بعض لمحات دعا کی قبولیت کے ہوتے ہیں لہٰذا کبھی اپنے آپ کو، اپنی اولاد کو یا اپنی املاک کو بددعا نہ دو: لا تدعو علیٰ انفسکم، ولا تدعو علیٰ اولادکم، ولا تدعو علیٰ اموالکم۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔

سیّد کے معنی حلیم، بردبار، شریف اور کریم کے ہیں۔ علم وعبادت میں بڑھا ہوا، متقی، پرہیزگار، فقیہ، عالم، خلق ودین میں سب سے افضل جسے غصہ اور غضب مغلوب نہ کرسکے۔(ابن کثیر)

حصوراً کے معنی ہیں پاکیزہ کردار، گناہوں سے پاک، ایسا پارسا جس کا گناہ کی طرف خیال بھی نہ جائے۔

اللہ کیلئے کوئی چیز مشکل نہیں

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ (آل عمران۔40)

اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(آل عمران۔40)

اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کرو

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۔ (آل عمران۔41)

اپنے رب کو کثرت کے ساتھ یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔(آل عمران۔41)

حضرت زکریا علیہ السلام اولاد کی خوشخبری ملنے پر بہت خوش ہوئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بطور شکرانہ کثرت سے صبح شام اللہ کی تسبیح کیا کرو تا کہ انعامات الٰہی کا شکر ادا ہو۔ یہ گویا سبق دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری

طلب کے مطابق تمہیں نعمتوں سے نوازدے تو اسی حساب سے اس کا شکر بھی زیادہ سے زیادہ کرو۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا گیا: لئن شکرتم لازیدنکم۔۔۔ اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں مزید عطا کروں گا۔

تیرہواں رکوع: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ۔۔۔ (آل عمران۔42)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

فرشتوں کا حضرت مریمؑ سے خطاب، مریمؑ کا مقام و مرتبہ، عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش، عیسیٰؑ کے معجزات، عیسیٰؑ کی تعلیمات، تمام انبیاءؑ کا مشن ایک ہی تھا، عیسیٰؑ کے حواری، حواریوں کی دعا۔

فرشتوں کا مریم علیہ السلام سے خطاب

حضرت مریم علیہا السلام کا مقام و مرتبہ

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (آل عمران۔42)

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کر دیا اور سارے جہان کی عورتوں میں سے تیرا انتخاب کر لیا۔(آل عمران۔42)

اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریم علیہا السلام کو فرشتوں نے خبر پہنچائی کہ اللہ نے انہیں ان کی کثرت عبادت، ان کی دنیا سے بے رغبتی، شرافت اور شیطانی وسوسوں سے دوری کی وجہ سے اپنا قرب خاص عنایت فرمادیا ہے، اور تمام جہان کی عورتوں پر انہیں خاص فضیلت دے رکھی ہے۔

پانچ افضل ترین خواتین:

احادیث کی روشنی میں پانچ خواتین اسلام کی خصوصی فضیلت اور مقام ہے:

1۔ حضرت مریمؑ بنت عمران

2۔ امّ المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ

3۔ حضرت فاطمہ بنت محمد ﷺ

4۔ آسیہؓ۔ فرعون کی بیوی

5۔امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

رب کی بندگی اور اطاعت کا حکم

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ

اے مریم! اپنے رب کی بندگی کرنا اور سجدہ کرنا اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنا۔(آل عمران۔43)

یہاں حضرت مریمؑ کو اپنے رب کی بندگی اور اطاعت خصوصاً باجماعت نماز کا حکم دیا جارہا ہے۔

عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (آل عمران۔45،46)

فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری دیتا ہے اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا، دنیا اور آخرت میں معزز ہو گا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے ماں کی گود میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ نیک لوگوں میں سے ہو گا۔(آل عمران۔45،46)

عیسیٰ عجمی زبان کا لفظ ہے، بعض کے نزدیک یہ عربی ہے اور عاس یعوس سے مشتق ہے جس کے معنی سیادت و قیادت کے ہیں۔

مسیح مسح سے ہے یعنی کثرت سے زمین کی سیاحت کرنے والا یا اس کے معنی ہاتھ پھیرنے والا ہے کیونکہ آپ ہاتھ پھیر کر مریضوں کو باذن اللہ شفایاب فرماتے تھے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مسیح اصل میں عیسیٰ علیہ السلام کا ٹائیٹل تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ ان کی معجزانہ ولادت اللہ کے کلمہ کن کی تخلیق ہے۔ چونکہ ان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرق عادت کے طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کو قرآن مجید میں كَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ کہا گیا ہے۔ یہ معجزانہ ولادت عام انسانی اصول کے برعکس باپ کے بغیر ہوئی۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گھوارے میں گفتگو کرنے کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ مریم میں بھی موجود ہے اس کے علاوہ صحیح بخاری کی حدیث میں دو اور بچوں کا بھی ماں کی گود میں باتیں کرنے کا ذکر ہے۔

وَكَهْلًا: ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا مطلب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ بڑے ہو کر وحی اور رسالت سے سرفراز کئے جائیں گے اور بعض نے کہا ہے کہ آپ کا قیامت کے قریب جب آسمان سے نزول ہو گا جو صحیح اور متواتر احادیث سے ثابت ہے تو اس وقت جو وہ اسلام کی تبلیغ کریں گے وہ کلام مراد ہے۔(تفسیر ابن کثیر و قرطبی)

عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ۔ (آل عمران۔49)

اور وہ (عیسیٰؑ) بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا (ان سے کہے گا) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پتلا) بناتا ہوں پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے، اور میں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو شفایاب کرتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کر دیتا ہوں، اور جو کچھ تم کھا کر آئے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو میں تمہیں (وہ سب کچھ) بتا دیتا ہوں، بیشک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔(آل عمران۔49)

اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہو رہا ہے:

اخلق لکم: خلق یہاں پیدائش کے معنی میں نہیں ہے، اس پر تو صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے کیونکہ وہی خالق ہے یہاں اس کے معنی ظاہر شکل و صورت گھڑنے اور بنانے کے ہیں۔

باذن اللہ: اللہ کے حکم سے کہنے سے مقصد یہی ہے کہ کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ میں خدائی صفات یا اختیارات کا حامل ہوں بلکہ میں تو اس کا عاجز بندہ ہوں اور رسول ہی ہوں یہ جو کچھ میرے ہاتھ پر ظاہر ہو رہا ہے معجزہ ہے جو محض اللہ کے حکم سے صادر ہو رہا ہے۔

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے زمانے کے حالات کے مطابق خاص معجزات عطا فرمائے تاکہ اس کی صداقت ہو اور بالاتری نمایاں ہو سکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا بڑا چرچا تھا اور جادوگروں کی بڑی قدر و تعظیم تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ معجزہ دیا کہ جس کے سامنے بڑے بڑے جادوگر اپنا کرتب دکھانے میں ناکام رہے۔ جس سے تمام جادوگروں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان پر حیرت طاری ہوگئی اور انہیں کامل یقین ہو گیا کہ یہ تو الہ واحد وقہار کی طرف سے عطیہ ہے جادو ہرگز نہیں اسی وجہ سے وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور بالآخر اللہ کے مقرب بندے بن گئے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں طب اور حکمت کا بڑا چرچا تھا۔ پوری دنیا میں کامل اطباء، ماہر حکیم اور کامل الفن استاد موجود تھے پس آپ کو وہ معجزے دے گئے جس سے وہ سب عاجز تھے۔ بھلا مادر زاد اندھوں کو بالکل بینا کر دینا اور کوڑھیوں کو اس مہلک بیماری سے اچھا کر دینا، جمادات جو محض بے جان چیز ہے اس میں روح ڈال دینا اور قبروں میں سے مردوں کو زندہ کر دینا یہ کسی کے بس کی بات نہیں؟ صرف اللہ سبحانہ کے حکم سے بطور معجزہ یہ باتیں آپ سے ظاہر ہوئیں۔

ہمارے پیغمبر نبی کریم ﷺ کا دور شعر و ادب اور فصاحت بلاغت اور بلند خیالی، بول چال میں لطافت کا زمانہ تھا۔ اس فن میں بلند پایہ شاعروں نے وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ دنیا ان کے قدموں پر جھکتی تھی پس حضورؐ کو قرآن جیسا فصیح و بلیغ اور پر اعجاز کلام عطا فرمایا گیا جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا بھر کے ادباء و شعراء عاجز رہے اور چیلنج کے باوجود سب ان سب کی ہمتیں پست ہو گئیں، گلے خشک ہو گئے، زبانیں گنگ ہو گئیں اور آج تک ساری دنیا اس جیساء کلام پیش کرنے سے عاجز رہی۔

عیسیٰؑ کی تعلیمات

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ (آل عمران۔50۔51)

اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو اِس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی

لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ (آل عمران۔50۔51)

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ: اس سے مراد وہ چیزیں جو تورات کے علماء نے اجتہاد کے ذریعے سے خود بخود اپنے اوپر حرام کرلی تھیں۔ چونکہ اس اجتہاد میں ان سے غلطی کا ارتکاب ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس غلطی کا ازالہ کر کے انہیں حلال قرار دے دیا۔ یعنی تمہارے جہلا کے توہمات، تمہارے فقیہوں کی قانونی موشگافیوں، تمہارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشددات، اور تمہارے ہاں اصل شریعت الٰہی پر جن قیود کا اضافہ ہو گیا ہے، میں ان کو منسوخ کروں گا اور تمہارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں گا جنہیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ: یعنی اللہ کی عبادت کرنے میں، میں اور تم برابر ہیں۔ اس لئے سیدھا راستہ صرف یہ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی واحدانیت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

تمام انبیاءؑ کا مشن ایک ہی تھا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاءؑ کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے:

1۔ صرف اللہ کی بندگی اور عبادت

2۔ اللہ کے نبی کی اطاعت

3۔ یہ کہ انسانی زندگی میں حلت وحرمت اور جائز وناجائز اللہ کے دین کے مطابق ہونا چاہئے۔

اس لحاظ سے درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ اور دوسرے تمام انبیا کے دعوتی مشن میں فرق نہیں ہے۔

عیسیٰؑ کے حواری

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران۔52)

جب عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا انکار محسوس کیا تو کہا کہ اللہ کی راہ میں کون میرا مدد گار ہے؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کی مدد کرنے والے ہیں۔ ہم اللہ پر یقین لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان (فرمانبردار) ہیں۔ (آل عمران۔52)

حواری کا کیا مطلب ہے؟

حواری کہتے ہیں مددگار کو۔ لفظ حواری، حور سے ماخوذ ہے جس کے معنی لغت میں سفیدی کے ہیں۔ حواری کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں انصار کا مفہوم ہے۔ اصطلاح میں حضرت عیسیٰؑ کے مخلص ساتھیوں کو ان کے اخلاص اور صفائی قلب کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے حواری کا لقب دیا گیا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو صحابی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ آپؐ پر ایمان لانے والوں اور آپؐ کی صحبت میں رہنے والوں کو صحابہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایماندار ساتھیوں کو حواری کہا جاتا ہے۔ کبھی لفظ حواری مطلقا مددگار اور مخلص ساتھی کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ بائیبل میں بالعموم حواریوں کے بجائے شاگردوں کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

عیسیٰؑ کے حواریوں اور انصار مدینہ کا موازنہ

جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بھی ابتداء میں جب قریش آپ کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے تو آپؐ نے حج کے موسم میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بننے پر آمادہ کیا تاکہ دعوت دین میں وہ آپ کے ہمنوا بن سکیں۔ اس دعوت پر انصار مدینہ نے لبیک کہا اور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کی نصرت کا وعدہ کیا جس کے نتیجے میں ہجرت مدینہ ہوئی۔ ہجرت کے بعد اس نصرت، تائید، ایثار، ہمدردی، اور خیر خواہی کی بہترین مثال مواخات مدینہ ہے۔

اسی طرح یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے مدد طلب فرمائی۔ لیکن اس سے مراد وہ مدد نہیں ہے جو مافوق الاسباب طریقے سے طلب کی جاتی ہے کیونکہ وہ تو شرک ہے اور ہر نبی شرک کے سدباب ہی کے لئے آتا رہا ہے پھر وہ خود شرک کا ارتکاب کس طرح کر سکتے تھے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داعیان دین کو اپنی دعوت کو پھیلانے میں جائز اسباب کے اختیار کرنے پر کوئی ممانعت نہیں۔

صحابی رسولؐ حضرت زبیر کیلئے حواری کا ٹائیٹل

جنگ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہے کوئی جو سینہ سپر ہو جائے؟ اس آواز کو سنتے ہی حضرت زبیر تیار ہو گئے آپ نے دوبارہ یہی فرمایا پھر بھی حضرت زبیر نے ہی قدم اٹھایا پس حضور ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کا کوئی حواری یعنی مخلص ساتھی ہوتا ہے، میرے حواری زبیر ہیں۔ (بخاری، مسلم)

حواریوں کی دعا

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۔ (آل عمران۔53)

اے پروردگار جو (کتاب) تونے نازل فرمائی ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور (تیرے) رسول کی اتباع کی لہٰذا ہمیں (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔ (آل عمران۔53)

چودھواں رکوع: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ۔۔ (آل عمران۔55)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

عیسیٰؑ کا رفع آسمانی، ایمان و عمل صالح کا اجر، قرآن: حکمت والی نصیحت، عیسیٰؑ اور آدمؑ کی تخلیق کا موازنہ، وفد نجران کے سوالوں کا جواب، مباہلہ کی دعوت، سچی اور حق بات۔

عیسیٰ علیہ السلام کا رفع آسمانی

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (آل عمران۔55)

جس وقت اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے اُن سے (یعنی ان کے ماحول سے) تجھے پاک کر دوں گا۔ اور جو لوگ تیرے تابعدار ہوں گے انہیں تیرا انکار کرنے والوں پر قیامت کے دن تک غالب رکھنے والا ہوں۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس ہی آنا ہے، اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ (آل عمران۔55)

وفات کے لفظ سے ہمیشہ موت ہی مراد نہیں ہوتا۔ انسان کی موت پر جو **وفات** کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس لئے کہ اس کے جسمانی اختیارات مکمل طور پر سلب کر لئے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وفات جسمانی اختیارات کے صلب ہونے کی مختلف صورتوں میں سے محض ایک صورت ہے۔ **نیند** میں بھی چونکہ انسانی اختیارات عارضی طور پر معطل کر

دیئے جاتے ہیں اس لئے نیند پر بھی قرآن نے وفات کے لفظ کا اطلاق کیا ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔۔۔ (الزمر۔42)۔ اس وجہ سے نیند کو وفات اصغر یا عارضی موت بھی کہا جاتا ہے۔ کئی احادیث میں بھی نیند کو عارضی موت کے ساتھ تشبیہ دی گئی جیسے سونے کی مسنون دعا میں ذکر ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وفات کے لفظ کا مطلب صرف موت ہی نہیں ہوتا۔ لغت میں وفات کے معنی پورا پورا لینے کے بھی آتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اے عیسیٰ تجھے میں قتل یا صلب کی سازش سے بچا کر پورا پورا اپنی طرف آسمانوں پر اٹھا لونگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور پھر جب دوبارہ دنیا میں نزول ہو گا تو اس وقت موت سے ہمکنار کروں گا۔

ایمان اور عمل صالح کا اجر

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔ (آل عمران۔56)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے انہیں ان کا حق پورا پورا دے گا، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔۔(آل عمران۔56)

قرآن: حکمت والی نصیحت

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ۔ (آل عمران۔56)

یہ جسے ہم تیرے سامنے پڑھ رہے ہیں آیتیں ہیں اور حکمت والی نصیحت ہے۔(آل عمران۔56)

عیسیٰ اور آدمؑ کی تخلیق کا موازنہ

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران۔56)

بیشک عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے، اسے مٹی سے بنایا پھر اسے کہا کہ ہو جا، پھر وہ ہو گیا۔(آل عمران۔56)

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہے کہ آدم کو بغیر مرد و عورت کے پیدا کیا اور حوا کو صرف مرد سے بغیر عورت کے پیدا کیا، اور عیسیٰ کو صرف عورت سے بغیر مرد کے پیدا کر دیا اور باقی مخلوق کو مرد و عورت سے پیدا کیا۔ (ابن کثیر)

نجران کے عیسائی وفد کی مسجد نبویؐ آمد

سورۃ آل عمران کی ابتداء سے یہاں تک کی تمام آیتوں کے نزول کا سبب نجران کے نصاریٰ کا وفد تھا۔ یہ ساٹھ افراد کا وفد جس میں بڑے بڑے پادری اور بشپ شامل تھے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت عصر کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ وفد میں شامل کچھ افراد دل سے آپؐ کی نبوت کے قائل اور آپؐ کی صفات اور شان سے واقف تھے کیونکہ اگلی کتابوں میں آپؐ سے متعلق پڑھ چکے تھے لیکن اپنے مذہب کے ماحول میں جو ان کی تکریم و تعظیم تھی اور وہاں جو جاہ و منصب انہیں حاصل تھا اس کے چھن جانے کے خوف سے راہ حق کی طرف آنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ حضورؐ کے ساتھ اس وفد کی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ لوگ حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی تردید اور ان کے جواب میں سورۃ آل عمران کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

مذہبی رواداری کی اعلیٰ ترین مثال

نبی اکرم ﷺ سے ملاقات کے دوران اس مہمان عیسائی وفد کی عبادت کا وقت آ گیا تو انہوں سے آپؐ سے اجازت طلب کی کہ اگر آپؐ اجازت دیں تو ہم یہیں اپنی عبادت کر لیں۔ آپؐ نے رواداری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرتے ہوئے اس کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ گھر رب کی عبادت کیلئے ہی ہے جس کے بعد انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے مسجد نبویؐ میں ہی اپنے طریق پر نماز ادا کر لی۔

مباہلہ سے کیا مراد ہے؟

فقل تعالوا ندع۔۔۔ (آل عمران۔56): اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو مباہلہ کرنے کی ہدایت دی گئی۔ جس کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی امر کے حق و باطل میں فریقین میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب ملکر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں باطل پر ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت پڑے، لعنت کے معنی رحمت حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر

سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہو گا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ اس طور پر دعا کرنے کو مباہلہ کہتے ہیں۔

مباہلہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفد نجران حضور ﷺ کے دلائل سننے کے بعد بھی جان بوجھ کر انکار، ضد اور ہٹ دھرمی کر رہا ہے جس کے پس منظر میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ دوران گفتگو جو دلائل دیے گئے تھے ان میں سے کسی کا بھی جواب ان لوگوں کے پاس نہ تھا۔ اپنے عقائد و نظریات میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ واقعی دین الٰہی کے عین مطابق ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو چکے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے ساتھ دعا کرو کہ جو سچا نہ ہو اور حق پر نہ ہو تو اس پر اللہ کی طرف سے ہلاکت اور وبال نازل ہو، تو ان ساٹھ مذہبی پیشواؤں میں سے کوئی ایک بھی اس دعا کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام دنیا کے سامنے واضح ہو گئی کہ نجرانی وفد کے مذہبی پیشواء جن کے تقدس کا سکہ اور شہرت چاروں اطراف پھیلی ہوئی تھی دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جو خود ان کی نظر میں مشکوک ہو چکے ہیں اور کی صداقت پر خود انہیں بھی مکمل اعتماد اور یقین نہیں ہے۔

سچی اور حق بات

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔(آل عمران۔62)

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک اللہ ہی غالب ہے اور حکمت والا ہے۔(آل عمران۔62)

پندرہواں رکوع: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔۔۔ (آل عمران۔64)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اتحاد بین المذاہب کیلئے ڈائیلاگ، اہل کتاب سے مکالمہ، حتمی علم اللہ کے پاس، حق وباطل، جھوٹ اور سچ کی آمیزش نہ کرو، جان بوجھ کر حق نہ چھپاؤ۔ سیرت ابراہیمؑ کے اہم پہلو۔ دین حنیف کے علمبردار

اتحاد بین المذاہب کیلئے ڈائیلاگ

اہل کتاب کے ساتھ مکالمہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران۔64)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو اپنا رب نہ بنائے پس اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو فرمانبردار ہونے والے ہیں۔ (آل عمران۔64)

اس آیت (تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم) سے دعوت و تبلیغ کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ ﷺ نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر۔

فقولو اشهدوا بانا مسلمون: اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ تم گواہ رہو، اس سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہیئے، مزید بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

اس آیت سے مکالمہ بین المذاہب کے حوالے سے ہدایت اور رہنمائی ملتی ہے:

وسیع البنیاد اتحاد کے اساسی نکات

اس آیت میں تین نکات:

1۔ صرف اللہ کی عبادت کرنا۔

2۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔

3۔ کسی کو شریعت سازی کا خدائی مقام نہ دینا۔

لہٰذا کسی بھی وسیع البنیاد بین المذاہب اتحاد کیلئے ان تینوں نکات کو اساس و بنیاد بنانا چاہیے۔

اتحاد امت، اتحاد بین المسالک یا اتحاد بین المسلمین کیلئے بھی ان اصولوں سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق آپ ﷺ نے ہرقل شاہ روم کو مکتوب تحریر فرمایا اور اس میں اسے اس آیت کے حوالے سے قبول اسلام کی دعوت دی اسے کہا اگر تو اسلام قبول کرلے گا تو تجھے دوہرا اجر ملے گا ورنہ ساری رعایا کا گناہ تجھ پر ہو گا۔

یہی دعوت تمام انبیاء کرام کی تھی، جیسے فرمان ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔(الانبیاء:25) یعنی تجھ سے پہلے جس جس رسول کو ہم نے بھیجا سب کی طرف یہی وحی کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کیا کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔(النحل:36) یعنی ہر امت میں رسول بھیج کر ہم نے یہ اعلان کروایا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی اطاعت سے اجتناب کرو۔

ابن جریج فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ایک دوسرے کی اطاعت نہ کریں۔

بغیر علم کے فضول بحث نہ کرو، حتمی علم اللہ کے پاس ہی ہے

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حٰجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔66)

تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے تھے اس میں بحث مباحثہ کر چکے ہو پھر اب اس بات میں کیوں بحث و تکرار کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں؟ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔(آل عمران۔66)

حق و باطل، جھوٹ اور سچ کی آمیزش نہ کرو، جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔71)

اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کے ساتھ مشتبہ کرتے ہو اور جانتے ہوئے حق کی پردہ پوشی کرتے ہو۔ (آل عمران۔71)

سولھواں رکوع: وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ۔۔۔ (آل عمران۔72)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ کا فضل، اللہ وسیع النظر ہے (واللہ واسع علیم)، اللہ کی رحمت خاص، غیر مسلموں کے اچھے اوصاف کی تعریف، عہد کی پاسداری اور تقویٰ، ایفائے عہد کی تاکید، محبت الٰہی کا اصول (فانّ اللہ یحب المتقین)، دین فروشی اور جھوٹے دعوے، کتاب اللہ کی غلط تاویل اور تحریف کرنے والے لوگ، رب کے بندے بنو (کونو ربّانیین)۔

اللہ کا فضل

اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ (آل عمران۔73)

فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے وہ عطا فرمائے۔ آل عمران۔73

دین اللہ کا فضل ہے اور یہ کسی کی میراث نہیں۔ وہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اللہ وسیع النظر ہے

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (آل عمران۔73)

اللہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ (آل عمران۔73)

اصل میں لفظ واسع یعنی وسیع النظر استعمال ہوا ہے جو قرآن میں تین مواقع پر آیا ہے۔

1۔ ایک وہ موقع جہاں انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اسے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمہاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔

2۔ دوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمہاری طرح بخیل نہیں ہے۔

3۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے خیالات کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انہیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔

اللہ کی رحمت خاص

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ (آل عمران۔74)

وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے۔(آل عمران۔74)

غیر مسلموں کے اچھے اوصاف کی تعریف

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۔۔۔ (آل عمران۔75)

بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر تو انہیں خزانے کا امین بنادے تو بھی وہ واپس کر دیں۔۔۔(آل عمران۔75)

یہ آیت امانت کی واپسی کی اہمیت سے متعلق ہے۔

اس آیت میں امانت دار غیر مسلموں کی تعریف کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم کے اچھے اوصاف کی مدح کرنا درست ہے۔اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ کھلے دل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی اس کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے۔یہ ایک اسلامی ضابطہ ہے کہ معاشرتی معاملات میں امانت، دیانت، انصاف، سچائی، حسن سلوک سب کے ساتھ کرنا چاہیے۔اسی طرح بددیانتی، دھوکہ، فراڈ، ناانصافی، جھوٹ، بدسلوکی، ظلم چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم کسی کے ساتھ بھی جائز نہیں۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ بعض لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ مشرکین عرب چونکہ مشرک ہیں ہیں اس لئے ان کا مال ہڑپ کر لینا جائز ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کا مال ناحق غصب کرنے کی کیسے اجازت دے سکتا ہے۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: امانت ہر صورت میں ادا کی جائے گی چاہے وہ کسی نیکوکار کی ہو یا بدکار کی۔(ابن کثیر و فتح القدیر)

خیبر کے چرواہے کو ہدایت: بکریاں اپنے مالک کو واپس کرو

غزوہ خیبر کے موقع پر ایک چرواہا حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا۔وہ یہودیوں کی بکریاں چراتا تھا اس چرواہی نے جب دیکھا کہ خیبر کے باہر مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کے ان سے ملاقات کروں اور دیکھوں یہ مسلمان کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔یہ تفصیلی واقعہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس نے

آپ ﷺ سے ملاقات کی، کچھ سوالات کیے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا تم جو بکریاں لے کر آئے ہو پہلے ان کو اپنے مالک کو واپس کرو، پھر ہمارے ساتھ شامل ہو۔ اس لئے کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ جس کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ ان کے مال کے اندر بھی حضورؐ نے خیانت کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ چرواہا بکریاں معاہدے پر لے کر آیا تھا اس لیئے آپؐ نے حکم دیا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کر کے آئے پھر مسلمان ہو کر ہمارے ساتھ شامل ہو۔

خیبر کی مہم کے موقع پر ہی ایک اور واقعہ ہوا۔ خیبر کے کچھ یہود آپؐ کی خدمت میں شکایت لے کر آئے کہ کچھ مسلمانوں نے ان کے جانور لوٹے اور پھل توڑے ہیں۔ نبی کریمؐ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ تم بغیر اجازت کسی کے گھر گھس جاؤ اور پھل توڑو۔ (ابو داؤد)

پھر ایک روایت میں آتا ہے فتح خیبر کے دوران تورات کے بعض نسخے مسلمانوں کو ملے۔ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہماری کتاب مقدس ہمیں واپس کی جائے۔ حضورؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ یہود کی مذہبی کتابیں ان کو واپس کر دو۔

افسوس ہے کہ آج کل بعض مسلمان یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کا مال غصب کرنے میں یا کسی غیر مسلم بنک سے قرض لے کر واپس نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ نظریہ قطعاً درست نہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات واضح ہیں کہ قرض یا مال کسی سے بھی لیا جائے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم تو اس کی واپسی ضروری ہے۔

دینار کا مطلب

ابن ابی حاتم میں حضرت مالک بن دینار کا قول مروی ہے کہ دینار کو اس لئے دینار کہتے ہیں کہ وہ دین یعنی ایمان بھی ہے اور نار یعنی آگ بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ حق وانصاف کے ساتھ لو تو دین، ناحق یا کسی کی حق تلفی کر کے لو تو نار یعنی آتش دوزخ۔

عہد کی پاسداری اور تقویٰ

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ (آل عمران-76)

عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے، جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے، بخلاف وعدہ کے کہ وہ ایک طرف سے ہوتا ہے۔

اس آیت میں عہد پورا کرنے کا مطلب ہے کہ وہ عہد پورا کرے جو اہل کتاب سے یا ہر نبی کے واسطے سے ان کی امتوں سے نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کی بابت لیا گیا ہے۔ اور پرہیزگاری کرے یعنی اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچے اور ان باتوں پر عمل کرے جو نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمائیں۔ ایسے لوگ یقیناً مواخذہ الٰہی سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ محبوب باری تعالیٰ ہونگے۔

قرآن وسنت میں ایفائے عہد کی تاکید

ایفائے عہد کی قرآن وسنت میں بہت تاکید آئی ہے۔

دین فروشی اور جھوٹا دعویٰ

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِيْمٌ۔ (آل عمران۔77)

بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر معاوضہ لیتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور ان سے اللہ کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان کی طرف نہ دیکھے گا اور انہیں پاک بھی نہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔(آل عمران۔77)

اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر ہے:

1۔ دنیاوی مفاد کیلئے اللہ کے عہد (دین) کو بیچ دینا۔

2۔ جھوٹی قسم یا جھوٹا دعویٰ کر کے اپنا سودا بیچنا یا کسی کا مال ہڑپ کر جانا۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ، لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، لَقِيَ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ۔ کہ جو شخص کسی کا مال ہتھیانے کے لئے جھوٹی قسم کھائے وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر غضب ناک ہو گا۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ مَنَعَ ابْنَ السَّبِيلِ فَضْلَ مَاءٍ عِنْدَهُ، وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلَى سِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ يَعْنِي كَاذِبًا وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا، فَإِنْ أَعْطَاهُ وَفَى لَهُ، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ لَمْ يَفِ لَهُ۔

تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہو گا ان میں ایک وہ شخص ہے جو جھوٹی قسم کے ذریعے سے اپنا سودا بیچتا ہے۔ (مسند احمد)

حدیث: احادیث میں آتا ہے کہ کندہ قبیلے کے ایک شخص امرو القیس بن عامر کا جھگڑا ایک حضرمی شخص سے زمین کے بارے میں تھا جو حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ حضرمی اپنا ثبوت پیش کرے اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا تو آپؐ نے فرمایا اب کندی قسم کھالے۔ اس پر حضرمی کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ جب اس کی قسم پر ہی فیصلہ ٹھہرا تو رب کعبہ کی قسم یہ تو قسم کھالے گا اور میری زمین لے جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص جھوٹی قسم سے کسی کا مال لے گا تو جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا اللہ اس سے سخت ناراض ہونگے پھر آنحضرت ﷺ نے اس آیت (آل عمران۔77) کی تلاوت فرمائی تو امرو القیس نے کہا یا رسول اللہ اگر تو کوئی اپنا حق چھوڑ دے تو اسے کیا اجر ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جنت، تو کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ آپ گواہ رہیے کہ میں نے وہ ساری زمین چھوڑ دی اور اپنے حق سے دستبردار ہو گیا۔ (مسند احمد، نسائی)

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: أَنا زَعِيمٌ ببيتٍ في ربَضِ الجنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ المِراءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَببيتٍ في وَسَطِ الجنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الكَذِبَ وإِن كَانَ مازِحًا، وَببيتٍ في أَعلَى الجَنَّةِ لِمَن حَسُنَ خُلُقُهُ۔

ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اس شخص کے لیے جنت کے اطراف میں گھر دیے جانے کی ضمانت دیتا ہوں جو حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا چھوڑ دے اور اس شخص کے لیے جنت کے درمیان میں گھر کا ضامن ہوں جو مذاق میں بھی جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور اس شخص کے لیے جنت کے بالائی حصے میں گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو اچھے اخلاق کا مالک بن جائے۔ (ابو داؤد)

کتاب اللہ کی غلط تاویل اور تحریف کرنے والے لوگ

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔78)

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی

طرف سے ہے، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔(آل عمران۔78)

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے کتاب الٰہی یعنی تورات میں نہ صرف بد دیانتی و تبدیلی کی بلکہ دو جرم بھی کئے ایک تو زبان کو مروڑ کر کتاب کے الفاظ پڑھتے جس سے عام لوگوں کو مختلف مفہوم و معانی کا تاثر دینے میں وہ کامیاب رہتے۔ زبان موڑنے سے مطلب یہاں تحریف اور غلط تاویل کرنا ہے دوسرا وہ اپنی خود ساختہ باتیں اللہ کی طرف منسوب کر کے بتاتے۔ اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

بد قسمتی سے امّت مسلمہ کے مذہبی پیشواؤں میں بھی نبی اکرم ﷺ کی پیشن گوئی کہ تم اپنے سے پہلی امتوں کی قدم بقدم پیروی کرو گے کے مطابق بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو عقیدے یا نظریے کی خرابی، جماعتی تعصب، فقہی جمود یا دنیوی اغراض کی وجہ سے قرآن کریم کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں۔ پڑھتے قرآن کی آیت ہیں اور مسئلہ اپنا خود ساختہ بیان کرتے ہیں۔ عوام سمجھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے مسئلہ قرآن سے بیان کیا ہے حالانکہ اس مسئلے کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا پھر آیات میں معنوی تبدیلی و تحریف سے کام لیا جاتا ہے تاکہ باور یہی کرایا جائے کہ یہ من عند اللہ ہے۔

رب کے بندے بنو

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَۙ۔ (آل عمران۔79)

کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ لیکن کہے گا کہ تم لوگ کے بندے بن جاؤ اس لیے کہ یہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔(آل عمران۔79)

یہ آیت اگرچہ ان لوگوں کے ضمن میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے پیغمبرؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ دے دیا تھا۔

حالانکہ وہ ایک انسان تھے جنہیں کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا بھلا وہ کیسے یہ دعویٰ کرسکتے تھے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے پجاری اور بندے بن جاؤ۔

ان آیات میں یہ قاعدہ کلیہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہر گز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

اس آیت کا مفہوم عام ہے جس کی رو سے یہ بھی تاکید کی جارہی ہے کہ آدمی اپنے نفس اور خواہشات کا غلام نہ بنے۔ اپنی ذات، برادری کا بندہ نہ بنے۔، مولوی صاحب اور پیر صاحب کا بندہ نہ بنے بلکہ بندگی اور عبادت صرف اپنے رب کی کرے۔ جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا گیا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔ اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے عالموں اور صوفیوں کو رب بنالیا۔(التوبہ:31)

یہ رب بنانا حدیث کے مطابق ان کے حلال کیے گئے کو حلال اور حرام کیے گئے کو حرام سمجھنا تھا۔

بقول شاعر:

؎ مستند ہے حضرت کا فرمایا ہوا

حدیث: الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعدالموت والعاجز من اتبع نفسہ ھواھا و تمنیٰ علی اللہ۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور بیوقوف اور سست وہ ہے جو اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرے اور اس کے باوجود اللہ سے امیدیں باندھتا رہے۔ ترمذی

تیسرے پارے کا آخری رکوع: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ۔۔۔ (آل عمران۔81)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

انبیاء سے عہد و میثاق، اللہ تعالیٰ کے تین عہد، دین واحد: دین اسلام۔ توبہ، اصلاح اور قبولیت، خاتمہ بالایمان کی اہمیت۔

انبیاء سے عہد و میثاق

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ (آل عمران۔81)

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ: آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا، "کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟" اُنہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں اللہ نے فرمایا، "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ (آل عمران۔81)

اللہ تعالیٰ کے تین عہد

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں۔

1۔ ایک عہد تمام بنی نوع انسان سے لیا گیا جس کو عہد الست کہتے ہیں جس کا ذکر سورۃ اعراف میں الست بربکم (172:7) کے تحت کیا گیا ہے۔ اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرا عہد علماء سے لیا تھا۔ یہ عہد اگرچہ اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ ہمیشہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے اور حق اور سچ کو نہیں چھپائیں گے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ۔۔۔ اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تھی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے صاف صاف بیان کرو گے اور (جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے) اسے نہیں چھپاؤ گے۔ (آل عمران۔187)

یہ حکم اگرچہ اہل کتاب کے علماء کو دیا گیا تھا مگر یہ حکم ہر دور کے علماء کیلئے ہے کہ حق کو چھپانا یا اس میں خلط ملط اور تلبیس کرنا حرام ہے۔ ہر دور کے علماء کو اس روش پر عمل کرنا چاہئے کہ کتمان حق نہ کریں یعنی وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔ آیت: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔۔ کا یہ بھی مطلب ہے کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں۔ سورۃ البقرۃ کے اندر فرمایا: وَلَا

تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔(البقرہ:42)

3۔ اللہ تعالیٰ نے تیسرا عہد انبیاء کرام سے لیا جس کا ذکر اس آیت کے اندر کیا جا رہا ہے۔

یعنی ہر نبی سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اس کی زندگی اور دور نبوت میں اگر دوسرا نبی آئے گا تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہو گا۔ جب نبی کی موجودگی میں آنے والے نئے نبی پر خود اس نبی کو ایمان لانا ضروری ہے تو ان کی امتوں کے لئے تو اس نئے نبی پر ایمان لانا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔

یہاں ایک اور بات سمجھ لینی چاہیے کہ محمد ﷺ سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد ﷺ سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

اس مفہوم کے لحاظ سے یہ بات واضح ہے کہ نبوت محمدیؐ کے سراج منیر کے بعد کسی بھی نبی کا چراغ نہیں جل سکتا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے اوراق پڑھ رہے تھے تو نبی اکرم ﷺ یہ دیکھ کر غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے لگ جاؤ تو گمراہ ہو جاؤ گے۔(مسند احمد)۔

اور ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰؑ نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی ہی کے احکام پر عمل کریں گے۔(تفسیر ابن کثیر)

یہی وجہ تھی کہ معراج والی رات بیت المقدس میں آپ ﷺ کو تمام انبیاء کی امامت کا شرف عطا کر کے امام الانبیاء کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اسی طرح میدان محشر میں بھی اللہ تعالیٰ کی فیصلوں کو انجام تک پہنچانے میں آپ ہی شفیع ہوں گے یہی وہ مقام محمود ہے جو آپ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ بہر حال اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ اب قیامت تک واجب الاتباع صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور نجات انہی کی اطاعت پر منحصر ہے۔ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم

دین واحد: دین اسلام

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔

کیا اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین تلاش کرتے ہیں حالانکہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چار وناچار اللہ ہی کی فرمانبر دار ہیں اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔ آل عمران۔83

دین اسلام۔تمام انبیاء کا دین

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران۔84)

کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ملا ہم ان میں سے کسی کو جدا نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبر دار ہیں۔(آل عمران۔84)

اللہ کے قابل قبول دین: دین اسلام

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (آل عمران۔85)

جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اللہ کے ہاں اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہو گا۔(آل عمران۔85)

کونسا اسلام مراد ہے؟

اسلام کے لفظی معنی اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں، اور اصطلاح میں خاص اس دین کی اطاعت کا نام اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ عقائد اور اصول دین تمام انبیاء کے ایک ہی ہیں۔ پھر لفظ اسلام کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء ﷺ پر نازل ہوئی۔ قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں۔ انبیاء سابقین کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی امت کو امت مسلمہ کہنا بھی نصوص قرآن سے ثابت ہے، اور اسلام کے نام کا خاتم الانبیاءؐ کی امت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

قرآن میں اس سلسلے میں ارشاد ہے: هو سمكم المسلمين من قبل وفى هذا۔(78:22)۔

خلاصہ یہ کہ ہر دین الٰہی جو کسی نبی اور رسول کے ذریعے دنیا میں آیا اس کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، اور امت محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس جگہ اسلام کے لفظ سے کونسا مفہوم مراد ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ انبیاء سابقین کے دین کو جو اسلام کا نام دیا گیا ہے وہ ایک محدود امت اور مخصوص زمانے کے لئے تھا، اسوقت کا اسلام وہی تھا۔ اسی سلسلہ دین کی آخری تعلیمات حضور اکرم کو دی گئیں۔ اس لحاظ سے دین محمدیؐ دراصل اسی سلسلہ اسلام کی آخری کڑی یا فائنل ورژن ہے جس کا آغاز پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے کیا گیا تھا۔

اب اسلام صرف وہ دین ہے جو آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے ہم تک پہنچا۔ اسی لئے احادیث کے اندر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آج اگر حضرت موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو اس وقت ان پر بھی میری ہی اتباع لازم ہوتی۔ اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قریب قیامت میں حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے، تو باوجود اپنے وصف نبوت اور عہدہ نبوت پر قائم رہنے کے اس وقت وہ بھی آپ ﷺ ہی کی شریعت کا اتباع کریں گے۔

اس لئے اس جگہ خواہ اسلام کا عام مفہوم مراد لیں یا آخری امت مسلمہ کا دین مراد لیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے بعد صرف وہی دین اسلام کہلائے گا جو آپؐ کے ذریعہ دنیا کو پہنچا ہے۔ وہی تمام انسانوں کے لئے مدار نجات ہے، آیت مذکورہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین جو شخص اختیار کرے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توبہ، اصلاح اور قبولیت

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کی تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ آل عمران۔ 89

آیت کا شان نزول: انصار میں سے ایک مسلمان دین اسلام چھوڑ کر اسلام کے بدترین مخالفین قریش مکہ سے جا ملا لیکن بعد میں اسے ندامت ہوئی اور اس نے لوگوں کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ تک پیغام بھجوایا کہ میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق پہچاننے کے بعد بغض، عناد اور سرکشی سے حق کا انکار کر دینا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے اور بغاوت کے جرم میں آتا ہے تاہم اگر کوئی خلوص دل سے توبہ اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے اس کی توبہ قابل قبول ہے۔

لیکن اگلی آیت میں ایک ایسی توبہ کا ذکر ہے جو اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ اس سے وہ توبہ مراد ہے جو موت کے وقت ہو یا موت کو سامنے دیکھ کر کی جائے جیسے فرعون کی توبہ جو اس نے غرق ہوتے وقت کی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ۔ (النساء:18) ان کی توبہ قبول نہیں ہے جو برائی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک کو موت آنے لگتی ہے تو کہتا ہے میری توبہ۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر۔ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس پر موت کی کیفیت طاری نہ ہو (یعنی جان نکلتے وقت کی توبہ قبول نہیں)۔(مسند احمد)

خاتمہ بالایمان کی اہمیّت

حدیث: انمّا الاعمال بالخواتیم،

بے شک اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے۔

حسن خاتمہ سے کیا مراد ہے؟

حسن خاتمہ یا اچھے انجام کا مطلب صرف یہ نہیں کہ آپ ضرور مسجد میں فوت ہوں، یا جائے نماز پر، یا آپ جس وقت فوت ہوں تو قرآن آپ کے ہاتھ میں ہو یا آپ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہوں۔

تمام مخلوقات میں سے بہترین حضرت محمد ﷺ جس وقت فوت ہوئے وہ اپنے بستر پر تھے۔

آپؐ کے دوست ابو بکر صدیق رضي اللہ عنہ جو صحابہ میں سے بہترین تھے وہ اپنے بستر پر فوت ہوئے۔

خالد بن الولید رضي اللہ عنہ جن کا لقب سیف اللہ تھا وہ اپنے بستر پر فوت ہوئے۔

لیکن حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ شرک سے پاک ہوں۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ نفاق سے پاک ہوں۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ آپ بدعتوں سے پاک ہوں۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ آپ قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوں۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ آپ کسی کے خون، مال اور عزت کے بوجھ سے ہلکے ہوں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے والے ہوں۔

حلال وحرام کی پابندی کرنے والے ہوں۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ آپ کا دل سلامت ہو نیت پاک ہو اور آپ حسن اخلاق پر ہوں۔ کسی کے لیے آپ کے دل میں کوئی بغض کینہ اور نفرت نہ ہو۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اس حال میں فوت ہوں کہ آپ فرائض کی پابندی اور گناہوں سے بچنے والے ہوں۔ نمازوں کو ان کے وقت پر ادا کرنے والے ہوں۔

خاتمہ بالایمان کی دعا:

اللهم أَحسنْ عاقبتَنا في الأمور كلِّها وأجِرْنا من خزي الدنيا وعذابِ الآخرة

اے اللہ پاک تمام کاموں میں ہمارا انجام اچھا کردے اور ہمیں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچالے۔

آمین یارب العالمین

پارہ - 4

قرآن مجید کا چوتھا پارہ سورہ آل عمران کی بقیہ آیات 92 تا 200 اور سورہ النساء کی پہلی 23 آیات پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔۔۔ (آل عمران۔92)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

نیکی کی اصل روح یعنی رضائے الٰہی کا حصول، پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دو، خود ساختہ حرام اشیاء، ملت ابراہیمیؑ کی پیروی، کعبۃ اللہ کی شان اور عظمت، بیت اللہ کی برکات، روئے زمین کی پہلی مسجد یعنی مسجد حرام، حج کی فرضیت، اعتصام باللہ یعنی اللہ کے دین پر قائم رہنا۔

پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دو

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے اور جو چیز تم خرچ کرو گے بے شک اللہ اسے جاننے والا ہے۔ (آل عمران 92)

صحابہ کرامؓ جو قرآنی احکام کے اولین مخاطب اور رسول کریم ﷺ کے بلاواسطہ شاگرد اور احکام قرآنی کی تعمیل کے عاشق تھے۔ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم نازل ہوتے ہی وہ فکر مند ہی نہیں مستعد بھی ہو گئے تھے۔ اس آیت کے نازل ہونے پر ہر ایک نے اپنی محبوب چیزوں پر نظر ڈالی اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ جن کے پاس مال نہ تھا انھوں نے محنت مزدوری کر کے صدقہ و خیرات دینا شروع کر دیا۔ غزوۂ تبوک کے وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انفاق کی بہترین مثال قائم کی۔

نیکی کی اصل روح

اس آیت میں نیکی کی اصل روح کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اصل نیکی محبت و رضائے الٰہی کے حصول کا نام ہے۔ اللہ سے ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی

غالب آجائے کہ وہ اسے خدا کی محبت پر قربان نہ کر سکتا ہو، بس وہی بت ہے اور جب تک آدمی اس بت کو نہ توڑے نیکی کی روح کو نہیں پہنچ سکتا۔ مالدار شخص کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ سے اس کا مال کم نہیں ہوتا بلکہ مال پاک ہوتا ہے اور بڑھتا ہے اور اس میں اضافہ اور برکت خود اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ آخرت کا اجر اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پسندیدہ مال سے کیا مراد ہے؟

آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ثواب عظیم اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کریں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرورت سے زائد فالتو مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب ہی نہ ملے، بلکہ آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے: وما تنفقوا من شیء فان اللہ بہ علیم۔ یعنی تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ آیت کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ کامل نیکی محبوب چیز خرچ کرنے پر موقوف ہے لیکن مطلق ثواب سے کوئی صدقہ خالی نہیں، خواہ محبوب چیز خرچ کریں یا زائد اور فالتو اشیاء۔ ہاں یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کر لے کہ جب خرچ کرے فالتو اور خراب چیز ہی کا انتخاب کر کے خرچ کرے، لیکن جو شخص صدقہ خیرات میں اپنی محبوب اور عمدہ چیزیں بھی خرچ کرتا ہے، اور اپنی ضرورت سے زائد چیزیں، بچا ہوا کھانا یا پرانے کپڑے، عیب دار یا استعمال شدہ چیزیں بھی خیرات میں دیدیتا ہے، وہ ان چیزوں کا صدقہ کرنے سے کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ اس کو ان پر بھی ضرور ثواب ملے گا۔

خودساختہ حرام اشیاء

آل عمران۔93-94

قرآن اور محمد ﷺ کی تعلیمات پر جب علماء اہل کتاب کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ انبیاء سابقین کی تعلیمات اور حضور اکرمؐ کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہ تھا) تو انہوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں۔

یہ آیات اہل کتاب کے اس اعتراض پر نازل ہوئیں کہ انہوں نے نبی اکرمؐ سے کہا کہ آپؐ دین ابراہیمی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اونٹ کا گوشت بھی کھاتے ہیں جب کہ اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ دین ابراہیمی میں (بقول ان کے) حرام تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا جارہا ہے کہ حضرت ابراہیم کے دین میں یہ چیزیں حرام ہی نہیں

تھیں۔ہاں البتہ اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ) نے کچھ چیزیں مثلاً اونٹ کا گوشت، دودھ خود اپنے اوپر ممنوع کرلیا تھا جس کی وجہ نذر یا بوجہ بیماری پرہیز یا طبعی کراہت تھی۔ بعد میں ان کی اولاد نے اس کو ممنوع سمجھ لیا۔دوسرا حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ فعل بھی نزول تورات سے پہلے کا ہے۔اس لیے کہ تورات تو حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت یعقوب علیہ السلام کے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حرمت کا جو حکم بائیبل میں لکھا ہے وہ اصل توراۃ کا حکم نہیں ہے بلکہ بعد میں تحریف کرکے اس میں داخل کیا گیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ چیزیں حرام ہی نہیں تھیں لہذا ان چیزوں کا ملت ابراہیمیؑ میں حرام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اگلی آیت میں فرمایا گیا:

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (آل عمران۔94)

اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی در حقیقت ظالم ہیں۔(آل عمران۔94)

ملّۃ ابراہیمیؑ کی پیــروی

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭوَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (آل عمران۔95)

کہو، اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے، تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔(آل عمران۔95)

بیت اللہ (کعبہ) کی شان اور عظمت

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ۔ (آل عمران۔96)

بے شک سب سے پہلی مسجد جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔

بیت اللہ شریف کی ظاہری اور معنوی برکات

مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ: بیت اللہ شریف کو پورے جہاں کیلئے برکت اور ہدایت کا ذریعہ بنایا گیا۔(آل عمران۔96)

کعبۃ اللہ کی بے شمار برکات اور فضائل ہیں۔ سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اس میں اللہ کی عبادت کریں وہ خانہ کعبہ ہے۔ وہ دنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ دوسرے کہ وہ برکت والا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ پورے جہان کے لئے ہدایت ور ہنمائی کا ذریعہ ہے۔

بیت اللہ کی سب سے بڑی برکت گناہوں سے معافی اور بخشش ہے:

حدیث: مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ، فَلَمْ يَرْفُثْ، وَلَمْ يَفْسُقْ، رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ أُمُّهُ۔

جس نے اس گھر (کعبہ) کا حج کیا جس میں نہ کوئی بیہودہ بات کی اور نہ ہی کوئی گناہ کیا تو وہ (تمام گناہوں سے پاک ہو کر) اس طرح واپس لوٹا جیسے اس کی ماں نے اُسے جنم دیا تھا۔ (بخاری، مسلم)

حدیث: حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی انسان گھر میں نماز پڑھے اس کو ایک نماز کا ثواب ملے گا، اور اگر اپنے محلہ کی مسجد میں ادا کرے تو اس کو پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہو گا، اور جو جامع مسجد میں ادا کرے تو پانچ سو نمازوں کا ثواب پائے گا، اور اگر مسجد اقصی میں نماز ادا کی تو ایک ہزار نمازوں کا اور میری مسجد (یعنی مسجد نبویؐ) میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہو گا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا۔ (ابن ماجہ)

حدیث: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی ایک سو بیس (120) رحمتیں روزانہ اس گھر (یعنی بیت اللہ) پر نازل ہوتی ہیں جن میں سے ساٹھ (60) طواف کرنے والوں پر، چالیس (40) وہاں نماز پڑھنے والوں پر، اور بیس (20) بیت اللہ کو دیکھنے والوں پر نازل ہوتی ہیں۔ (بیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف کو صرف دیکھنا بھی عبادت ہے اور باعث رحمت ہے۔ جو لوگ فرض ہونے کے باوجود حج نہیں کرتے اوّل تو وہ سخت گناہگار ہیں دوسرے وہ بیت اللہ کی زیارت اور اس زیارت کے عظیم ثواب سے بھی محروم ہیں۔

روئے زمین کی سب سے پہلی مسجد:

حدیث: سیدنا ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! زمین میں سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) میں نے پوچھا پھر کون سی؟ آپ ﷺ نے فرمایا پھر مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں نے پوچھا ان دونوں مسجدوں کے دوران کتنا زمانہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چالیس برس کا، پھر تجھ کو جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں نماز پڑھ لے وہ مسجد ہے۔ (مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ)

تعمیر کعبہ

بیت اللہ شریف کی پہلی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی۔ آدمؑ کی یہ تعمیر نوحؑ کے زمانے تک باقی تھی، طوفان نوح میں عمارت منہدم ہوئی، اور اس کے نشانات مٹ گئے، اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں حسب ضرورت کئی دفعہ کعبہ کی تعمیر و مرمت ہوئی۔ بیت اللہ کی ایک مشہور تعمیر قریش نے رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی زمانہ میں کی، جس میں حضورؐ بھی شریک ہوئے اور حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا۔ لیکن قریش نے اس تعمیر میں بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی کہ:

1۔ بیت اللہ کی پوری جگہ کی تعمیر کے بجائے آدھے حصہ پر کعبہ کی تعمیر کی۔ اس کی وجہ یہ تھی بیت اللہ کی تعمیر کیلئے جو حلال مال اس وقت میسر تھا اس میں سے اتنی ہی جگہ تعمیر ہو سکتی تھی۔ بقیہ غیر تعمیر شدہ حصہ کو نیم دائرہ لگا کر چھوڑ دیا گیا جس کو حطیم کہا جاتا ہے۔

2۔ دوسری تبدیلی یہ کی کہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر میں کعبہ کے دو دروازے تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا پشت کی جانب باہر نکلنے کے لئے۔ قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا۔

3۔ تیسرا تغیر یہ کیا کہ دروازہ بیت اللہ کا سطح زمین سے کافی بلند کر دیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جا سکے، بلکہ جس کو وہ اجازت دیں وہی جا سکے۔

اس سلسلے میں الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ کئی احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

يا عائشة، لولا حدثان قومك بالكفر لنقضت البيت حتى ازيد فيه من الحجر، فإن قومك قصروا في البناء۔ (مسلم)

دوسری روایت میں ہے: لولا حداثة قومك بالكفر لنقضت البيت، ثم لبنيته على اساس إبراهيم عليه السلام، فإن قريشا استقصرت بناءه۔۔ (بخاری)

تعمیر کعبہ کے میں احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ کعبہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اس کو بالکل بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دوں۔ قریش نے جو تصرفات بناء ابراہیمی کے خلاف کئے ہیں ان کی اصلاح

کردوں، لیکن چونکہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ لوگ کسی غلط فہمی میں مبتلانہ ہوجائیں۔ اس لئے فتنہ وفساد سے بچنے کے پیش نظر اس تعمیر کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں۔

بیت اللہ کی مزید برکات

اگلی آیت میں بیت اللہ کی مزید برکات کو بیان کیا گیا:

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔۔ (آل عمران۔97)

اس گھر (بیت اللہ) میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے۔ جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہو جائے اس نے امن وسکون پالیا۔ (آل عمران۔97)

اس آیت میں بیت اللہ یعنی کعبہ کی مزید برکات اور فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ دوسرا ان نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی مقام ابراہیم ہے۔

مقام ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟

مقام ابراہیم کا ذکر سورۃ البقرہ، آیت 125 کی تفسیر میں بھی گذر چکا ہے۔

مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ کرتے رہے۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کے قدم کے نشانات ہیں۔

بقول شاعر:

ـــ وموطی ابراہیم فی الصخر رطبۃ
علی قدمیہ حافیا غیر ناعل

یعنی اس پتھر میں ابراہیمؑ کے دونوں پیروں کے نشان تازہ بتازہ ہیں جن میں جوتی نہیں۔

اب اس پتھر کو ایک شیشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے، جسے ہر حاجی مطاف میں باآسانی دیکھ سکتا ہے۔ پہلے یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو: واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی۔ اس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلے پر رکھ دیا گیا۔ اس مقام پر طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے۔ طواف کے بعد کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے قریب پڑھنا افضل ہے۔ البتہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

آیت کے اگلے حصے میں بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے استطاعت رکھنے والوں پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم قرار دیا ہے:

حج کی فرضیّت

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (آل عمران۔97)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔(آل عمران۔97)

حج کی استطاعت سے کیا مراد ہے؟

استطاعت سے مراد یہ ہے کہ حج کا ارادہ کرنے والے کے پاس بیت اللہ تک جانے اور واپس آنے کے مصارف ہوں، اس کی غیر حاضری میں اس کے اہلِ خانہ کی گزر اوقات کا انتظام ہو، راستے میں امن و امان ہو اور جان کا خطرہ نہ ہو، وہ صحت مند ہو کہ سفر کی صعوبتیں برداشت کر سکتا ہو اور مناسک حج ادا کرنے کے قابل ہو۔ اس کے ساتھ عورت کے لیے ایک اضافی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔ یہ شرط صرف سفر حج کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ شرعی مسافت والے ہر سفر کے لیے ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ نبی ﷺ کو خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: لا تسافر المرأۃ الا مع ذی محرم "عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔(بخاری، مسلم)

اس موضوع کی روایات میں مسافت سفر کے بیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ایک دن اور ایک رات کے سفر کا ذکر ہے۔ دوسری روایت میں تین دن، تین رات کے سفر کا بیان ہے کہ اتنی مسافت کا سفر عورت کے لیے بغیر محرم کے جائز نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حج خواہ فرض ہو یا نفلی، ہر صورت میں عورت صرف شوہر یا محرم کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فرض حج کی ادائیگی کے لیے سفر کرنے کی صورت میں عورت کے لیے محرم کی شرط نہیں ہے۔ وہ قابلِ اعتماد ساتھیوں یا عورتوں کی جماعت کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنی ذات کے بارے میں حفاظت کا پورا اطمینان ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

حج نہ کرنے والوں کیلئے وعید

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (آل عمران۔97)

اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔(آل عمران۔97)

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے کو قرآن نے کفر سے تعبیر کیا ہے جس سے حج کی فرضیت میں اور اس کی تاکید میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ احادیث میں بھی ایسے شخص کے لئے سخت وعید آئی ہے۔

حج کے بارے میں چند گذارشات

حج بڑھاپے میں ہی کیوں؟

حج کے بارے میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑھاپے کا کام ہے جب انسان ریٹائر ہو جائے، بچوں کی شادیاں ہو جائیں مکان بن جائے اس کے بعد زندگی کا آخری کام حج رہ جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حج کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح بالغ ہونے کے بعد نماز اور روزے فرض ہو جاتے ہیں، صاحب نصاب ہونے پر سالانہ زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اسی طرح بالغ ہونے کے بعد صاحب استطاعت ہونے پر حج فرض ہو جاتا ہے لہٰذا فریضہ حج میں بلاوجہ تاخیر درست نہیں۔

ارکان اسلام میں سب سے مشکل رکن حج کا ہے لہذا اس کو صحت و تندرستی میں ادا کرنا چاہئے۔ سچی بات یہ کہ حج کا اصل لطف جوانی میں ہی ہے۔

اکٹھے حج کا تصور

بعض گھرانوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ میاں بیوی اکٹھے حج کی تمنا رکھتے ہیں لہٰذا جب ایک فرد پر حج فرض ہو جاتا ہے تو وہ انتظار میں ہوتا ہے کہ جب تک دوسرے کے وسائل نہیں ہونگے وہ حج پر نہیں جائے گا۔

بعض دفعہ اولاد کی خواہش ہوتی ہے کہ پہلے وہ والدین کو حج کرائیں گے اس کے بعد خود حج کریں گے۔

یاد رکھیے! حج ایک انفرادی عبادت ہے۔ لہذا ان وجوہات کی وجہ سے اپنے حج کو موخر کرنا درست نہیں۔

حج کے احکام و آداب

دنیا میں ہر کام کے آداب ہوتے ہیں۔ اور تو اور کھیلوں کے بھی آداب اور اصول مقرر ہیں، حج تو پھر ایک بڑی مقدس اور عظیم الشان عبادت ہے لہذا حج کے سفر پر جانے سے پہلے اس کے احکام و آداب کو سیکھنا اور ان کی پابندی کرنا

بہت ضروری ہے۔ بہت سارے لوگ اس اہم پہلو پر توجہ دیئے بغیر حج پر چلے جاتے ہیں اور اتنا خرچ اور مشقت اٹھا کر بھی حج کی سعادت اور مکمل استفادہ سے محروم رہتے ہیں۔

اعتصام باللہ: اللہ کے دین پر قائم رہنا

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (آل عمران۔101)

جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔

دوسرا رکوع: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ۔ (آل عمران۔102)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

معاشرت اور اجتماعیت کے دو اصول،: خوف خدا یعنی تقویٰ اور اتحاد و اتفاق، اللہ سے حسب استطاعت ڈرو، تفرقہ بازی کی مذمت، باہمی اتفاق و محبت: اللہ کا احسان، پچھلی امتوں کی روش پر نہ چلو، اختلاف و انتشار کی اصل وجوہات: دنیاوی مفاد، نفسانی اغراض، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اصولی ہدایت، نورانی چہرے کن کے ہونگے؟ اللہ کے حضور تمام اعمال کی پیشی۔

اجتماعیت کے دو اصول: خوف خدا اور باہمی اتفاق و اتحاد

اس رکوع کی پہلی دو آیات میں معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کے دو اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں ایک تقویٰ اور دوسرا باہمی اتحاد ہے۔

اللہ سے حسب استطاعت ڈرو

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔(آل عمران۔102)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا اس سے ڈرنا چاہیے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ آل عمران۔102

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے احکام و فرائض پورے طور پر بجالائے جائیں اور منہیات کے قریب نہ جایا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے پورا پورا ڈرنا یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اس کا ذکر کیا جائے اور اس کی یاد نہ بھلائی جائے اس کا شکر کیا جائے کفر نہ کیا جائے۔(ابن کثیر)۔

بعض کہتے ہیں کہ اس آیت سے صحابہ کرام پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل فرمائی کہ: فاتقواللہ مااستطعتم۔ کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی استطاعت کے مطابق ڈرو۔(فتح القدیر)

تقوٰی سے کیا مراد ہے؟

لفظ تقوٰی اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں،ان سے عذاب الٰہی کا خطرہ ہے۔

تقوٰی کے کئی درجات ہیں۔

1۔ تقوٰی کا ادنی درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے،اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان کو متقی کہا جاسکتا ہے،اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو،اس معنی کے لئے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقوی استعمال ہوا ہے۔

2۔ تقوٰی کا دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں،تقوی کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔

3۔ تقوٰی کا تیسرا درجہ وہ اعلی ترین مقام ہے جو انبیاء کرامؑ اور امت کے نیک ترین لوگوں کو نصیب ہوتا ہے کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضاجوئی سے معمور رکھنا۔مذکورہ آیت میں اتقوااللہ کے بعد حق تقاتہ کا کلمہ بڑھادیا گیا ہے کہ تقوی کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقوی کا۔

حق تقوی کیا ہے؟

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصریؒ نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعا خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے: حق تقاتہ ھو ان یطاع فلا یعصی و یذکر فلا ینسی ویشکر فلا

یکفر۔ (بحر محیط) حق تقوی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے کوئی کام اطاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔

اسی مفہوم کو ائمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے، مثلا بعض نے فرمایا کہ حق تقوی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے، اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو، اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حق تقوی ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا اتقوا اللہ ما استطعتم ہے یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت اور اختیار میں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؒ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حق تقاتہ کی ہی تفسیر و تشریح ہے اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دے تو حق تقوی ادا ہو گیا، اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے بعد کسی خلاف تقوٰی کام میں مبتلا ہو گیا تو وہ حق تقوٰی کے خلاف نہیں۔

اگلے جملے میں ارشاد فرمایا: فلا تموتن الا وانتم مسلمون۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقوی درحقیقت دین اسلام پر عمل کرنے کا ہی نام ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تمہارا خاتمہ اسلام پر آنا چاہیے۔ اس آیت سے خاتمہ بالایمان اور خاتمہ بالخیر کی اہمیت بھی معلوم ہو گئی۔ بعض روایات حدیث میں آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمال صالحہ کرتے ہوئے گزر گئی، آخر میں مرنے سے پہلے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال ضائع اور برباد ہو گئے۔

معاشرتی قوت کا دوسرا اصول: باہمی اتفاق واتحاد

اگلی آیت میں اجتماعی قوت کا دوسرا اصول بیان کیا گیا:

تفرقہ بازی اور انتشار کی ممانعت

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔۔۔ (آل عمران۔103)

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ (آل عمران۔103)

اتحاد واتفاق کی اہمیت

اتفاق واتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مذہب و نظریہ سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے اس میں دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں، دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو مفید اور بہتر جانتا ہو۔ اس لئے دنیا کی ہر جماعت، ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں، لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں، گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے، پارٹی کے اندر پارٹی اور جماعت کے اندر جماعت کا لامحدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنوں میں اتحاد و اتفاق ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ وقتی اغراض کے تحت لوگ کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں، اغراض پوری ہو جائیں، یا ان میں ناکامی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہو جاتا ہے بلکہ افتراق اور عداوتوں کی نوبت آتی ہے۔

اس کا **بنیادی سبب** یہ ہے کہ ہر گروہ و ہر فرقہ لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے، اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو لازمی طور پر ہر دعوت اتحاد کا نتیجہ **افتراق و انتشار** نکلتا ہے۔

قرآن حکیم نے صرف **اتحاد و اتفاق** اور **تنظیم و اجتماعیت** کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ و عادلانہ اصول بھی بتلا دیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ رب العالمین کا دیا ہوا **دین** اور نظام ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا چاہیے۔ کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کر سکتا۔ خاتم الانبیاء ﷺ اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرآن کی صورت میں لائے ہیں اس پر عمل کے سوا اخروی کامیابی ممکن نہیں۔ اس اصول کو ماننے کے بعد اگر کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن و سنت اور **تعبیر دین** میں رہ سکتا ہے اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر بلکہ ایسا **اختلاف رائے** ایک فطری امر ہے۔

قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکسیر اس طرح بتلایا ہے: **واعتصموا بحبل اللہ جمیعا**۔ یعنی اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کے مطابق اللہ کی رسی سے مراد **قرآن مجید** ہے۔ **تمسک بالقرآن والسنۃ** ہی وہ چیز ہے جس سے اصلاح امت ممکن ہے۔ قرآن و سنت کو نظر انداز کر کے امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ انفرادی زندگی میں بھی کوئی خیر نہیں۔ آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری پوری ملت **انتشار و افتراق** میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے۔ قرآن کو یا دین کو **رسی**

سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک امت بناتا ہے۔

وحدت کا یہی اصول پوری امت کو بلکہ پوری انسانیت کو متحد کر سکتا ہے۔ ورنہ جو عربی ہے وہ عجمی نہیں بن سکتا، جو یورپین ہے وہ ایشین نہیں بن سکتا، جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا، جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا، ساری دنیا کے لوگ ایک زبان نہیں بول سکتے، نہ ساری دنیا کے لوگ نہ مشرقی بن سکتے ہیں اور نہ مغربی۔ اس لئے وحدت کی باقی صورتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہو سکتی ہیں، ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے قرآن کریم نے مرکز وحدت حبل اللہ یعنی قرآن اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو بنایا جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے۔ دنیا کا ہر شخص اس معقول اور صحیح وحدت کو اختیار کر سکتا ہے، اور دنیا بھر کے پورے انسان اس وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں، اور اگر وہ آبائی رسم ورواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں، اور اس کا اتباع کریں۔ جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہو گا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت سے مربوط ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کر لے گا۔ یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جو اتحاد امت اور اتحاد انسانیت کی بنیاد بن سکتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو بآواز بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے، اس لئے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں، جس سے ان کو دنیا اور آخرت میں سربلندی اور کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستہ سے مل سکتی ہے۔

پیارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ نے عصبیت کی ساری دیواروں کو گراتے ہوئے کالے گورے، عربی عجمی، چھوٹے بڑے، بادشاہ غلام، کے فرق کو مٹا کر عرب کے ابو بکر، حبشہ کے بلال، روم کے صہیب، فارس کے سلمان کو یکجا کر کے نہ صرف رضی اللہ عنہم ورضوعنہ کے درجہ پر پہنچا دیا تھا بلکہ انسانیت کے باغ کو سینچ کر نوعِ انسانی کو ایک خاندان میں تبدیل کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا تھا۔ مگر ہم امتیوں کا حال یہ ہے کہ فرقہ واریت کا طوق گلے میں ڈال کر امت کے شیرازہ کو بکھیرتے ہوئے اپنے سے قریب لوگوں کو دور کر کے انسانیت کو خانہ در خانہ تقسیم کرتے ہوئے، اللہ کے بندوں کو اس کے خالق ومالک سے دور کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

حدیث: حضورﷺ نے فرمایا: جو عصبیت پر مرا وہ جہالت پر مرا اور جو عصبیت کا علمبردار ہو وہ ہم میں سے نہیں، اور جو عصبیت پر جنگ کرے وہ ہم میں سے نہیں اور جس کی موت عصبیت پر ہو وہ بھی ہم میں سے نہیں۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے، اور تین چیزوں کو ناپسند، پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

1۔ اول یہ کہ تم عبادت صرف اللہ کیلئے کیا کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

2۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو، اور نااتفاقی سے بچو۔

3۔ سوم یہ کہ اپنے حکام اور اولوا الامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔

اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں یہ ہیں۔

1۔ بلا ضرورت قیل و قال یعنی فضول بحث و مباحثہ

2۔ بلا ضرورت کسی سے سوال کرنا

3۔ اضاعت مال۔

(بحوالہ ابن کثیر)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپ مومنوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت رکھنے اور مہربانی کرنے میں ایسا پائیں گے جیسا کہ ایک بدن ہو' جب اس کے کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورے جسم کے سارے اعضاء بے خوابی، بے تابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم)

اس حدیث مبارک میں حضورؐ نے مسلم معاشرے کی حقیقت بڑے عمدہ انداز میں بیان فرمائی ہے مل جل کر رہنے اور اکٹھے زندگی گزارنے کا نام معاشرہ ہے، اسلامی تعلیمات کے آنے سے پہلے بھی لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ زمین کے مختلف حصوں میں لوگ مختلف طریقوں سے زندگی گزارا کرتے تھے۔ لیکن حضورؐ نے امت مسلمہ کو مسلم معاشرہ کی ایسی خصوصیات عطا فرمائیں کہ جن سے انسان کو محض اپنے زندہ رہنے کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی میں مکمل طور پر شریک ہونے کی تعلیم ملتی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں انسان تہذیب و اخلاق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انتہائی پستیوں میں گرے ہوئے تھے' اسلام کا ان پر احسانِ عظیم ہے کہ ایک مختصر عرصہ میں وہی لوگ تہذیب و تمدن کے بلند پایہ معیار پر نظر آنے لگے اور ان کا معاشرہ دنیا بھر کے لیے عملی نمونہ بن گیا وہ مسلمان جس نئے ملک میں قدم رکھتے وہاں کے لوگ ان کی معاشرتی عملی زندگی سے اس قدر متاثر ہوتے کہ اسلام قبول کر لیتے۔

اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ عصبیت اور فرقہ واریت سے پوری طرح بچا جائے۔ فرقہ، علاقہ، نسل، رنگ، زبان، قبیلہ کی بنیاد پر گروہ بندی ہی عصبیت ہے۔ اگر کسی فرد یا گروہ کی کسی تقریر، تحریر یا عمل سے عصبیت کی بو آئے تو اسے فوری طور پر روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایک آدمی کی شورش بھی بڑی چیز ہے۔ دیا سلائی کی ایک سلائی پورے جنگل کو جلا سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک انسان یا گروہ بھی پوری دنیا میں فتنہ برپا کر سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ فرقہ واریت سے پوری طرح بچا جائے نیز ہر حال میں اتحاد کو قائم و دائم رکھا جائے کیوں کہ یہ ایسی اجتماعی ضرورت ہے، جس کے بغیر کسی بھی خاندان و قوم کی بقا و ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اتحاد کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ فرقہ واریت ہی ہے، یہ جذبات کو منفی سمت میں پروان چڑھاتی ہے۔ یہ اندھی ہوتی ہے، یہ عقل کو ماؤف اور مفلوج کرتی ہے، یہ تفریق اور بھید بھاؤ پیدا کرتی ہے، اس کی پکار جاہلیت کی پکار ہے۔

بقول شاعر مشرق:

؎ منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، قرآن بھی اللہ بھی ایک
کیا بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک

عصر حاضر میں اتحاد امت

موجودہ حالات میں اتحاد بین المسلمین کی واحد صورت یہ ہے کہ اپنا مسلک چھوڑو نہیں اور دوسرے کا مسلک چھیڑو نہیں کی پالیسی اپناتے ہوئے اتحاد امت کی کوشش کی جائے۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ اپناتے ہوئے امت کو غیر اہم ایشوز میں الجھانے کے بجائے امت کی توانائیوں اور ان کے وقت کے قیمتی سرمایہ کو ان کے حق میں ٹھوس اور تعمیری کاموں میں لگائیں، امت کی دینی حالت کی اصلاح، اعمال کی طرف دعوت، معاشرت و معاملات کی درستگی اور غیر مسلموں میں پیغام حق و صداقت کو عام کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ اللہ تعالی ہمیں ان کاموں کی توفیق عطا کرے۔

باہمی اتفاق اور محبت: اللہ کا احسان

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَ لَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (آل عمران۔103)

اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔(آل عمران۔103)

یہاں اللہ تعالیٰ صحابہ کرام پر اپنے احسان کا ذکر فرمارہے ہیں کہ تم آگ یعنی جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے لیکن ہم نے تمہیں اسلام کی توفیق عطا فرما کر اس آگ سے بچالیا۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں لوگ مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں بات بات پر ان کی لڑائیاں، جن کی بدولت قریب تھا کہ پورا معاشرہ نیست و نابود ہو جاتا۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اوس اور خزرج کے وہ قبیلے، جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے، اور یہ دونوں قبیلے مکہ سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔

جاہلیت کے زمانے میں اوس و خزرج کے درمیان بڑی لڑائیاں اور سخت عداوت تھی آپس میں برابر جنگ جاری رہتی تھی جب دونوں قبیلے اسلام لائے تو اللہ کے فضل سے بالکل ایک ہو گئے سب حسد بغض جاتا رہا اور آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار اور اللہ تعالیٰ کے دین میں ایک دوسرے کے ساتھ یکجان ہو گئے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔۔ وہ اللہ جس نے تیری تائید کی اپنی مدد کے ساتھ اور اہل ایمان کے ساتھ۔ اور ان کے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی۔(الانفال:62۔63)

حنین کی فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے مصلحت دینی کے مطابق حضورؐ نے بعض لوگوں کو زیادہ مال دیا تو کسی شخص نے کچھ نامناسب الفاظ زبان سے نکال دیئے جس پر حضورؐ نے جماعت انصار کو جمع کر کے ایک خطبہ پڑھا اس میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اے جماعت انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی۔ کیا تم

متفرق نہ تھے؟ پھر رب دو عالم نے میری وجہ سے تمہارے دلوں میں باہمی محبت ڈال دی۔ کیا تم فقیر نہ تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری وجہ سے غنی کر دیا؟ ہر ہر سوال کے جواب میں یہ پاکباز جماعت کہتی جاتی کہ ہم پر اللہ تعالیٰ اور رسول کے بے شمار احسانات ہیں۔

ایک دفعہ اچانک جب اوس و خزرج میں پرانی عداوت کی آگ بھڑک اٹھی یہاں تک کہ تلواریں سونت لی گئیں، دوبارہ جاہلیت کے نعرے لگنے لگے ہتھیار سجنے لگے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اس وقت حضور ﷺ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی اور دونوں گروہوں کو ٹھنڈا کیا۔ جس کا اثر یہ ہو کہ ان متحارب قبیلوں نے آپس میں نئے سرے سے صلح کی، آپس میں معانقہ و مصافحہ کیا اور پھر بھائیوں کی طرح گلے مل گئے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح صفائی ہو گئی۔

پچھلی امتوں کی روش پر نہ چلو

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (آل عمران۔105)

کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے۔ (آل عمران۔105)

یہ اشارہ ان امتوں کی طرف ہے جنہوں نے اللہ کے پیغمبروں سے دین حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اساس دین کو چھوڑ دیا اور غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے، پھر فضول ولایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انہیں اس کام یعنی دعوت و تبلیغ کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سپرد کیا تھا اور نہ عقیدہ و اخلاق کے ان بنیادی اصولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر در حقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا مدار ہے۔

یہ آیت در حقیقت آیت واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کا تتمہ ہے۔ پھر اس آیت ولا تکونوا کالذین تفرقوا سے اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ تفرق اور اختلاف نے پچھلی قوموں کو تباہ کر دیا، ان سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے میں یہ مرض پیدا ہونے نہ دو۔

اس آیت میں جس تفرق واختلاف کی مذمت ہے اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو۔ چناچہ آیت میں یہ قید کہ وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔ یعنی واضح احکامات آجانے کے بعد انہوں نے تفرقہ ڈالا، اس امر پر واضح قرینہ ہے۔ کیونکہ اصول دین سب واضح ہوتے ہیں، اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی۔ لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے و اجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں۔ وہ حدیث صحیح اس کی اجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری و مسلم نے مرفوعا عمرو بن العاص سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا، لہذا وہ اجتہادی اختلاف جو صحابہؓ اور ائمہ مجتہدین میں ہوا ہے اس کو اس آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بقول حضرت عمر بن عبد العزیزؒ صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے موجب رحمت و رخصت ہے۔ (بحوالہ روح المعانی بروایۃ البیہقی)

یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہو گئی کہ جو اجتہادی اختلاف شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے اس میں اپنے اپنے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کر لی اگرچہ عند اللہ اس میں سے صواب اور صحیح صرف ایک ہے دوسرا خطا ہے، لیکن یہ صواب و خطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد و صواب پر پہنچنے والے عالم کو دوہرا ثواب عطا فرما دیں گے، اور جس کے اجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے، ہاں اپنی فہم و بصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنۃ سمجھتے ہیں اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر احتمال خطاء کا بھی ہے، اور دوسری جانب خطا ہے، مگر احتمال صواب کا بھی ہے۔ یہ بات تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے۔

فقہی اور اجتہادی اختلافات میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے۔ اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود امر منکر ہے، اس سے پرہیز لازم ہے یہ وہ بات ہے جس میں آج کل بہت سے اہل علم بھی غفلت میں مبتلا ہیں۔ اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرا اور سب و شتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ انتشار بین المسلمین کی صورت میں جگہ جگہ نظر آرہا ہے۔ اجتہادی اختلاف بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو وہ بھی اس آیت کے خلاف اور مذموم نہیں۔ مثلا امام شافعی اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز

جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اور ظاہر ہے جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا، اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہو گی، اس کے بالمقابل امام ابو حنیفہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اسی لئے حنفیہ نہیں پڑھتے، لیکن پوری امت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارک نماز کہتے ہوں، کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں، اس لئے تم بے نمازی ہو، یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکرات شرعیہ پر کی جاتی ہے۔ امام ابن عبد البر اپنی کتاب جامع العلم میں اس مسئلہ کے متعلق سنت سلف کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں:

عن یحییٰ بن سعید قال ما برح اہل الفتوی یفتون فیحل ھذا ویحرم ھذا فلا یری المحرم ان المحل ھلک لتحلیلہ ولا یری المحل ان المحرم ھلک لتحریمہ۔ (جامع بیان العلم)

یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتوی فتوی دیتے رہے ہیں ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال قرار دیتا ہے، دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتوی دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتوی دینے والا ہلاک اور گمراہ ہو گیا۔

یہاں ایک تنبیہ بھی ضروری ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں، یا چند آیات وروایات سے ظاہراً دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے مواقع پر صرف ان لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں۔ مثلاً قرآن وحدیث کے متعلق تمام علوم وفنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہ وتابعین کے اقوال و آثار کی مکمل واقفیت وغیرہ۔ جس شخص میں یہ شرائط اجتہاد موجود نہ ہوں اس کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف نہیں کہا جاسکتا۔

اختلاف وانتشار کی اصل وجوہات: دنیادی مفاد، نفسانی اغراض

وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔ روشن دلیلیں آجانے کے بعد انہوں نے تفرقہ ڈالا۔ (آل عمران۔105)

اس سے معلوم ہوا کہ علماء اہل کتاب کے باہمی اختلاف وتفرقہ کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حق کا پتہ نہ تھا اور وہ اس کے دلائل سے بے خبر تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں سب کچھ جانتے ہوئے محض دنیاوی مفاد اور نفسانی اغراض کے لئے اختلاف وتفرقہ کی راہ پکڑی تھی اور اس پر جمے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے مختلف

اسلوب اور پیرائے سے بار بار اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔ مگر افسوس کہ اس امت کے تفرقہ بازوں نے بھی ٹھیک یہی روش اختیار کی کہ حق اور اس کی روشن دلیلیں خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔ لیکن وہ اپنی فرقہ بندیوں پر جمے ہوئے ہیں اور اپنی عقل و ذہانت کا سارا جوہر سابقہ امتوں کی طرح تاویل اور تحریف کے لاحاصل شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

چہروں کا نور اور سیاہی

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ (آل عمران۔106)

جس دن بعض چہرے سفید (نورانی) ہونگے اور بعض سیاہ۔ سیاہ چہروں والوں سے کہا جائے گا کہ نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا اب اِس کفران نعمت کا عذاب چکھو۔ (آل عمران 106)

چہرے کی سفیدی اور سیاہی سے کیا مراد ہے؟

چہرے کی سفیدی اور سیاہی کا ذکر قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں آیا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نور ایمان کی سفیدی ہے، یعنی مومنین کے چہرے نور ایمان سے روشن اور خوش ہوں گے۔ سیاہی سے مراد انکار و سرکشی کی کدورت ہو گی اور اوپر سے فسق و فجور کی ظلمت اور تاریکی ہو گی۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ سنت کی پیروی کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے تاریک اور سیاہ ہوں گے۔ (قرطبی)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں آیت یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ کے متعلق فرمایا کہ مخلص اہل ایمان کے چہرے نورانی ہوں گے لیکن جن لوگوں نے دین میں تغیر و تبدل کیا خواہ ارتداد کی صورت میں یا انکار و سرکشی کی صورت میں یا نفاق کی صورت میں ان کے چہرے تاریک اور سیاہ ہونگے۔

مذکورہ اقوال کے علاوہ اور بھی بہت سے اقوال ہیں، لیکن ان سب میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا حاصل ایک ہی ہے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ۔ (آل عمران۔107)

اور جن لوگوں کے چہرے روشن (نورانی) ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آیت کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے ففی رحمۃ اللہ سے اپنی عظیم رحمت کا بھی اظہار فرمایا۔اس طرح آیت کے شروع اور اس کے آخر دونوں جگہ اہل رحمت کو بیان کیا، درمیان میں اہل سواد کا۔ جس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ بنی نوع انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان کو اپنے عذاب کا مظہر بنایا جائے بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری رحمت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ : کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت سے مراد اس جگہ جنت ہے۔ یہاں بھی بظاہر جنت کو رحمت سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی عابد اور زاہد کیوں نہ ہو، وہ جنت میں محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی جائے گا، کیونکہ عبادت کرنا بھی انسان کا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اس کی قدرت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لئے عبادت کرنے سے دخول جنت ضروری نہیں ہو جاتا، بلکہ جنت کا داخلہ تو اللہ کی رحمت ہی سے ہوگا۔(بحوالہ تفسیر کبیر)

آیت میں ایک اور لطیف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ففی رحمة الله کے بعد هم فيها خلدون فرما کر بتا دیا کہ اہل ایمان اللہ کی جس رحمت میں ہوں گے وہ ان کے لئے عارضی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوگی ان سے یہ نعمت کبھی سلب یا کم نہ کی جائے گی، اس کے بالمقابل اہل سواد کے لئے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ اس حال میں ہمیشہ رہیں گے۔

فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون: میں اشارہ فرما دیا کہ آج کا عذاب ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی کمائی سے ہے جو دنیا میں کرتے رہے ہو، کیونکہ درحقیقت جنت و دوزخ کی نعمتیں اور مصائب درحقیقت ہمارے اعمال ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، اسی بات پر متنبہ کرنے کے لئے آخر میں یہ بھی فرما دیا: وماللہ یرید ظلما للعلمین۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ عذاب ثواب جو کچھ ہے عین انصاف و مقتضائے حکمت و رحمت ہے۔

اللہ کے حضور معاملات کی پیشی

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ (آل عمران۔109)

زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش کئے جائیں گے۔(آل عمران۔109)

تیسرا رکوع: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔۔۔(آل عمران۔110)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

امت مسلمہ کی وجہ فضیلت، دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، خیر امت کا لقب، سب اہل کتاب یکساں نہیں، اخلاص کے بغیر کی گئی نیکی کی حقیقت، منافقانہ طرز عمل، مخالفین کی چالوں اور سازشوں سے بچنے کا طریقہ: صبر و استقامت، ثابت قدمی، تقویٰ۔

اس رکوع میں معاشرتی اصلاح اور اجتماعی فلاح کا ایک اور اصول بیان کیا گیا: امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی دوسروں کو اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ پچھلے رکوع میں فرمایا گیا تھا کہ تقوٰی اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعہ اپنی اصلاح کرو۔ اس رکوع میں فرمایا جارہا ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کے ذریعے دوسروں کی بھی اصلاح کرو۔ اپنے اعمال و اخلاق کو درست کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ کی بھی فکر کرو۔ یہی مضمون ہے جو سورۃ العصر میں بتایا گیا۔ الا الذين امنوا و عملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ یعنی آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عمل صالح کے پابند ہیں اور دوسروں کو بھی عقائد اور اعمال صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔

خیر امّت کا لقب

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران۔110)

اس آیت میں امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا گیا ہے جو امر بالمعروف نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کی صفات سے متصف ہو گی۔ گویا یہ امت اگر ان امتیازی خصوصیات سے متصف رہے گی تو خیر امت ہے بصورت دیگر اس امتیاز سے محروم قرار پا سکتی ہے۔ قرآن کریم نے امت مسلمہ کو خیر امت قرار دینے کی وجوہات متعدد آیتوں میں بیان فرمائی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم آیت سورۃ البقرۃ میں گذر چکی ہے جس میں فرمایا گیا کہ وكذلك جعلنكم امة وسطا۔ (2:143)۔ کہ ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔ یعنی امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کی بڑی وجہ

اس کا اعتدال مزاج ہونا ہے اور اس کی فضیلت والی امت ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ امت اللہ کی مخلوق کیلئے فائدہ مند ہو گی۔ اس کے فرض منصبی میں یہ بات شامل ہے کہ یہ پوری انسانیت کی روحانی اور اخلاقی اصلاح اور فلاح کا کام کرے گی۔ یہ خلق اللہ کو نفع پہنچانے ہی کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پچھلی امتوں پر عائد تھا، جس کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔ سابقہ امتوں میں جس طرح دین کے دوسرے شعائر غفلت عام ہو کر محو ہو گئے تھے، اسی طرح فریضہ امر بالمعروف بھی بالکل متروک ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس امت کے فرائض منصبی میں اس کو شامل کیا گیا۔ البتہ یہ رعایت رکھی گئی کہ مقامی حالات اور حکمت کے مطابق یہ فریضہ دل، زبان اور ہاتھ کی قوت سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسری رعایت یہ کی گئی کہ اگر کچھ لوگ معاشرے میں یہ فریضہ سر انجام دیتے رہیں گے تو باقی لوگوں پر گناہ نہ ہو گا۔ جیسے پچھلے رکوع کے اندر فرمایا گیا کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران۔104)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں جو لوگ یہ کام کریں گے وہ فلاح پائیں گے۔ (آل عمران۔104)

انفرادی دعوت و تبلیغ ہر مسلمان پر فرض عین ہے جبکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے اجتماعی کوششیں کرنا فرض کفایہ ہے۔ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس فرض کو ادا کرتے رہیں کیونکہ معروف اور منکر شرعی کا صحیح علم وہی رکھتے ہیں۔

فریضۂ دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ، نماز، روزہ اور دیگر فرائض اسلام کی طرح ایک اہم فریضہ ہے۔ قرآن میں اس فریضہ کو حکمت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔

فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اس آیت میں امت مسلمہ پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ سورۃ والعصر میں ارشاد فرمایا: الا الذین امنوا و عملوا الصلحت و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر۔ یعنی آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عمل صالح کے پابند ہیں اور دوسروں کو بھی حق بات اور اعمال صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں

۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لتامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقابا من عندہ ثم لتدعنہ فلا یستجیب لکم۔

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم اچھائی کا حکم اور برائیوں کی مخالفت کرتے رہو ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل فرمادے گا پھر تم دعائیں کروگے لیکن قبول نہ ہوں گی۔ (مسند احمد)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور برے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے۔ یعنی اپنی اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرتا رہے۔

معروف سے مراد وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔ چونکہ یہ امور خیر جانے پہچانے ہوتے ہیں اس لئے معروف کہلاتے ہیں۔ اسی طرح منکر میں تمام وہ برائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو قرآن وحدیث میں ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے۔ اس سلسلے میں واجبات اور معاصی کے بجائے معروف ومنکر کی اصطلاح استعمال کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو امت میں مشہور ومعروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ اجتہادی مسائل جن میں اصول شرعیہ کے تحت ایک سے زیادہ مستند آراء موجود ہیں۔ ان میں زیادہ روک ٹوک اور سختی کرنا مناسب نہیں۔ افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا ہے یا ان پر شرعی فتوے لگائے جاتے ہیں اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔ یعنی تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ اور قوت سے اس کو روک دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو زبان سے روکے اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دل میں اس فعل کو برا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجہ کا ایمان ہے۔

اس حدیث کی رو سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ہر شخص کی قدرت واستطاعت کے مطابق فرض ہے یعنی جس کو جتنی قدرت ہو اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا۔ استطاعت وقدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے، امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف ومنکر کا علم رکھتا ہو۔ جس شخص کو خود ہی

معروف ومنکر کی تمیز نہ ہو یا اس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہو گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بناء پر کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا منکر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف ومنکر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت اور احکام شرعیہ کے معروف ومنکر کا علم حاصل کرلے، اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے۔ لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں اس کا اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں جیسے بہت سارے لوگ سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو ویسا نہ کرو، یہ طریق کار بجائے معاشرہ کی اصلاح کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور لڑائی جھگڑے کا سبب بن سکتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ جو امور انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ جن معاملات میں وہ شرعاً یا قانوناً مداخلت نہیں کر سکتا تو وہاں یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں بلکہ اب یہ فریضہ حکومت وقت یا متعلقہ اتھارٹی کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش وتحقیق کر کے اس کو سزا دے۔ حدیث کے الفاظ فان لم یستطع میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اس پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اسی طرح امر بالمعروف کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی تکلیف یا نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دل ہی سے برا سمجھے۔ ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کر سکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ ہے کہ اس نے حق بات کی تلقین کی تو اس کو نقصان پہنچے گا یا اس کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو جائے گا تو ایسی حالت میں اس شخص کو مکلف نہ سمجھا جائے گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا۔

فریضہ دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں ایک اہم اصول یہ ہے کہ جو حکم فرض ہے اس کی دعوت دینا بھی فرض ہے مثلاً نماز فرض ہے تو اپنے دائرہ اختیار (مثلاً دوست واحباب، فیملی) میں اس کی دعوت دینا بھی فرض ہے۔ نوافل اعمال مستحب ہیں تو ان کی دعوت دینا بھی مستحب ہے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیش نظر رکھنا ہو گا کہ مستحبات میں نرمی کی جائے۔ آج کل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں لیکن امور واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

امر بالمعروف ونہی عن لمنکر کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی مسلمان ہی نہیں تو آپ اسے نماز پڑھنے کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اطلاق صرف مسلمانوں پر یا اسلامی معاشرے پر ہوتا ہے۔ غیر مسلموں تک دین اسلام کی اصولی دعوت پہنچانے کیلیئے مقامی حالات کے مطابق حکمت کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا طریقہ کار اختیار کیا جاسکتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اطلاق فروعی اور اجتہادی احکامات پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان مسائل میں میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے، اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود امر منکر ہے۔

سب اہل کتاب یکساں نہیں

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ (آل عمران۔115۔113)

مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اسکے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں یہ صالح لوگ ہیں۔ اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی نا قدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔(آل عمران۔113۔115)

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے علماء مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت اسد بن عبید، حضرت ثعلبہ بن شعبہ وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ یہ نیک لوگ راتوں کے وقت تہجد کی نماز میں کلام اللہ کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اللہ پر، قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں، بری باتوں سے منع کرتے ہیں، مسابقت الی الخیرات کرتے ہیں۔

اخلاص کے بغیر کی گئی خیرات کی حقیقت

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (آل عمران۔117)

اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جس طرح ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا پھر اسکو برباد کر گئی اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔(آل عمران۔117)

اس مثال میں کھیتی سے مراد دنیاوی زندگی ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہوا سے مراد وہ ظاہری جذبہ ہے جس کی بنا پر ریاکار رفاہ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صرف کرتے ہیں۔ اور اوس یا سخت ٹھنڈک سے مراد صحیح ایمان اور ضابطہ خداوندی کی پیروی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کو پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہوا میں برفانی ٹھنڈک ہو تو کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مزرعہ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے، مگر جب اس کے اندر ریاکاری کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے الٹی مہلک بن جاتی ہے۔

قیامت والے دن کچھ لوگوں کے نہ مال کچھ کام آئیں گے نہ اولاد، حتیٰ کے رفاہی اور بظاہر بھلائی کے کاموں پر جو بھی خرچ کرتے تھے وہ بیکار جائیں گے۔ ان کی مثال اس یخ بستہ اور برفانی ہوا کی سی ہے جو ہری بھری کھیتی کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ لوگ اسی کھیتی کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں اور اس سے نفع کی امید رکھے ہوتے ہیں کہ اچانک ان کی امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب تک اعمال میں اخلاص اور للّٰہیت نہیں ہو گی، رفاہی کاموں پر رقم خرچ کرنے والوں کی چاہے دنیا میں کتنی ہی شہرت ہو جائے آخرت میں انہیں ان کا کوئی صلہ نہیں ملے گا۔

منافقانہ طرز عمل

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡوَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا۔۔۔ (آل عمران۔120)

اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔(آل عمران۔120)

اس آیت میں منافقین کی شدید عداوت کا ذکر ہے جو انہیں اہل ایمان کے ساتھ تھی۔ جب مسلمانوں کو خوش حالی میسر آتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تائید و نصرت ملتی تو منافقین کو بہت برا لگتا اور اگر مسلمان قحط سالی یا تنگدستی میں مبتلا

ہوتے یا وقتی طور پر مغلوب ہوتے (جیسے جنگ احد میں ہوا) تو منافقین بڑے خوش ہوتے۔ مقصد بتلانے سے یہ ہے جن لوگوں کا یہ حال ہو، کیا وہ اس لائق ہو سکتے ہیں کہ انہیں اپنا راز دار اور دوست بنایا جائے؟

مخالفین کی چالوں سے بچنے کا طریقہ: صبر، ثابت قدمی، تقویٰ

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۔ (آل عمران-120)

اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری کرو تو ان کے فریب سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا بے شک اللہ ان کے اعمال پر احاطہ کرنے والا ہے۔(آل عمران-120)

اس آیت میں مخالفین اور منافقین کے مکر و فریب سے بچنے کا طریقہ اور علاج بھی بتایا گیا ہے۔ ان کی ایسی چالوں اور مکر و فریب کا مقابلہ صبر، دین پر ثابت قدمی اور تقویٰ سے کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری فتح و کامیابی اور تمام مشکلات میں آسانی کا راز صبر و استقامت اور تقوی کی دو صفتوں میں مضمر ہے۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کو ہر قسم کے مصائب اور پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے صبر و تقوی کو صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی ایک موثر علاج کی حیثیت سے بیان فرمایا۔ اسی سورۃ کے اختتام پر صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جا رہی ہے: یایھا الذین امنوا اصبروا و صابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔(200:3)

اس آیت میں بھی میں بھی فلاح و کامیابی کو صبر و تقوی پر معلق کیا گیا ہے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا: انہ من یتق ویصبر۔(90:12)۔ اس آیت میں بھی فلاح و کامیابی صبر و تقوی کے ساتھ وابستہ بتلائی گئی ہے۔

صبر و تقوی مختصر عنوان کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک کامیاب ضابطہ بیان کر دیا گیا۔

حدیث: حضرت ابوذر سے روایت ہے حضور ﷺ ارشاد گرامی ہے: انی لاعلم ایۃ لواخذ الناس بھا لکفتھم ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا۔۔۔الایۃ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل اختیار کرلیں تو ان کے دین و دنیا کے لئے وہی کافی ہے وہ آیت یہ ہے: ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا۔۔۔(2:65) یعنی جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (ہر مشکل سے نکلنے کا) راستہ بنا دیتے ہیں۔ (مسند احمد)

چوتھا رکوع: وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔۔۔(آل عمران۔121)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

غزوہ احد پر جامع تبصرہ، خامیوں کی نشاندہی، احد کے پس منظر میں ہدایات، اللہ پر توکل اہل ایمان کا شیوہ، غزوہ بدر میں نصرت الٰہی، اصل مددگار ہستی صرف اللہ رب العالمین، ہدایت دینا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

غزوہ احد کے پس منظر میں ہدایات

غزوہ احد پر تفصیلی تبصرہ۔ خامیوں کی نشاندہی

یہاں سے اس سورت کا چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ سورۃ آل عمران کا یہ حصہ جنگ احد کے بعد نازل ہوا جس میں جنگ احد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پچھلے رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا تھا کہ ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ (آل عمران۔120) اب چونکہ احد کے میدان میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو اللہ، رسولؐ کی اطاعت کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں انہیں ان کمزوریوں پر متنبہ کیا گیا ہے نازل ہوا۔

اس خطبے کا انداز بیان یہ ہے کہ جنگ احد کے سلسلہ میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے ان میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند جچے تلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

غزوہ احد کا خلاصہ

سورۃ آل عمران آیت: 21 سے جنگ احد پر تبصرہ کیا گیا جو شوال 3 ہجری کو پیش آئی۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ جب جنگ بدر 2 ہجری میں قریش مکّہ کو شکست ہوئی اور شدید نقصان ہوا تو ان کے لئے یہ بدنامی کا باعث اور مرنے کا مقام تھا، چنانچہ انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایک زبردست انتقامی جنگ کی تیاری کی جس میں

عورتیں بھی شریک ہوئیں۔ ادھر حضورؐ اور صحابہ کرام کو جب اس کا علم ہوا کہ دشمن تین ہزار کی تعداد میں احد پہاڑ کے نزدیک خیمہ زن ہو گئے ہیں تو نبی کریمؐ نے مدینہ کے اندر رہ کر ہی **دفاعی جنگ** کا مشورہ دیا اور رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے برعکس بعض پرجوش صحابہ کرام نے جنہیں جنگ بدر میں حصہ لینے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، مدینہ کے باہر جا کر لڑنے کی حمایت کی۔ آپؐ اندر حجرے میں تشریف فرما تھے زرہ پہن کر باہر آئے، دوسری رائے والوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہؐ کو آپ کی خواہش کے برعکس باہر نکلنے پر مجبور کر کے ٹھیک نہیں کیا چنانچہ انہوں نے کہا یا رسول اللہؐ! آپ اگر اندر رہ کر مقابلہ کرنا پسند فرمائیں تو اندر ہی رہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ لباس حرب پہن لینے کے بعد کسی نبی کے لائق نہیں کہ وہ اللہ کے فیصلے کے بغیر واپس ہو اور لباس اتارے۔ مگر اس موقع پر **عبد اللہ بن ابی کی غداری** کھل کر سامنے آگئی جب وہ اپنے تین سو ساتھیوں سمیت یہ کہہ کر واپس آگیا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی۔ حضورؐ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور صرف سات سو صحابہ کرام کو لے کر میدان میں اترے۔ اس موقع پر آپؐ نے **پچاس تیر انداز** صحابیوں کو الگ کر کے ان کا امیر حضرت عبد اللہ بن جبیر کو بنایا اور ان سے فرمادیا کہ پہاڑی پر چڑھ جاؤ اور اس بات کا خیال رکھو کہ دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ ہو دیکھو ہم غالب آجائیں یا (اللہ نہ کرے) مغلوب ہو جائیں تم ہرگز **اپنی جگہ سے نہ ہلنا**۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداء میں ہی دشمن کو شکست ہونے لگی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے کچھ لوگ مال غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور مال اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ادھر جن تیر اندازوں کو نبی اکرمؐ نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انہوں نے جو دیکھا کہ فتح مل گئی ہے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت اکٹھی کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ بن جبیر نے ان کو نبی کریمؐ کا تاکیدی حکم یاد دلا کر ان کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور سوائے چند آدمیوں کے کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے جو اس وقت مخالف لشکر کی قیادت کر رہے تھے، بروقت فائدہ اٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر پہلو کے درہ سے حملہ کر دیا۔ عبد اللہ بن جبیر نے جن کے ساتھ صرف چند آدمی رہ گئے تھے، اس حملہ کو روکنا چاہا مگر مدافعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک اہل اسلام پر ٹوٹ پڑا۔ دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا۔ مسلمانوں کی اکثریت واپس مدینہ چلی گئی۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اڑا دی گئی کہ نبی اکرمؐ شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی اکرمؐ کے گرد و پیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپؐ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ لیکن عین وقت پر صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ حضورؐ زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور

آپ ؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک معما ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے قریش مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر منتشر ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا ممکن تھا۔ اگر دشمن اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ خود بخود میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

اللہ پر توکل اہل ایمان کا شیوہ

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (آل عمران۔122)

یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ پستی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کا ولی اور مدد گار ہے۔ اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ (آل عمران۔122)

ان دو گروہوں سے مراد قبیلہ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ ہیں، ان دونوں نے عین جنگ سے پہلے اپنے اندر پستی اور کم ہمتی محسوس کی جس کی وجہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کی عین وقت پر دغابازی اور بزدلانہ واپسی تھی۔

یہ خیال یا وسوسہ جو ان دو گروہوں یعنی بنی حارثہ اور بنی سلمہ میں پیدا ہوا وہ اپنی قلت تعداد، قلت سامان اور مادی کمزوری کی بناء پر تھا نہ کہ ضعف ایمان کی بناء پر۔ لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور اس وسوسہ کو وسوسہ کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

مشہور مورخ ابن ہشام نے فرمایا: واللہ ولیھما کا جملہ خود ان کے ایمان کامل کی شہادت دے رہا ہے اس لئے ان دونوں قبیلوں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ: اگرچہ اس آیت میں ہم پر کچھ عتاب بھی ہے لیکن واللہ ولیھما کی بشارت بھی ہمارے لئے آئی ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ مسلمانوں کو اللہ پر اعتماد رکھنا چاہئے۔ اللہ رب العالمین نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ کثرت عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ بقدر استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ہونا چاہئے۔ بنو حارثہ اور بنو سلمہ کو

کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ اسی مادی ضعف کی بناء پر تھا اس لئے ان کے وسوسہ کا علاج توکل علی اللہ سے بتلایا گیا کہ توکل و اعتماد ان وساوس کے لئے نسخہ اکسیر ہے۔

توکل سے کیا مراد ہے؟

توکل ایک بندہ مومن کی اعلی صفات میں سے ہے۔ توکل کے معنی یہ نہیں کہ تمام اسباب ظاہری سے بالکل قطع تعلق کر کے اللہ پر اعتماد کیا جائے، بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام اسباب ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور اختیار کرے، اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے، اور ان ظاہری اسباب پر فخر و نازنہ کرے، بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے۔ نبی کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ اسباب کو اختیار کیا۔ صحابہ کرام کو منظم کرنا، اپنی قدرت کے مطابق سامان اور دیگر ضروریات کا خیال رکھنا یہ سب مادی انتظامات ہی تو تھے جن کو سید الانبیاءؑ نے اپنے دست مبارک سے استعمال فرما کر بتلادیا کہ مادی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں۔ مومن اور غیر مومن میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مومن سب سامان اور مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ و توکل صرف اللہ پر کرتا ہے، غیر مومن کو یہ روحانیت نصیب نہیں ہوتی، اس کو صرف اپنی مادی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ جب بھی اہل ایمان نے اللہ کی ذات پر کامل توکل کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی و نصرت سے سرفراز کیا۔

غزوہ بدر میں نصرت الٰہی

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (آل عمران۔123)

اور اللہ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی ہے جب کہ تم کمزور تھے لہذا اللہ سے ڈرو شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔ (آل عمران۔123)

غزوہ بدر اور تائید الٰہی

عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں بدر کے علاوہ فرشتے کبھی کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئے۔ یہ فرشتوں کا اترنا صرف مدد کیلئے اور تعداد بڑھانے کیلئے تھا نہ کہ لڑائی کیلئے، یہ بھی مروی ہے کہ یہ فرشتوں کا نازل کرنا اور تمہیں اس کی خبر دینا صرف تمہاری خوشی، دلجوئی اور اطمینان کیلئے ہے اور اس کا مقصد مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنا تھا۔ اللہ کو تو تمہاری آزمائش مقصود ہے ورنہ اللہ کو قدرت ہے کہ فرشتوں کو اتارے بغیر اور جنگ کے بغیر بھی تمہیں غالب کردے۔

اصل مدد گار ہستی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ اپنی مدد کے لیے فرشتوں کا یا کسی اور کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ اگلی آیت کے اندر وضاحت فرمائی گئی:

اصل مددگار ہستی: صرف اللہ رب العالمین

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۔ (آل عمران۔126)

اور اس چیز کو اللہ نے تمہارے دل کی خوشی کے لیے کیا ہے اور تا کہ تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والا ہے۔(آل عمران۔126)

ہدایت دینا صرف اللہ کے اختیار میں ہے

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۔ (آل عمران۔128)

آپ کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں چاہے تو اللہ انہیں توبہ کی توفیق دے یا انہیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ (آل عمران۔128)

نبی اکرم ﷺ جب جنگ احد میں زخمی ہوئے تو آپؐ کے منہ سے دشمنان اسلام کیلئے بد دعا نکل گئی اور آپؐ نے فرمایا کہ وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ یہ آیت اسی کے جواب میں نازل ہوئی جس میں رسول اللہؐ کو صبر و تحمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ کسی کو ہدایت دینا یا ان کے معاملے میں کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی اپنی ذات کے لیے کسی کو نہ بد دعا دیتے تھے، اور نہ اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام لیتے تھے۔ البتہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے بعض دشمنان اسلام کے لئے قنوت نازلہ کا اہتمام فرمایا جس میں ان کے لئے بد دعا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ آپؐ نے بد دعا کا سلسلہ بند فرمادیا۔ (بحوالہ ابن کثیر، فتح القدیر)

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ وہی لوگ جو اسلام دشمنی کی ساری حدیں پار کر چکے تھے بعد میں اللہ کی توفیق سے سب مسلمان ہوگئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مختار کل اور عالم الغیب ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

پانچواں رکوع: وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ۔۔۔ (آل عمران۔129)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

مالک کائنات ہستی: اللہ ربّ العالمین، استغفار اور لا الہٰ الا اللہ، اللہ کی رحمت کے حقدار لوگ، اللہ و رسولؐ کی اطاعت کرنے والوں کی صفات، مسابقت الی الخیرات، چند اخلاقی صفات کا تذکرہ، ہر حالت یعنی تنگی اور فراخی میں یاد خدا، غلطیوں کے بعد سچی توبہ کرو، مذکورہ صفات کے حامل لوگوں کیلئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ، قرآن کے چند نام: بیان للنّاس، ہدایت، موعظہ۔ زمین کی سیر کرو: سبق اور عبرت کیلئے، کامیابی کا راز: سچا ایمان۔ انسانی زندگی میں نشیب و فراز آتا رہتا ہے: تلک الایام نداولھا بین النّاس۔

استغفار اور لا الہٰ الّا اللہ

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمَاوَاتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (آل عمران۔129)

اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب کرے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (آل عمران۔129)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا الہٰ الّا اللہ کثرت سے پڑھا کرو اور استغفار پر مداومت کرو ابلیس گناہوں سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے اور اس کی اپنی ہلاکت لا الہ الا اللہ اور استغفار سے ہے۔ (مسند ابویعلیٰ)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے منبر پر فرمایا: لوگو تم اوروں پر رحم کرو اللہ تم پر رحم کرے گا۔ لوگو تم دوسروں کی خطائیں معاف کرو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔ (مسند احمد)

اللہ کی رحمت کے حقدار لوگ

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران۔132)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔ (آل عمران۔132)

اس آیت میں دو اہم نکات بیان کئے گئے:

1۔اس آیت میں ایک اہم نکتہ بیان بیان کیا گیا جو ہمیشہ یاد رکھنے اور اپنی عملی زندگی کا قبلہ بنانے کے قابل ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتی بلکہ اطاعت گزاروں کی کچھ صفات اور ہوتی ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔

2۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر رسول کی اطاعت بعینہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن کی اطاعت کا نام ہے تو پھر اس کے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر ان دونوں میں کچھ فرق ہے تو کیا ہے؟

رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ سے الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت

فرمایا گیا کہ:واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون۔یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔اس آیت میں رحمت خداوندی کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے،رسول اللہؐ کی اطاعت کو بھی اسی طرح لازم اور ضروری قرار دیا ہے،اور یہ پھر صرف اسی آیت میں نہیں پورے قرآن میں بار بار اس کا تکرار اسی طرح ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہوتا ہے وہیں اطاعت رسول کا بھی ذکر مستقلا ہے۔

قرآن حکیم کے یہ متواتر ارشادات ایک انسان کو اسلام اور ایمان کے بنیادی اصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ:

1۔ایمان کا پہلا جزء خدائے تعالیٰ کے وجود،اس کی وحدانیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے

2۔ایمان کا دوسرا جزء رسول اللہ کی تصدیق اور اس کی اطاعت ہے۔

اب یہاں غور طلب یہ ہے کہ قرآن کریم ہی کے ارشادات سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول کریم ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب باذن خداوندی ہوتا ہے،اپنی طرف سے کچھ نہیں ہوتا۔قرآن کریم کا ارشاد ہے:وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔(53:3۔4)یعنی رسول کریم ﷺ جو کچھ بولتے ہیں وہ کسی اپنی خواہش سے نہیں کہتے،بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی اطاعت بعینہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔سورۃ نساء آیت 80 میں خود قرآن نے بھی ان الفاظ میں اس کو واضح فرمادیا: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی،اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان دونوں اطاعتوں کو الگ الگ بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے ایک کتاب بھیجی،اور اس کتاب کی تعلیم اور تفسیر کیلئے ایک رسول کو بھیجا کہ وہ

اس کتاب کے مضامین کی امت کو تعلیم دیں، اس کے مقاصد کو بیان فرمائیں، نیز یہ کہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیں۔ يتلوا عليهم ايته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة۔ (2:62)

معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے فرائض منصبی میں صرف اتنا ہی داخل نہیں کہ وہ قرآن لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اس کی تعلیم اور تبیین بھی رسول کے ذمہ ہے۔ اس کی تشریح اور تفصیل رسول کریم ﷺ نے اس وحی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچائی جو قرآن کے الفاظ میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک میں ڈالی جس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ کی طرف آیت قرآن وما ينطق عن الهوىٰ۔ان هو الا وحی يوحى میں اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً قرآن نے بیشمار مواقع میں صرف اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فرمانے پر اکتفا کیا ہے، کہیں نماز کے معاملہ میں قیام، رکوع اور سجدہ کا ذکر بھی آیا تو وہ بھی بالکل مبہم ہے ان کی کیفیات کا ذکر نہیں، رسول کریم ﷺ کو جبریل امین نے خود آکر اللہ کے حکم سے ان تمام اعمال اور ارکان کی تفصیل صورت عمل کر کے بتلائی اور پھر آپؐ نے فرمایا: صلّو کما رایتمونی۔ نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔ اسی طرح قرآن حج کی فرضیت کا حکم دیتا ہے اس کے احکام اور مناسک کی تفصیل نہیں بتاتا۔ یہ حضورؐ ہیں جنہوں نے فرمایا: حذو عنی مناسککم۔ مجھ سے حج کے احکامات سیکھو۔ قرآن میں صرف زکوٰۃ ادا کرنے حکم ہے۔ اس کی تفصیل موجود نہیں۔ زکوۃ کے مختلف نصاب اور ہر نصاب پر زکوۃ کی مقدار کا تعین، پھر یہ بات کہ کس مال پر زکوٰۃ ہے اور کس مال پر نہیں، اور مقادیر نصاب میں کتنا حصہ معاف ہے، یہ سب تفصیلات رسول کریم ﷺ نے بیان فرمائیں۔

یہ تمام تفصیلات جو حضورؐ نے امت کو پہنچائیں، یہ تفصیلات قرآن کریم میں مذکور نہیں۔ اس لئے یہ احتمال تھا کہ کسی وقت کسی ناواقف کو یہ دھوکا ہو کہ یہ تفصیلی احکام اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان کی تعمیل ضروری نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے سارے قرآن میں بار بار اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے، جو حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے مگر ظاہری صورت اور تفصیل بیان کے اعتبار سے اس سے کچھ مختلف بھی ہے۔ اس لئے بار بار تاکیدات کے ساتھ بتلا دیا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں جو کچھ حکم دیں اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت سمجھ کر مانو، خواہ وہ قرآن میں صراحۃً موجود ہو یا نہ ہو۔ یہ مسئلہ چونکہ اہم تھا اور کسی ناواقف کو دھوکہ لگ جانے کے علاوہ دشمنان اسلام کے لئے اسلامی اصول میں گڑبڑ پھیلانے اور مسلمانوں کو اسلام کے صحیح راستہ سے بہکانے کا بھی ایک موقع تھا، اس لئے قرآن کریم نے اس مضمون کو صرف لفظ اطاعت رسول کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مختلف عنوانات سے امت مسلمہ کو بتایا ہے، مثلاً آپ کے فرائض میں تلاوت و تفسیر کتاب

کے ساتھ کچھ اور بھی آپ کی تعلیمات میں داخل ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے، جس کو لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس کا مطلب مفسرین نے سنت وحدیث لیا ہے۔

یہ سب انتظام اس کا کیا گیا کہ کل کو کوئی شخص یہ نہ کہنے لگے کہ ہم تو صرف ان احکام کے مکلف ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، جو احکام ہمیں قرآن میں نہ ملیں ان کے ہم مکلف نہیں۔ رسول کریم ﷺ کو بھی یہ حدشہ تھا کہ کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو رسول کی تعلیمات اور تشریحات سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے یہی دعوی کریں گے کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے، اس لئے ایک حدیث میں صراحۃ آپؐ نے اس کا ذکر فرمایا: لا الفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به او نهیت عنه فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب الله اتبعناه۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ تم سے کوئی اپنی مسند پر تکیہ لگائے ہوئے بے فکری سے بیٹھے ہوئے میرے امر و نہی کے متعلق یہ کہہ دے کہ ہم اس کو نہیں جانتے ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے، جو کچھ اس میں پاتے ہیں اس کا اتباع کر لیتے ہیں۔

(ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ جگہ جگہ رسول کی اطاعت کا بار بار ارشاد اور پھر مختلف عنوانات سے رسول کے دیے ہوئے احکام کو ماننے کی ہدایات یہ سب اس خطرہ کے پیش نظر ہیں کہ کوئی شخص ذخیرہ احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی بیان کی ہوئی تفصیلات احکام کو قرآن سے الگ اور اطاعت اللہ تعالیٰ سے جدا سمجھ کر انکار نہ کر بیٹھے، کہ وہ در حقیقت الگ نہیں:

بقول شاعر:

؎ گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

؎ انہیں کی کہہ رہا ہوں، زباں میری ہے بات ان کی۔

اگلی آیات میں اللہ ورسولؐ کی اطاعت کرنے والوں کی صفات کا ذکر کیا جارہا ہے:

مسابقت الی الخیرات

وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (آل عمران۔133)

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنّت کی طرف سبقت کرو جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ آل عمران۔133

اس آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مسارعت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں، یعنی وہ اعمال صالحہ جو باعث مغفرت الہی ہیں۔ صحابہ و تابعین سے اس کی تفسیریں مختلف عنوانات سے منقول ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تفسیر ادائیگی فرض سے فرمائی۔ حضرت ابن عباس نے اسلام سے۔ ابو العالیہ نے ہجرت سے، انس بن مالک نے تکبیر اولیٰ سے، سعید بن جبیر نے اداء اطاعت سے، ضحاک نے جہاد سے، عکرمہ نے توبہ سے کی ہے، ان تمام اقوال کا حاصل یہی ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمال صالحہ ہیں جو مغفرت الہی کا باعث اور سبب ہوتے ہیں۔

مسابقت الی الخیرات کا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت دنیا کے پیچھے لگ کر آخرت تباہ کرنے کے بجائے، اللہ اور رسول کی اطاعت اور اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کا راستہ اختیار کرو۔ جو متقین کے لئے اللہ نے تیار کیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالی نے مغفرت کو جنت سے مقدم کیا۔ اس میں ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جنت حاصل کر لینا مغفرت الہی کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ انسان اگر تمام عمر بھر نیکیاں کرتا ہے اور معصیت سے کنارہ کش رہے تب بھی اس کے تمام اعمال جنت کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ جنت میں لے جانے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ مغفرت باری تعالیٰ ہے اور اس کا فضل ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سددوا و قاربوا و ابشروا فانه لن يدخل احدا لجنة عمله قالوا ولا انت يا رسول الله قال ولا انا ان يتغمدنى الله برحمته۔

راستی اور حق کو اختیار کرو، درمیانی راہ اختیار کرو اور (اللہ کے فضل) کی بشارت حاصل کرو کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچائے گا، لوگوں نے کہا کیا آپ کا عمل بھی یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: ہاں میرا عمل بھی جنت میں نہیں پہنچائے گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ (بخاری، مسلم)

حاصل حدیث یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں، لیکن اللہ کی عادت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو اعمال صالحہ کرتا ہے، بلکہ جس کو اعمال صالحہ کی توفیق ہو گی، وہی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہیں، لہٰذا اعمال کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے، معلوم ہوا کہ دخول جنت کا اصلی باعث

اور سبب مغفرت الہی ہے، اسی لئے مغفرت کی اہمیت کے پیش نظر مطلق مغفرت نہیں فرمایا گیا، بلکہ مغفرۃ من ربکم فرمایا گیا جس سے صفت ربوبیت کے بیان کرنے میں مزید لطف اور امتنان کا اظہار مقصود ہے۔

اگلی آیات میں متقین کی چند خصوصیات بیان فرمائی جارہی ہیں:

چند اخلاقی صفات کا تذکرہ

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (آل عمران۔134)

جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آل عمران۔134

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنین متقین کی خاص صفات کا ذکر فرمایا ہے۔

ان آیات میں ان صفات کا بیان ہے جن کا تعلق انسانی حقوق اور معاشرت سے ہے۔ بعد کی آیات میں وہ صفات ہیں جن کا تعلق حق تعالیٰ کی عبادت و اطاعت سے ہے، جن کو دوسرے لفظوں میں حقوق العباد اور حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا آیات میں حقوق انسانی سے متعلقہ صفات کو پہلے اور حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کو بعد میں فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ حقوق العباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نظام عالم کی درستی اور انسانی معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا دارو مدار باہمی حقوق کی ادائیگی پر ہے، اس میں ذرا سی کوتاہی فتنہ و فساد کی راہیں کھول دیتی ہے۔ اگر انسان اپنے اخلاق اور رویے کو درست کرلے تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں، صدیوں کی لڑائیاں صلح و آشتی میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اس لئے بھی ان صفات و علامات کو مقدم کیا گیا جن کا تعلق انسانی معاشرت سے ہے۔

ان صفات میں سب سے پہلی صفت یہ بتلائی گئی ہے:الذین ینفقون فی السراء والضراء۔ یعنی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے ایسے عادی اور خوگر ہیں کہ ان پر فراخی ہو یا تنگی ہر حال میں مقدور بھر خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اس میں ایک طرف تو یہ ہدایت ہے کہ غریب فقیر آدمی بھی اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بالکل فارغ نہ سمجھیں، اور اس کی راہ میں خرچ کرنے کی سعادت سے محروم نہ ہوں، کیونکہ اللہ کے

نزدیک ایک ہزار پاؤنڈ میں سے دس پاؤنڈ خرچ کرنے کا جو درجہ ہے وہی دس پاؤنڈ میں سے دس پنس خرچ کرنے کا بھی ہے۔ دوسری طرف یہ ہدایت بھی ہے کہ تنگی کی حالت میں بھی بقدر حیثیت خرچ کرتے رہنے سے خرچ کرنے کی مبارک خصلت وعادت فنا نہیں ہوگی، اور شاید اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے مالی آسودگی اور فراخی بھی عطا فرمادیں۔

تیسری اہم چیز اس میں یہ ہے کہ جو شخص اس کا خوگر ہو کہ دوسرے انسانوں پر اپنا مال خرچ کرکے ان کو فائدہ پہنچا سکے، غریبوں، فقیروں کی امداد کرے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی دوسروں کے حقوق غصب کرنے اور ان کی مرضی کے خلاف ہضم کرنے کے پاس بھی نہ جائے گا، اس لئے اس پہلی صفت کا حاصل یہ ہوا کہ مومنین متقین اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں، خواہ ان پر فراخی ہو یا تنگی۔ حضرت عائشہؓ نے ایک وقت صرف ایک انگور کا دانہ خیرات میں دیا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا، بعض سلف سے منقول ہے کہ کسی وقت انہوں نے صرف ایک پیاز کا صدقہ کیا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و ردوا السائل ولو بظلف شاۃ۔ یعنی تم جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا صدقہ میں دے کر ہی ہو، اور سائل کو خالی واپس نہ کرو اور کچھ نہ ہو تو بکری کے پاؤں کی کھری ہی دیدو۔

تفسیر کبیر میں امام رازی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی تو جن کے پاس سونا چاندی تھا انہوں نے وہ صدقہ میں دیدیا، ایک شخص کھجور کے چھلکے لایا، کہ میرے پاس اور کچھ نہیں، وہ ہی صدقہ کردیئے گئے۔ ایک اور شخص آیا اور عرض کیا یارسول اللہ میرے پاس کوئی چیز صدقہ کرنے کے لئے نہیں ہے، البتہ میں اپنی قوم میں عزت دار سمجھا جاتا ہوں میں اپنی عزت کی خیرات کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی آدمی مجھے کتنا ہی برا بھلا کہے میں اس سے ناراض نہیں ہونگا۔

رسول کریم ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ کرام کے تعامل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انفاق فی سبیل اللہ صرف مالداروں اور اغنیاء ہی کا حصہ نہیں ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ضروری نہیں کہ مال ہی خرچ کیا جائے۔ غریب، فقیر بھی اس صفت کے حامل ہوسکتے ہیں کہ اپنی اپنی مقدرت کے موافق اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرکے اس عظیم صفت کو حاصل کرلیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ **ینفقون** کا توذکر فرمایا کہ وہ لوگ تنگی اور فراخی ہر حال میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں، یہ متعین نہیں فرمایا کہ کیا خرچ کرتے ہیں، اس کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف مال ودولت ہی نہیں بلکہ ہر خرچ کرنے کی چیز داخل ہے، مثلاً جو شخص اپنا **وقت**، اپنی **محنت** اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ بھی اس انفاق کی صفت سے موصوف کیا جائے گا، جو حدیث بحوالہ تفسیر کبیر اوپر گزری ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

تنگی اور فراخی کے ذکر میں ایک اور حکمت

تنگی اور فراخی یہی وہ حالتیں ہیں جن میں عادۃ انسان خدا کو بھولتا ہے جب مال ودولت کی فراوانی ہو تو **عیش** میں خدا کو بھول جاتا ہے اور جب تنگی اور **مصیبت** ہو تو بسا اوقات اسی کی فکر میں راہ کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو نہ عیش میں خدا کو بھولتے ہیں نہ مصیبت وتکلیف میں۔

بقول شاعر بہادر شاہ ظفر:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا خواہ ہو کتنا ہی ہو صاحب فہم وذکاء
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہے، طیش میں خوف خدا نہ رہے

حدیث: رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من سره ان يشرف له البنيان وترفع له الدرجت فليعف عن من ظلمه ويعط من حرمه ويصل من قطعه۔ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اونچے ہوں اور اس کے درجات بلند ہوں اس کو چاہئے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس سے عفو ودرگذر سے کام لے۔ اس کو عطا کرے جو اسے محروم رکھے اور جو اس سے ترک تعلق کرے اس سے قطع تعلقی نہ کرے۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ احسان کرنے کا خلق عظیم سکھلایا اور یہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: **ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینک و بینه عداوة كانه ولی حمیم۔** (34:41) یعنی برائی کی مدافعت بھلائی اور احسان کے ساتھ کرو، تو جس کے ساتھ دشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی اخلاقی تربیت بھی اسی اعلی پیمانہ پر فرمائی ہے کہ آپ نے اپنی امت کو بھی یہ ہدایت دی کہ: **صل من قطعک واعف عمن ظلمک واحسن الی من اساء الیک۔** یعنی جو شخص

آپ سے قطع تعلق کرے آپ ان سے میل جول باقی رکھیں اور جو آپ پر کے ساتھ ظلم وزیادتی کرے آپ اس کو معاف کردیں، اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے آپ اس کے ساتھ احسان اور بھلائی کریں۔

امام ابو حنیفہؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھرے بازار میں امام کی شان میں گستاخی کی اور گالیاں دیں۔ حضرت امام اعظمؒ نے غصہ کو ضبط فرمایا، اور اس کو کچھ نہیں کہا، اور گھر پر واپس آنے کے بعد ایک تھیلی میں درہم و دینار رکھ کر اس شخص کے گھر تشریف لے گئے، دروازے پر دستک دی، یہ شخص باہر آیا تو اشرفیوں کی یہ تھیلی اسے دیتے ہوئے فرمایا کہ آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا، اپنی نیکیاں مجھے دیدیں، میں اس احسان کا بدلہ کرنے کے لئے یہ تحفہ پیش کررہا ہوں۔ امام کے اس معاملہ کا اس کے قلب پر اثر ہونا ہی تھا، آئندہ کو اس بری خصلت سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوگیا۔ امام ابو حنیفہؒ سے معافی مانگی اور آپ کی خدمت اور صحبت میں علم حاصل کرنے لگا یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں میں ایک بڑے عالم کی حیثیت اختیار کرلی۔

البتہ حسن اخلاق میں اعتدال کی روش اپنانی چاہئے۔ حسن اخلاق کا رویہ سب کو راس نہیں آتا۔ کچھ لوگ اسے کمزوری پر محمول کرکے استحصال شروع کردیتے ہیں۔ کسی دانشور نے ایسی صورتحال پر بڑی ادیبانہ نصیحت کی:

ؔ لانک تسامحهم دائماً لا یشعروا باخطاءهم!

ولانک تبادر دائماً ینسوا

ولانک مهتم کثیراً یهملوا

احیاناً صفاتک الجمیلة هی سبب مشاکلک!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کے بتلائے ہوئے اعلیٰ اخلاق نصیب فرمادے۔ آمین

یہاں تک ان اوصاف کا بیان تھا جو انسانی حقوق سے متعلق ہیں، اس کے بعد حقوق اللہ سے متعلق صفات کا بیان اس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور کبھی بتقاضہ بشریت ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر استغفار کرتے ہیں اور آئندہ اس گناہوں سے باز آنے کا پختہ ارادہ کرلیتے ہیں۔

گناہوں کے بعد سچی توبہ کرو

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔135)

اور وہ لوگ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھیں یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں سے بخشش مانگتے ہیں، اور سوائے اللہ کے اور کون گناہ بخشنے والا ہے، اور اپنے کیے پر وہ اڑتے نہیں اور وہ جانتے ہیں۔ آل عمران۔135

اس آیت میں ایک تو یہ ہدایت کی گئی کہ گناہوں میں مبتلا ہونا اللہ تعالی کی یاد اور ذکر سے غفلت کے سبب ہوتا ہے، اس لئے جب کوئی گناہ سرزد ہو اللہ تعالیٰ کی یاد کو فوراً تازہ کرنا چاہئے، اور ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔

دوسری یہ ہدایت ہے کہ گناہوں کی معافی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک پچھلے گناہوں پر ندامت، اللہ سے معافی مانگنا اور مغفرت کی دعا کرنا، سچی توبہ اور استغفار کرنا، دوسرے آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا۔

امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں توبہ کی شرائط کا ذکر فرمایا:

1۔ گناہوں کو فوراً ترک کر دینا

2۔ پچھلے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنا

3۔ آئندہ کیلئے پختہ عزم کرنا کہ وہ گناہ کا اعادہ نہیں کرے گا۔

4۔ اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو دوسرے لوگوں کے حقوق کو پورا کرنا یا ان کے نقصانات کی تلافی کرنا۔

مذکورہ بالا صفات کے حامل لوگوں کیلئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ۔(آل عمران۔136)

ایسے لوگوں کا اجر ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (نیک) عمل کرنے والوں کا کیا ہی اچھا صلہ ہے۔ آل عمران-136

زمین کی سیر کرو: سبق اور عبرت حاصل کرنے کیلئے

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔ (آل عمران۔137)

تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، سو زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔(آل عمران۔137)

قرآن کے چند نام: بیان للنّاس، ھدایت، موعظہ

ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔(آل عمران۔138)

یہ لوگوں کے واسطے بیان ہے اور متقی لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ آل عمران۔138

کامیابی کا راز

وَلَا تَھِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (آل عمران۔139)

تم نہ سستی کرو اور نہ غمگین ہو تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایماندار رہو۔(آل عمران۔139)

مسلمانوں کو فرمایا جارہا ہے کہ احد میں تمہیں جو نقصان پہنچا ہے، اس سے نہ سست ہو اور نہ اس پر غم کھاؤ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایمانی قوت موجود رہی تو تم غالب اور کامران رہو گے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کا اصل راز اور بنیاد واضح کر دی ہے۔

احد میں شکست کے اسباب

غزوہ احد میں شکست کے تین سبب تھے:

1۔ شکست کی پہلی وجہ حضور ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی تھی۔ ٹیلے پر نگرانی کیلئے موجود لوگوں کے درمیان اختلاف ہو گیا اور وہ ٹیلہ پر موجود نہ رہے۔ تو پہلا سبب آپس کا اختلاف اور مال غنیمت کی طمع تھا۔

2۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب حضور کے قتل کی افواہ مشہور ہو گئی تو مسلمانوں کے قلوب میں کمزوری پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ بزدلی اور کم ہمتی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

3۔ تیسرا سبب جو ان دونوں سببوں سے زیادہ اہم تھا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل میں اختلاف پیش آیا۔

یہ تین لغزشیں ہوئیں جن کی بناء پر شکست ہوئی۔ اس شکست کے نتیجے میں دو چیزیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک تو شکست کا رنج و غم، جانی و مالی نقصانات۔ دوسری چیز جس کا خطرہ تھا کہ ان میں ہمیشہ کیلئے ضعف، دل شکنی پیدا نہ ہو جائے، اس لئے تسلی کیلئے فرمایا گیا: و لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

یعنی تم آئندہ کے لئے کمزوری اور سستی اپنے پاس نہ آنے دو، اور گزشتہ پر رنج وملال نہ کرو، اور انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے بشر طیکہ ایمان وایقان کے راستہ پر مستقیم رہو۔

مطلب یہ تھا کہ گزشتہ باتیں اور لغزشیں جو ہو چکی ہیں ان پر رنج وغم میں اپنا وقت اور توانائی صرف کرنے کے بجائے مستقبل میں اصلاح احوال کی فکر کرو۔ ایمان وایقان، اطاعت رسولؐ درخشاں مستقبل کا ضامن ہے ان کو ہاتھ سے نہ جانے دو، انجام کار تم ہی غالب رہو گے۔

اس قرآنی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، اور پژمردہ جسموں میں تازہ روح پھونک دی، غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی کس طرح تربیت واصلاح فرمائی اور ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ایک ضابطہ اور اصول دیدیا، کہ گزشتہ فوت شدہ امور پر رنج وملال میں وقت صرف کرنے کے بجائے مستقبل کی فکر ہونی چاہئے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلادیا گیا کہ غلبہ اور بلندی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی چیز اصل ہے یعنی ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا۔ ظاہری اسباب کو اختیار کرتے ہوئے اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنا۔

انسانی زندگی میں نشیب وفراز آتا رہتا ہے

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔۔۔ (آل عمران۔139)

یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ (آل عمران۔139)

ایک اور انداز سے مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ اگر جنگ احد میں تمہیں جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے تو اس میں دل برداشتہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ فتح وشکست کے ایام کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ کبھی غالب کو مغلوب اور کبھی مغلوب کو غالب کر دیتا ہے اور یہ بھی قدرت کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ انسان کو ہمیشہ کامیابی ہی ملتی رہے اور ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے تو اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی اصلاح کا موقع نہیں ملتا۔ مسلمان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ہر میدان میں اور ہر موقع پر کامیابی ہی ملنی چاہئے۔ اس دنیا کو اسباب کے تحت رکھا گیا ہے۔ دنیا میں کامیابی کیلئے اللہ رب العالمین نے کچھ اصول رکھے ہیں۔ جو ان اصولوں کی پیروی کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ لیس للانسان الّا ما سعیٰ۔

چھٹا رکوع: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔۔۔ (آل عمران۔144)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

نبی اکرمؐ کی شخصیت پر ایک خاص تناظر میں تبصرہ، موت کا ایک وقت مقرر ہے، شکر گزاروں کا بدلہ، اللہ کی راہ میں ثابت قدمی اور استقامت۔ توبہ، نصرت اور ثابت قدمی کی دعا، نیک اعمال کے باوجود عاجزی اور انکساری، اچھے لوگوں کیلئے دنیا و آخرت میں اجر۔

محمد رسول اللہ کی شخصیت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۔ (آل عمران۔144)

اور محمدؐ تو صرف اللہ کے رسول ہیں جیسے ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ رحلت فرما جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ (آل عمران۔144)

محمد ﷺ صرف اللہ کے رسول ہیں یعنی ان کا امتیاز وصف رسالت ہی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بشری خصائص سے بالاتر اور خدائی صفات سے متصف ہوں کہ انہیں موت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

آیت کا شان نزول: جنگ احد میں شکست کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ رسول اللہؐ کے بارے میں دشمنوں اور منافقین نے یہ افواہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے۔ مسلمانوں میں جب یہ خبر پھیلی تو اس سے بعض مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ لڑائی سے پیچھے ہٹ گئے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ نبی اکرمؐ کا رحلت فرما جانا یا ان کا شہید ہو جانا کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی قتل اور موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ اگر آپؐ بھی (بالفرض) اس سے دوچار ہو جائیں تو کیا تم اس دین سے ہی پھر جاؤ گے۔
جب نبیؐ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اس وقت منافقین نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ چلو عبد اللہ بن ابی کے پاس چلیں تاکہ وہ ہمارے لیے ابوسفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دین آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انہی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہاری حق

پرستی محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمہارا اسلام اتنا کمزور ہے کہ محمدؐ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفرو انکار کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے تو اللہ کے دین کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

اس آیت میں ایک اصولی بات کی طرف رہنمائی کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں رسول اکرم ﷺ کی عظمت و محبت جزو ایمان ہے وہیں یہ بات بھی اتنی ہی اہم تھی کہ کہیں مسلمان اس مرض کا شکار نہ ہو جائیں جس میں نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی عظمت و محبت کو پرستش اور عبادت کی حد تک پہنچا دیا اور ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک خدائی ٹھہرا لیا۔

غزوہ احد کی عارضی شکست کے وقت جب کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی تو صحابہ کرام پر جو کچھ گزری اس کا ادنیٰ سا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو صحابہ کرام کی جاں نثاری اور عشق رسول کا کچھ اندازہ ہو۔ جس کو یہ پوری طرح معلوم ہو کہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی محبت میں مال، اولاد اور اپنی جانیں اور سب کچھ گنوا دینے کو دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھا اور عمل سے اس کا ثبوت دیا۔ ان عاشقان رسول کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی ہو گی تو ان کے ہوش و حواس کا کیا عالم ہو گا خصوصا جب کہ میدان جنگ گرم ہے، اور فتح کے بعد شکست کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے، پاؤں اکھڑ رہے ہیں، اس منظر نامہ میں وہ ہستی جو ساری کوششوں کا محور اور ساری امیدوں کا مظہر تھی، وہ بھی ان سے رخصت ہونے کی خبر ملتی ہے۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کی ایک بھاری جماعت سراسیمہ ہو کر میدان جنگ سے ہٹنے لگی، یہ میدان سے پیچھے ہٹ جانا اگرچہ ہنگامی اور وقتی شاک کا نتیجہ تھا، خدانخواستہ اسلام سے پھر جانے کا کوئی شبہ یا وسوسہ بھی نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ نے ان پاکباز لوگ جو بعد میں آنے والوں کیلئے مشعل راہ اور مینارہ نور تھے، ان کیلئے اس ادنیٰ لغزش کو بھی سخت قرار دیا۔ لہٰذا اس آیت میں یہ تنبیہ کی گئی کہ دین اسلام میں عبادت صرف اللہ کیلئے ہے جو ہمیشہ زندہ اور قائم ہے، اگر بالفرض یہ خبر صحیح بھی ہوتی کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی تو بہر حال یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے اس پر ہمت ہار بیٹھنا اور دین کا کام چھوڑ دینا تمہارے شایان شان نہیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا: وما محمد الا رسول۔۔ یعنی محمدؐ ایک رسول ہیں (خدا تو نہیں)۔ آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اگر آپ کی وفات ہو جائے یا آپ کو شہید کر دیا جائے تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو کوئی الٹے پاؤں پھر جائے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکر گزاروں کو۔

اس آیت میں یہ حقیقت بھی بیان فرمادی کہ رسول اللہ ﷺ ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے مجروح ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز تھا کہ

آپؐ کے بعد جو حالات صحابہ کرام پر پیش آسکتے تھے وہ آپ کی دنیوی حیات ہی میں ظاہر کر دیئے گئے تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اصلاح خود حضورؐ کی زبان مبارک سے ہو جائے۔ اور آئندہ جب یہ واقعہ وفات سچ مچ پیش آئے تو یہ عاشقان رسول اپنے آپ کو اس سخت صدمے کیلئے ذہنی طور پر تیار کرلیں۔ چنانچہ یہی ہوا آپؐ کی وفات کے وقت جب بڑے بڑے صحابہ کرام کے ہوش وحواس باقی نہ رہے، تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی آیت قرآنیہ کی سند لے کر ان کو سمجھایا اور وہ سب سنبھل گئے۔ جس کی تفصیل احادیث میں آئی ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب حضورؐ کا وصال ہوا تو اس خبر کو سن کر حضرت ابو بکر صدیق مسجد نبویؐ میں تشریف لائے، لوگوں کی حالت دیکھی اور بغیر کچھ کہے سنے حضرت عائشہ کے گھر پر آئے یہاں حضورؐ پر چادر اوڑھادی گئی تھی آپ نے چادر کو ہٹایا اور آپؐ کا دیدار کیا، چہرہ انور کا بوسہ لیا اور روتے ہوئے فرمانے لگے میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپؐ پر دو مرتبہ موت نہ لائے گا جو موت آپ پر لکھ دی گئی تھی وہ آپ کو آچکی۔ اس کے بعد آپ پھر مسجد میں آئے اور دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کو شدت غم میں وفات نبوی کا یقین ہی نہیں آرہا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے منبر رسولؐ کے پہلو میں کھڑے ہو کر اسی آیت:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ۔۔۔ کی تلاوت فرمائی جس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی متاثر ہوئے اور انہیں محسوس ہوا کہ یہ آیات ابھی ابھی اتری ہیں۔ پھر تو ہر شخص کی زبان پر اس آیت کی تلاوت جاری ہو گئی اور لوگوں نے یقین کر لیا کہ آپؐ وصال فرما گئے ہیں۔

موت کا ایک وقت مقرر ہے

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔۔۔ (آل عمران۔145)

کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا، موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ (آل عمران۔145)

اس آیت میں بھی حوادث اور مصائب کے وقت ثابت قدم رہنے کی تعلیم دینے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کی موت اللہ تعالیٰ کے نزدیک لکھی ہوئی ہے اس کی تاریخ، دن اور وقت معین ہے، نہ اس سے پہلے کسی کو موت آسکتی ہے نہ اس کے بعد وہ زندہ رہ سکتا ہے، پھر کسی کی موت سے ایسے بے صبری کا مظاہرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسرا اس آیت سے یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ موت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد زندہ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ

اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت بھی تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری سعی وجہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

شکر گزاروں کا بدلہ

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَاۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْـهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ۔ (آل عمران۔145)

دنیا کی چاہت والوں کو ہم دنیا دے دیتے ہیں اور آخرت کا ثواب چاہنے والوں کو ہم وہ بھی دے دیں گے۔ اور ہم شکر گزاروں کو صلہ عطا کریں گے۔(آل عمران۔145)

ثواب کے معنی ہیں نتیجہ عمل۔ ثواب دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجہ میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجہ میں آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ کارزار حیات میں آدمی جو دوڑ دھوپ کر رہا ہے اس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اخروی نتائج پر۔

اللہ کی راہ میں ثابت قدمی اور استقامت

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔ (آل عمران۔146)

بہت سے نبیوں کے ہم رکاب ہو کر بہت سے اللہ والوں نے راہ خدا میں جنگ کی۔ تو ان پر جو تکالیف، مشکلات آئیں ان پر وہ نہ پست ہمت ہوئے اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔ اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(آل عمران۔146)

اس آیت میں سابق انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے اولیاء کی ثابت قدمی اور مصائب و شدائد سے نہ گھبرانا نہ کمزور ہونا جیسی صفات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

توبہ، استقامت اور نصرت کی دعا

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

(آل عمران۔147)

اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں پر عفوودرگزر فرما، ہم سے ہمارے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہے اسے بھی معاف فرما اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔(آل عمران۔147)

اس آیت میں نیک لوگوں کی دعاؤں کا ذکر ہے۔

نیک اعمال کرنے کے باوجود عاجزی وانکساری

اس آیت میں ایک خاص پیغام ہے کہ اپنے کسی نیک عمل پر ناز اور گھمنڈ نہیں کرنا چاہے بلکہ ہر حال میں اللہ سے مغفرت اور عمل پر قائم رہنے کی دعا کرتے رہنا چاہیۓ۔ ایک بندہ مومن ہمیشہ حقیقت شناس ہوتا ہے۔ وہ کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جدوجہد اللہ کی راہ میں کرلے، اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر ناز وفخر کرے، کیونکہ درحقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس کے بغیر کوئی نیک عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

حدیث: حضور ﷺ نے ایک حدیث کے اندر فرمایا: فوا اللہ لو لا اللہ ماھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا۔ یعنی اگر اللہ کا فضل وکرم اور اس کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں نہ سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی اور نہ ہم سے زکوٰۃ ادا ہوسکتی اور نہ ہی ہم نمازی بن سکتے تھے۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی انسان نیک عمل کرتا ہے تو وہ کتنا ہی درست کرلے وہ اس کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اللہ رب العالمین، مالک کائنات کی شان کے مطابق کرنا اس کے بس میں نہیں۔ اس لئے اس کی عبادت میں کوتاہی عین ممکن ہے۔ لہٰذا اس کو ہمیشہ استغفار کی ضرورت ہے کیونکہ جو نیک عمل وہ اس وقت کررہا ہے پتہ نہیں آگے مزید بھی اسے اس نیک عمل کی توفیق ہوگی یا نہیں۔

اس لئے موجودہ عمل میں کوتاہی پر ندامت اور آئندہ کے لئے اس پر قائم رہنے کی دعا مومن کا وظیفہ ہونا چاہیۓ۔ مذکورہ دعاؤں میں سب سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو رنج وغم یا کوئی تکلیف یا دشمن کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے وہ اکثر اس کے سابقہ گناہوں کا اثر ہوتا ہے، جس کا علاج استغفار وتوبہ ہے۔

مولانا رومی نے فرمایا:

؎ غم چو بینی زود استغفار کن

غم بامر خالق آمد کارکن

اچھے لوگوں کیلئے دنیا اور آخرت میں اجر

فَاٰتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (آل عمران۔148)

پھر اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا عمدہ بدلہ دیا، اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ آل عمران۔148

اس رکوع کی آخری آیت میں نیک لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں میں اچھا بدلہ دینے کا ذکر ہے کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انجام کار دشمنوں پر غالب اور اپنے مقصد میں کامیاب فرماتے ہیں، پھر آخرت کا بدلہ تو اصل بدلہ اور دائمی راحت ہے، جس کو کبھی فنا نہیں، اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ثواب آخرت کے ساتھ لفظ حسن بڑھا دیا گیا۔ وحسن ثواب الاخرۃ فرمایا۔

ساتواں رکوع: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔۔۔ (آل عمران۔149)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ اہل ایمان کا مولیٰ اور مددگار، دنیا کے طلب گار، آخرت کے طلب گار، غزوہ احد میں شکست امتحان کیلئے تھی، حقیقی اختیار اللہ کے پاس ہے، دلوں کے بھید جاننے والی ہستی، احد میں کمزوری دکھانے والوں معافی۔

اللہ ہمارا مولیٰ اور مددگار

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ۔ (آل عمران۔150)

بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔(آل عمران۔150)

احد کے موقع پر ابوسفیان نے نعرہ لگایا تھا کہ لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ کہ ہمارے لیے تو عزّیٰ بت مدد کے لیے موجود ہے لیکن تمہاری لئے تو کوئی عزّیٰ ہی نہیں ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا: تم اس کو جواب کیوں نہیں دیتے؟ صحابہ نے پوچھا کہ کیا جواب دیں؟ حضورؐ نے فرمایا تم کہو: اللہ مولٰنا ولا مولٰی لکم۔ اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

دنیا کے طلبگار اور آخرت کے طلبگار

جنگ احد میں شکست امتحان اور آزمائش کیلئے تھی

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (آل عمران۔152)

تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت کے طالب تھے پھر تمہیں ان سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائے اور البتہ بے شک اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے اور اللہ اہل ایمان پر فضل والا ہے۔(آل عمران۔152)

غزوہ احد میں جو مصائب اور تکالیف مسلمانوں کو پیش آئیں وہ بطور سزا نہیں بلکہ بطور آزمائش تھیں، اس امتحان کے ذریعہ مؤمنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اظہار کرنا تھا۔

حقیقی اختیار اللہ کے پاس ہے

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔۔ (آل عمران۔154)

تم فرمادو کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں یعنی ہر معاملے میں اصل اختیار اللہ کے پاس ہے۔۔ (آل عمران۔154)

مدد بھی اللہ کی طرف سے آئے گی اور کامیابی بھی اسی کے حکم سے ہو گی اور امر و نہی بھی اسی کا ہے۔

دلوں کے بھید جاننے والی ہستی

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (آل عمران۔154)

اور اللہ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔(آل عمران۔154)

احد میں کمزوری دکھانے والوں کیلئے معافی

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (آل عمران۔155)

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔(آل عمران۔155)

یعنی احد میں مسلمانوں سے جو لغزش اور کوتاہی ہوئی اس کی وجہ ان کی پچھلی کمزوریاں تھیں جس کی وجہ سے شیطان بھی انہیں پھسلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کی لغزشوں، ان کے نتائج اور حکمتوں کے بیان کے بعد پھر بھی اپنی طرف سے ان کی معافی کا اعلان فرما رہا ہے۔ اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اس شرف اور فضل کا اظہار ہے جو ان کی کوتاہیوں کے باوجود اللہ نے ان کے بارے میں ولقد عفا اللہ عنھم جیسے الفاظ میں فرمادیا۔ جس سے ایک تو صحابہ کرام کا مقام و مرتبہ، ان کا اللہ کی بارگاہ میں محبوب ہونا واضح ہے اور دوسرا اس آیت میں بادی النظر میں ایک تنبیہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کریم میں ان کے لئے عفو عام کا اعلان فرما دیا تو اب کسی کے لئے اعتراض کی گنجائش کہاں رہ گئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو معاف فرما دیا تو اب کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان کو ہدف تنقید بنائے۔ اس بنا پر امت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں لیکن اس کے باوجود امت کے لئے یہ جائز نہیں کہ ان کی طرف کسی برائی اور عیب کو منسوب کرے یا ان کا برا تذکرہ کیا جائے۔

صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک حج کے موقع پر ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بعض اعتراضات کیے کہ وہ جنگ بدر میں، بیعت رضوان میں شریک نہیں ہوئے۔ اسی طرح یوم احد میں بھی جان بچا گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جنگ بدر میں تو انکی اہلیہ (بنت رسولؐ) سخت علیل تھیں (اسی بیماری میں ان کا انتقال بھی ہوا تھا)، بیعت رضوان کے موقع پر آپ حضورؐ کے سفیر بن کر مکہ گئے ہوئے تھے اور یوم احد کی لغزش کو اللہ نے (سب کیلئے) معاف فرما دیا ہے۔ (تلخیص حدیث۔ صحیح بخاری، غزوہ احد)

آٹھواں رکوع: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔۔۔ (آل عمران۔156)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

غزوہ احد کے پس منظر میں مزید واقعات، شہدا کی حیات جاوداں، زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے، حضورؐ نرم مزاج اور رحمدل ہیں، داعیان حق اور مبلغین اسلام کیلئے اسوہ رسولؐ، احد میں شکست کی وجوہات، حضورؐ کو ہدایات، مشورہ اور شورائیت کی اہمیت، اللہ پر توکل کی فضیلت و اہمیت، نصرت الٰہی کے بغیر تم بے یار و مددگار ہو، غلول اور مالی خیانت، اللہ کی رضا کے مطابق چلنے والے، اللہ کے ہاں اعمال کے درجات، رسول اللہؐ کی ذمہ داریاں اور فرائض منصبی، تلاوت، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب و سنت، احد میں نقصان کی وجہ: اپنی ہی غلطی یعنی رسولؐ کی نافرمانی، منافقین کا طرز عمل، اللہ کسی کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔

زندگی، موت اللہ کے اختیار میں ہے

۔۔۔وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (آل عمران۔156)

۔۔۔اور اللہ ہی زندگی اور موت کا مالک ہے اور اللہ تمہارے اعمال خوب دیکھ رہا ہے۔(آل عمران۔156)

اہل ایمان کو اس عقیدہ سے روشناس کرایا جارہاہے کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے نیز یہ کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے اندر عزم، حوصلہ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ موت تو ہر صورت آنی ہے۔ موت تو مضبوط قلعوں کے اندر بھی آجاتی ہے۔ لیکن اگر موت ایسی آئے کہ جس کے بعد انسان اللہ کی مغفرت و رحمت کا مستحق قرار پائے تو یہ دنیا کے مال اسباب سے بہت بہتر ہے جس کے جمع کرنے میں انسان عمر کھپا دیتا ہے۔

حضورؐ رحمدل اور نرم مزاج تھے

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ۔ (آل عمران۔159)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان کیلئے رحم دل ہیں۔ اور اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔(آل عمران۔159)

نبی اکرم ﷺ جو صاحب خلق عظیم تھے، اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغمبر پر ایک احسان کا ذکر فرمارہاہے کہ آپؐ کے اندر جو نرمی اور ملائمت ہے یہ اللہ کی خاص مہربانی کا نتیجہ ہے اور یہ نرمی دعوت و تبلیغ کے لئے نہایت ضروری ہے اگر آپؐ کے اندر یہ نہ ہوتی بلکہ اس کے برعکس آپؐ خدانخواستہ تندخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے قریب ہونے کی بجائے آپؐ سے دور بھاگتے۔ اس لئے آپ درگزر، نرم دلی اور رحمدلی سے ہی کام لیتے رہئیے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کے اخلاق ہیں جن پر آپؐ کی بعثت ہوئی ہے یہ آیت ٹھیک اس آیت جیسی ہے آیت (لقد جاء کم۔۔بالمومنین روف الرّحیم) یعنی تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے جس پر تمہاری مشقت گراں گزرتی ہے جو تمہاری بھلائی کے حریص ہیں جو اہل ایمان پر شفقت اور رحم کرنے والے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں میں رسول اللہؐ کی صفات کو اگلی کتابوں میں پاتا ہوں کہ آپ سخت کلام، سخت دل، بازاروں میں شور مچانے والے اور برائی کا بدلہ لینے والے نہیں بلکہ عفوو درگذر کرنے والے اور معافی دینے والے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انّ اللہ امرنی بمداراۃ الناس کما امرنی باقامۃ الفرائض۔ لوگوں کی خاطر مدارت، خیر خواہی اور چشم پوشی کا مجھے اللہ کی جانب سے اسی طرح حکم کیا گیا ہے جس طرح فرائض کی پابندی کا۔(ترمذی)

داعیان حق اور مبلغین اسلام کیلئے اسوہ رسولؐ

اس آیت سے اصلاح اور تبلیغ کے آداب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ جو شخص رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کے کام کا ارادہ کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کی سختی برداشت نہیں ہو سکتی تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدد، کج خلقی اور انتہا پسندی کے ساتھ مخلوق خدا کو اپنے گرد جمع کر سکے اور ان کی اصلاح کا فرض انجام دے سکے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ تند خو، سخت طبیعت ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لئے تند خوئی، سخت کلامی زہر قاتل ہے اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

ان آیات میں مربّی و مبلغ کے لئے چند صفات کا ہونا ضروری قرار دیا گیا، اول سخت کلامی اور کج خلقی سے بچنا، دوسرے ان لوگوں سے کوئی غلطی یا ان کے متعلق ایذاء کی کوئی چیز صادر ہو جائے تو انتقام کے درپے نہ ہونا بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ کرنا، تیسرے یہ کہ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑنا، ان کے لئے دعا، و استغفار بھی کرتے رہنا اور معاشرتی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا۔

جیسا کہ آیت کے اگلے حصّے میں فرمایا گیا:

حضورؐ کو ہدایات

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ (آل عمران۔159)

(اے پیغمبرؐ) اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے لئے استغفار کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔ (آل عمران۔159)

احد میں شکست کی وجوہات:

رسولؐ کی نافرمانی،

بد نظمی،

منافقین کا کردار،

مال غنیمت پر نظر،

حضورؐ کو ہدایات:

در گزر،

ان کیلئے استغفار،

اور انکے ساتھ مشاورت

اس آیت میں ارشاد فرمایا: فاعف عنھم یعنی ان سے جو خطا ہو گئی ہے اس کو آپ معاف فرمادیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے۔ بلکہ عفوودر گزر سے کام لے، برا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو، ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا واستغفر لھم، یعنی آپ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں، جس میں یہ ہدایات ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں۔ بلکہ دل سے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑیں اور چونکہ سب سے بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی درستی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب اسے بچانے کے لئے بخشش کی دعا مانگیں۔

اس آیت سے مشاورت کی اہمیت، افادیت اور اس کی ضرورت و مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا۔ ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کو اس مشورہ کی حاجت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو امیری امت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے۔ (بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسول کو ہر کام بذریعہ وحی بتلادیتا، کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا، لیکن امت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے، اس لئے بہت سے امور ایسے چھوڑ دیئے جن میں صراحتا کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، ان میں آپ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشورے کا حکم آپ کو بطور وجوب کے دیا تھا، آپؐ کا اختیاری امر تھا یا محض امت کو مشورہ کی تعلیم دینا مقصود تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اس آیت میں حضرت ابو بکر و عمر سے مشورہ کرنے کا حکم ہے۔(حاکم)

حضورؐ کو مشاورت کا یہ حکم بعض کے نزدیک وجوب کے لئے اور بعض کے نزدیک استحباب کے لئے ہے کہ اس کا مقصد صحابہ کرام کی دل جوئی تھا(تطیباً لقلوبھم)۔(ابن کثیر)

حدیث: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحتاً قرآن میں نازل نہیں ہوا اور آپ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گذار فقہاء کو جمع کرو اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

امام شوکانی لکھتے ہیں کہ حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء سے ایسے معاملات میں مشورہ کریں جن کا انہیں علم نہیں ہے یا ان کے بارے میں انہیں اشکال ہیں۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ ایسے حکمران کو معزول کرنے پر کوئی اختلاف نہیں ہے جو اہل علم و اہل دین سے مشورہ نہیں کرتا۔

مشورہ کی اہمیت

مشورہ ایک مسنون عمل ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس پر عمل کرنے سے برکات حاصل ہوتی ہیں۔

مسئلہ گھر میں ہو، فیملی میں ہو، محلے میں ہو، شہر میں ہو، ملک میں ہو یا دنیا میں ہو، اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں سے مشاورت ضرور کرنی چاہئے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ وَلَاَ عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ۔

جو استخارہ کرتا ہے وہ نامراد نہیں ہوتا، جو مشورہ کرتا ہے، وہ نادم نہیں ہوتا اور جو میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ محتاج نہیں ہوتا۔(طبرانی و مجمع الزوائد)

حدیث: المستشار موتمن۔ جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہے۔(ترمذی، ابوداؤد)

حدیث: اذا استشار احدکم اخاہ فلیشر علیہ۔ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے مشورہ لے تو اسے چاہئے بھلی بات کا مشورہ دے۔(ابن ماجہ)

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

اللہ پر توکل کی فضیلت واہمیت

آیت کے آخری حصے سے توکل علی اللہ کی اہمیت معلوم ہوتا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ (آل عمران۔159)

پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔(آل عمران۔159)

اگلی آیت میں پھر توکل کی اہمیت کے بارے میں فرمایا گیا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (آل عمران۔160)

اہل ایمان کو اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہئے۔(آل عمران۔160)

نصرت الٰہی کے بغیر تم بے یارو مددگار ہو

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔(آل عمران۔160)

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دے تو پھر کون ایسا ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اہل ایمان کو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔(آل عمران۔160)

غلول اور مالی خیانت

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (آل عمران۔161)

اور کسی نبی کی نسبت یہ گمان ہی ممکن نہیں کہ وہ کچھ چھپائے گا، اور جو کوئی (کسی کا حق) چھپاتا ہے تو قیامت کے دن اسے وہ لانا پڑے گا جو اس نے چھپایا تھا، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (آل عمران۔161)

شان نزول: جنگ احد کے دوران جو لوگ اپنی متعین جگہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نہ پہنچے تو سارا مال دوسرے لے جائیں گے۔ اس پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ کیا تمہیں اپنے نبی محمدؐ کی امانت، دیانت پر اطمینان نہیں۔ یاد رکھو کہ ایک پیغمبر سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں کیونکہ خیانت، نبوت کے منافی ہے۔

اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ بغیر وجہ کسی پر خیانت کا الزام لگانا ویسے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہے لیکن کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہو گا نہایت ہی بیہودہ جسارت ہے کیونکہ انبیاء ہر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ اللہ رب العالمین نے اپنے پیارے حبیبؐ کی صفائی اور دفاع میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اس طرح کے انداز تکلم سے امت کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا گیا: لئن اشرکت لیحبطن عملک۔ اگر آپ بھی شرک کریں گے تو آپ کے اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے۔ حالانکہ آپؐ تو معصوم عن الخطاء ہیں۔ آپؐ سے شرک کا صدور نا ممکن ہے۔ ان جیسے الفاظ سے در حقیقت امت کو تعلیم دینا مقصود ہوتا ہے۔

آیت ماکان لنبی ان یغل اگرچہ ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی مگر اس آیت سے خیانت کے متعلق امت مسلمہ کو بہت ہی اہم ہدایت کر دی گئی۔ غلول کا اطلاق صرف مال غنیمت کی خیانت پر نہیں ہوتا بلکہ مطلق خیانت بھی اس میں شامل ہے۔ اس آیت سے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ کسی سربراہ مملکت کو بھی خیانت کا حق نہیں۔ عموماً اعلیٰ مناصب پر فائز لوگوں پر مالی معاملات میں روک ٹوک نہیں کی جاتی بلکہ من پسند مالی تصرفات کو ان کا استحقاق سمجھا جاتا ہے اور ان کو ایسے معاملات میں ہر اصول سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قربان جایئے دین اسلام کے اصول مساوات پر کہ دینی احکامات میں کسی کو مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ اس آیت میں امانت، دیانت کا کتنا بڑا معیار مقرر کر دیا گیا۔ اس آیت میں سبق ہے ہر سربراہ مملکت کیلئے، ہر وزیر خزانہ کیلئے، ہر امیر جماعت کیلئے، ہر امام کیلئے، ہر خزانچی کیلئے، ہر مسجد کے صدر یا کمیٹی ممبر کیلئے، ہر مدرسہ کے مہتمم کیلئے، ہر چیریٹی اور رفاہی ادارے کے ٹرسٹی کیلئے کہ بیت المال یا پبلک منی میں خرد برد کا اختیار کسی کو بھی نہیں۔ یہی حکم مساجد، مدارس، خانقاہوں، اوقاف کے اموال، زکوٰۃ و صدقات کے محصولات، چیریٹی منی، قومی خزانہ، پبلک منی اور ٹیکس پیئرز منی کا ہے جس میں ہزاروں

لاکھوں افراد کا چندہ اور کنٹری بیوشن ہوتی ہے۔ اس کو اسلامی اصطلاح میں بیت المال کہا جاتا ہے۔ بیت المال، اموال او قاف اور سرکاری خزانہ میں چوری اور کرپشن غلول کے حکم میں ہے۔

ایسا مال جس میں کئی افراد کا حصہ اس میں خیانت عام چوریوں اور خیانتوں سے زیادہ شدید جرم ہے۔ جس نے اجتماعی یا قومی مال میں خیانت یا کرپشن کی اس نے لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کی چوری کی۔ اگر کسی وقت اس کو تلافی کا خیال آ بھی جائے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے یا معاف کرائے بخلاف دوسری خیانت کے کہ کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کر بری ہو سکتا ہے۔

اجتماعی اموال میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہوتا ہے، جس نے اس میں چوری کی اس نے سب کی چوری کی۔ مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اس لئے آج کل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے اور لوگ اس کے انجام بد اور وبال عظیم سے غافل ہیں کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذاب جہنم کے میدان حشر کی رسوائی بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محرومی بھی۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

حدیث: صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو (اور یہ اعلان ہوتا ہے کہ اس نے مال غنیمت کا اونٹ چرایا تھا) وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہو گا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکم الٰہی پہنچا دیا تھا اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ بچائے یہ میدان حشر کی رسوائی ایسی ہو گی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہو گا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رسوائی سے بچ جائیں۔

حدیث: حضرت ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں کہ مجھے جب رسول اللہ ﷺ نے عامل بنا کر بھیجنا چاہا تو فرمایا: اے ابو مسعود! جاؤ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں قیامت کے دن اس حال میں پاؤں کہ تمہاری پیٹھ پر اونٹ ہو جو آواز نکال رہا ہو جسے تم نے خیانت سے لے لیا ہو۔۔۔ (ابو داؤد)

حدیث: حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے کہ: لایقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طہور ولا صدقۃ من غلول۔ اللہ تعالیٰ بغیر طہارت کے نماز کو اور خیانت کے مال میں سے صدقہ و خیرات کو قبول نہیں فرماتے۔

اللہ کی رضا کے مطابق چلنے والا

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللهِ وَمَأْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (آل عمران۔162)

بھلا جو شخص اللہ کی رضا کے مطابق چلنے والا ہو وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو غضب الٰہی کا مستحق ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو جو بدترین جگہ ہے۔(آل عمران۔162)

اللہ کے ہاں اعمال کے درجات

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللهِ ؕ وَاللهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔ (آل عمران۔163)

اللہ کے حضور ان کے مختلف درجات ہیں اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔(آل عمران۔163)

پھر فرمایا جارہا ہے کہ بھلائی اور برائی والے مختلف درجوں پر ہیں، نیکی والے جنت کے درجوں میں ہیں اور بدی والے جہنم کے طبقات میں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے مطابق درجات ہیں۔(الانعام:32) پھر فرمایا اللہ ان کے اعمال دیکھ رہا ہے اور عنقریب ان سب کو پورا بدلہ دے گا نہ نیکی ضائع ہو گی اور نہ بدی چھپ سکے گی بلکہ ہر عمل کے مطابق ہی جزا سزا ہو گی۔

رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریاں اور فرائض منصبی

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ۔(آل عمران۔164)

بے شک، اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہیں میں سے ایک ایسا پیغمبر بھیجا جو اللہ کی آیات انہیں سناتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔(آل عمران۔164)

اس آیت میں نبوت کے تین اہم مقاصد بیان کئے گئے ہیں:

1۔ تلاوت

2۔ تزکیہ

3۔ تعلیم کتاب و حکمت

تعلیم کتاب میں تلاوت از خود آجاتی ہے، تلاوت کے ساتھ ہی تعلیم ممکن ہے۔ اس کے باوجود تلاوت کو الگ ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس نقطے کی وضاحت مقصود ہے کہ تلاوت بجائے خود ایک مقدس اور اور نیک عمل ہے۔ اگرچہ قرآن کے معنی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرنا یقیناً ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن سے اعراض یا غفلت بھی جائز نہیں۔

تزکیہ سے مراد عقائد اور اعمال و اخلاق کی اصلاح ہے۔ جس طرح آپؐ نے انہیں شرک سے ہٹا کر توحید پر لگایا اسی طرح نہایت بد اخلاق اور بد اطوار قوم کو اخلاق اور کردار کی رفعتوں سے بھی ہمکنار کر دیا۔

حکمت سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک حدیث نبویؐ اور سنت نبویؐ ہے۔

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ ایک احسان کے طور پر بیان فرمارہا ہے۔ حقیقت میں یہ احسان عظیم ہے کہ وہ نبی انہی میں سے ہے جس سے ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے میں ہی اللہ کا پیغام پہنچائے گا جسے سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان ہوگا دوسرے لوگ اس سے مانوس اور قریب ہونگے۔ تیسرے انسان کے لئے انسان یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان و شعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری خوبیوں سے محروم ہوتے جو دعوت و تبلیغ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس لئے جتنے بھی انبیاءؑ آئے ہیں سب کے سب انسان ہی تھے۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت کے مطابق حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور پورے عالم کے لئے آپ کا وجود نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہے۔ اس جگہ اس کو صرف مؤمنین کے لئے فرمانا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کو بعض جگہ صرف متقین کے ساتھ مخصوص کر کے بیان فرمایا ھدی للمتقین۔ کہ یہ متقی لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔ لیکن دوسری جگہ قرآن مجید کو ساری انسانیت کیلئے ہدایت کا ذریعہ بتایا گیا۔ جیسا کہ آیت ھدی للناس سے واضح ہوتا ہے۔ اس فرق کی وجہ دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ اگرچہ رسول اللہؐ کا وجود باوجود سارے عالم اور ہر مومن و غیر مومن کے لئے نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہے اسی طرح قرآن کریم سارے عالم انسانیت کے لئے صحیفہ ہدایت ہے، مگر چونکہ اس نعمت و ہدایت کا نفع صرف مؤمنین اور متقین نے حاصل کیا اس لئے کسی جگہ اس کو ان کے ساتھ مخصوص کر کے بھی بیان کر دیا گیا۔

اگر موجودہ دور کا انسان روحانیت فراموش اور مادیت کا پرستار نہ ہوتا تو یہ مضمون کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں تھا، عقل سے کام لینے والا ہر انسان اس احسان عظیم کی حقیقت سے خود واقف ہوتا مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج کا انسان دنیا کے جانوروں میں ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے، اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی روح ہے اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر غافل ہو گیا ہے، اس لئے اس تشریح کی ضرورت ہوئی کہ انسان کو پہلے تو یہ بتلایا جائے کہ اس کی حقیت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقیقت انسان وہ روح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں آتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ انسانی روح کی صحیح تربیت کر کے انسان کو حقیقی انسان بنائیں، تا کہ اس کے بدن سے جو اعمال و افعال صادر ہوں وہ انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں، وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دوسرے انسانوں کو ایذاء اور تکلیف دیتا نہ پھرے اور خود اپنے بھی انجام کو سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے۔

ہمارے رسول کریمؐ کو جیسے تمام انبیاءؑ میں امامت و سیادت کا منصب حاصل ہے، انسان کو صحیح انسان بنانے میں بھی آپ کی شان تمام انبیاء سے بہت ممتاز ہے، آپ نے یہی کام افراد سازی کا انجام دیا اور انسانوں کا ایسا معاشرہ تیار کر دیا جس کا مقام فرشتوں سے آگے ہے اور زمین و آسمان نے اس سے پہلے ایسے انسان نہیں دیکھے کہ ان میں سے ایک ایک رسول اللہؐ کا زندہ معجزہ اور مینارہ نور ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے اپنی سیرت اور علمی تعلیمات چھوڑی ہیں ، یہ تعلیمات اور سیرت نبویؐ سارے عالم اور ساری انسانیت کیلئے اسوہ حسنہ ہے۔ اس لحاظ سے آپؐ کا وجود پورے عالم انسانیت کیلئے احسان عظیم ہے اگر چہ اس سے زیادہ نفع اہل ایمان نے ہی نے اٹھایا ہے۔

احد میں نقصان کی وجہ: اپنی ہی غلطی یعنی رسولؐ کی نافرمانی

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران۔165)

اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو گنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے اے نبیؐ! اِن سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (آل عمران۔165)

اس آیت میں جس مصیبت کا ذکر ہو رہا ہے یہ احد کی مصیبت ہے جس میں مسلمانوں کا کافی جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔

اکابر صحابہ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے، مگر عام لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے تو کسی حال میں دشمن ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب احد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے حیران ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ آیات اسی حیرانی کو دور کرنے کے لیے ارشاد ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ یعنی یہ تمہاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ یعنی تمہاری اس غلطی کی وجہ سے جو رسول اللہؐ کے تاکیدی حکم کے باوجود متعین جگہ چھوڑ کر تم نے کی تھی۔ اس غلطی یعنی رسولؐ کی نافرمانی کی وجہ سے قریش مکہ کو دوبارہ حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اسی طرح تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے۔ (بحوالہ ابن کثیر)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ: بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں بدر میں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو وہ تمہیں احد میں (خامیوں کی اصلاح کیلئے) شکست دینے کی بھی قدرت رکھتا ہے کیونکہ ہر چیز اس کے اختیار میں ہے۔

منافقین کا طرز عمل

یَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاہِھِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یَکۡتُمُوۡنَ ۚ۔ (آل عمران۔167)

وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ (آل عمران۔167)

اللہ اجر کو ضائع نہیں کرتے

۔۔وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ (آل عمران۔171)

۔۔اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ (آل عمران۔171)

نواں رکوع: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔۔۔ (آل عمران۔172)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں احد میں شکست خوردگی کے بعد بھی رسولؐ کی پکار پر لبیک کہنے والے جانثار صحابہ کی تعریف کی گئی۔ اللہ پر توکل اور بھروسے کی دعا، توکل کا نتیجہ: بغیر جنگ اور نقصان کے واپسی، اللہ پر توکل کی برکات، شیطانی وساوس اور توہمات، حضورؐ کو تسلی اور اطمینان، انکار اور تکذیب کے خریدار، اللہ کی مہلت، بخل کی مذمت، کل نفس ذائقۃ الموت، ایمان کے بعد آزمائش ضرور ہوگی، حق گوئی اور کلمہ حق، علماء کا فرض منصبی، جھوٹی شہرت چاہنے والوں کی مذمت، حقیقی اختیار اور قدرت کی حامل ہستی۔

جب قریش مکہ جنگ احد سے واپس ہوئے تو راستے میں انہیں خیال آیا کہ ہم نے تو ایک سنہری موقع ضائع کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ نبی اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھی شکست کی وجہ سے خوف زدہ اور بے حوصلہ ہو چکے ہونگے لہٰذا ہمیں اس سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ مدینہ پر حملہ کر دینا چاہیے تھا تاکہ (نعوذ باللہ) اسلام کا یہ پودا اپنی سرزمین (مدینہ) سے ہی نیست و نابود ہو جائے۔ ادھر مدینہ پہنچ کر نبی کریمؐ کو بھی اندیشہ ہوا کہ شاید مکہ والے پلٹ کر آئیں لہٰذا آپؐ نے صحابہ کرام کو دوبارہ مقابلے کیلئے آمادہ کیا جس پر صحابہ کرام تیار ہو گئے۔ مسلمانوں کا یہ قافلہ جب مدینہ سے 8 میل واقع حمراء الاسد پر پہنچا تو قریش مکہ کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں ہمیں شکست نہ ہو جائے چنانچہ انہوں نے اپنا ارادہ بدل لیا، وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے بجائے مکہ واپس چلے گئے، اس کے بعد نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء بھی مدینہ واپس آ گئے۔ اگرچہ اس صورتحال میں کوئی نئی جنگ نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی اللہ ربّ العالمین نے صحابہ کرام کے جذبہ اطاعت کی تعریف ان الفاظ میں کی:

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛلِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ (آل عمران۔172)

جن لوگوں نے شکست کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا، ان میں سے جو نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ (آل عمران۔172)

کہا جاتا ہے کہ ابوسفیان نے بعض لوگوں کو معاوضہ دے کر مدینہ میں یہ افواہ پھیلائی کہ قریش مکہ لڑائی کے لئے بھرپور تیاری کر رہے ہیں تاکہ یہ سن کر اہل اسلام کے حوصلے پست ہو جائیں، لیکن اس قسم کی افواہیں سن کر صحابہ کرام

خوف زدہ ہونے کے بجائے مزید عزم اور حوصلہ سے سرشار ہوگئے جن کی تعریف اگلی آیت میں کی جارہی ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (آل عمران۔173)

جنہیں لوگوں نے کہا کہ مکہ والوں نے تمہارے مقابلے کے لیے تیاری کی ہے سو تم ان سے ڈرو۔ تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہا کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔(آل عمران۔173)

اللہ پر توکل اور بھروسے کی دعا

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔(آل عمران۔173)

ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ آل عمران۔173

حدیث میں حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ پڑھنے کی فضیلت موجود ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔(فتح القدیر)

رسول اکرم ﷺ نے خود اسی آیت حسبنا اللہ و نعم الوکیل کے بارے میں ایک حدیث کے اندر فرمایا ہے:

عوف بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں دو شخصوں کا مقدمہ آیا۔ آپؐ نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا۔ یہ فیصلہ جس شخص کے خلاف تھا اس نے فیصلہ سنا اور یہ کہتے ہوئے چلنے لگا کہ حسبی اللہ و نعم الوکیل۔ حضورؐ نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس لاؤ اور پھر اس کو نصیحت فرمائی: اللہ تعالیٰ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے کو ناپسند کرتا ہے۔ تم کو چاہئے کہ پہلے تمام ذرائع اختیار کرو پھر عاجز ہو جاؤ اس وقت کہو حسبی اللہ و نعم الوکیل۔

توکل کا نتیجہ: بغیر جنگ اور نقصان کے واپسی

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ۔(آل عمران۔174)

آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ (بغیر جنگ کے) واپس آ گئے، ان کو کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں پہنچی اور اللہ کی رضامندی پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔(آل عمران۔174)

نعۡمَة سے مراد سلامتی ہے یعنی وہ امن سلامتی کے ساتھ بغیر جنگ کے واپس گھروں میں آ گئے۔

فضل سے مراد نفع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مقام پر گزرنے والے قافلے سے سامان تجارت خرید کر فروخت کیا جس سے نفع حاصل ہوا اور آپؐ نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔(ابن کثیر)

اللہ پر توکل کی برکات

پچھلی آیت میں اللہ پر توکل کا حکم تھا۔اس آیت میں حسبنا اللہ ونعم الوکیل کی دعاء کے فوائد و ثمرات اور برکات کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو تین نعمتیں عطا کیں۔

1۔ پہلی نعمت تو یہ کہ قریش مکہ کے قلوب میں رعب و ہیبت ڈال دی اور دشمن لوگ بھاگ گئے جس کی وجہ سے یہ حضرات قتل و قتال سے محفوظ رہے۔ اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نے نعمت ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

2۔ دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ ان حضرات کو حمراء الاسد کے بازار میں تجارت کا موقع ملا اور اس مال سے منافع حاصل ہوا۔ یہ ایک لحاظ سے دنیاوی فائدہ تھا لیکن اللہ نے اس کو بھی اپنے فضل اور نعمت سے تعبیر فرمایا۔

3۔ تیسری نعمت جو ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے وہ رضائے الٰہی کا حصول ہے جو اس مہم کے نتیجے میں ان حضرات کو خاص انداز میں حاصل ہوئی۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل کے جو فوائد و برکات قرآن کریم نے بیان فرمائے وہ صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ جو شخص بھی جذبہ ایمانی کے ساتھ اس آیت کا ورد کرے وہ انشاء اللہ یہ برکات حاصل کر لے گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھ کر دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتا۔ پریشانیوں اور مصائب کے وقت حسبنا اللہ و نعم الوکیل کا پڑھنا مجرب ہے۔

شیطانی شرارت، وساوس اور توہمات

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔(آل عمران۔175)

دراصل اس (شرارت) کے پس پردہ شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے چیلوں سے ڈراتا ہے۔ اور تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اگر سچے مؤمن ہو۔(آل عمران۔175)

حضورؐ کو تسلّی اور اطمینان

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَ لَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (آل عمران۔176)

(اے پیغمبرؐ) جو لوگ آج انکار اور تکذیب کی راہ میں بڑی گرمجوشی دکھارہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمھیں پریشان نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔(آل عمران۔176)

نبی اکرم ﷺ کے اندر اس بات کی شدید خواہش اور حسرت تھی کہ کاش سارے ہی لوگ مسلمان ہوجائیں، اسی لئے ان کے انکار اور تکذیب سے آپؐ کو سخت تکلیف پہنچتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپؐ غمگین اور پریشان نہ ہوں، یہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اپنی ہی آخرت برباد کررہے ہیں۔

انکار و تکذیب کے خریدار

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِيْمٌ۔(آل عمران۔177)

جنہوں نے ایمان کے بدلے انکار و تکذیب خرید لیا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (آل عمران۔177)

اللہ کی مہلت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (آل عمران۔178)

اور انکار و تکذیب کی راہ پر چلنے والے لوگ اس گمان میں نہ رہیں کہ ہم جو ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ ہم تو انہیں اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں، (آخرکار) ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔(آل عمران۔178)

اس آیت میں اللہ کے قانون امہال (مہلت دینے) کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مشیت کے مطابق انسانوں کو مہلت عطا فرماتے ہیں۔ وقتی طور پر انہیں دنیا کی فراغت و خوش حالی سے، مال اولاد سے نوازتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پر اللہ کا فضل ہو رہا ہے لیکن اگر اللہ کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والے نیکی اور اطاعت الٰہی کا راستہ اختیار نہیں کرتے تو یہ دنیاوی نعمتیں، فضل الٰہی نہیں، مہلت الٰہی ہے۔ جس سے بعض دفعہ ان کی نافرمانی اور فسق میں اضافہ ہوتا ہے۔ بالآخروہ جہنم کے دائمی عذاب کے مستحق قرار پا جاتے ہیں۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اور بھی کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔

ایمان اور تقویٰ رکھنے والوں کیلئے اجر عظیم

۔۔فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ (آل عمران۔179)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔(آل عمران۔179)

بخل کی مذمت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ (آل عمران۔180)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔(آل عمران۔180)

اس آیت میں بخل کی مذمت اور اس پر وعید مذکور ہے۔ اس میں اس بخیل کا ذکر ہے جو اللہ کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا حتی کہ اس میں سے فرض زکوۃ بھی نہیں نکالتا۔ آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے وہ دراصل اللہ کی ملکیت ہے اور اس پر مخلوق کا تصرف اور قبضہ عارضی ہے۔ پھر ہر ایک نے اپنے مقبوضات سے بہر حال ایک دن بے دخل ہو جانا ہے اور آخر کار سب کچھ اللہ ہی کے

پاس رہ جانے والا ہے۔ لہٰذا عقل مند ہے وہ جو اس عارضی قبضہ کے دوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے۔ اور سخت بیوقوف ہے وہ جو بخل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا۔

بخل سے کیا مراد ہے؟

بخل کے شرعی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے۔ اسی لئے بخل حرام ہے اور اس پر جہنم کی وعید ہے۔ جن مواقع پر خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے وہ اس بخل میں داخل نہیں البتہ عام معنوں میں اس کو بھی بخل کہہ دیا جاتا ہے، اس قسم کا بخل حرام نہیں، مگر خلاف اولیٰ ہے۔ بخل ہی کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے، یعنی شح۔ اس کی تعریف یہ ہی کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے، اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا رہے، تو وہ بخل سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یعنی شح و ایمان کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (قرطبی)

بخل کی جو سزا اس آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ قیامت کے روز جس چیز کے دینے میں بخل کیا اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ اس کی تفسیر رسول اللہؐ نے اس حدیث کے اندر فرمائی ہے:

حدیث: حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ (نسائی از تفسیر قرطبی)

دسواں رکوع: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا۔۔۔ (آل عمران۔181)

جب اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (الحدید:11) کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے! تو کچھ لوگوں نے کہا کہ اے محمدؐ تیرا رب فقیر ہو گیا ہے کہ اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے؟ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا عنوان اس لئے دے دیا گیا کہ جس طرح قرض کی ادائیگی ہر شریف آدمی کے لئے ضروری اور یقینی ہوتی ہے، اسی طرح جو صدقہ انسان دیتا ہے اس کی جزاء اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ ایسی قرار دیتے ہیں جیسے کسی کا قرض دینا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق اور مالک جانتا ہے، اس کو ان الفاظ سے کبھی وہ شبہ نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ کو تسلّی

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ۔ (آل عمران۔184)

پھر اگر یہ لوگ تم کو سچا نہ سمجھیں تو تم سے پہلے بہت سے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آ چکے ہیں اور لوگوں نے ان کو بھی سچا نہیں سمجھا۔(آل عمران۔184)

کل نفس ذائقۃ الموت

موت وحیات، یوم حساب، اصل کامیابی

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔(آل عمران۔185)

ہر ذی روح نے موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تمہارے اجر پورے کے پورے قیامت کے دن ہی دیئے جائیں گے، پس جو کوئی دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ واقعۃً کامیاب ہو گیا، اور دنیا کی زندگی دھوکے کے مال کے سوا کچھ بھی نہیں۔(آل عمران۔185)

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ موت سے مفر نہیں۔ اس آیت میں ہر ذی روح کیلئے اطلاع عام ہے کہ اس کو ایک دن موت آنی ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے۔ اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔(سورۃ الرّحمٰن۔26۔27)

دوسرا یہ کہ ایک دن یوم حساب قائم ہو گا تاکہ جزاء و سزا کا عمل مکمل کیا جا سکے۔ دنیا میں جس نے اچھا یا برا جو کچھ کیا اس کو اس کا آخرت میں پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ہر حقدار کو اس کا حق دیا جائے گا۔ ہر ظالم کو اس کے ظلم کی سزا ملے گی۔

تیسرا کامیابی کا معیار بتایا گیا کہ کامیاب اصل میں وہ ہے جس نے دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی کر لیا جس کے نتیجے میں جہنم سے دور اور جنت میں داخل کر دیا گیا۔

چوتھا یہ کہ دنیا کی زندگی سامان فریب ہے، جو اس سے دامن بچا کر نکل گیا، وہ خوش نصیب ہے اور جو اس کے فریب میں پھنس گیا وہ ناکام اور نامراد ہے۔

پانچواں یہ کہ اس دنیا میں انسانی زندگی میں جو نشیب وفراز آتے ہیں اور جو نتائج رونما ہوتے ہیں انہی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور انہی پر حق و باطل، فلاح و خسران، اور کامیابی و ناکامی کے فیصلے کا مدار رکھے تو در حقیقت وہ سخت دھوکہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بارگاہ الٰہی کا دھتکارا ہوا اور مردود ہے۔ اکثر اوقات دنیا کے نتائج ان آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیات ابدی کے مرحلہ میں پیش آنے والے ہیں۔ اور اصل اہمیت اور اعتبار آخری نتیجہ اور انجام کا ہی ہے۔

ایمان کے بعد آزمائش ضرور ہو گی

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (آل عمران۔185)

(اے اہل ایمان) تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی۔ تمہیں ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان لوگوں سے جو شرک میں مبتلا ہیں بہت سی تکلیف دہ باتیں سننے کو ملیں گی۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو گے تو یہ بڑے حوصلہ اور ہمت کا کام ہے۔ (آل عمران۔185)

یہ آیت نبی اکرم ﷺ، اسلام اور اہل اسلام کے خلاف مختلف انداز سے طعن و تشنیع اور گستاخانہ رویے کے جواب میں نازل ہوئی۔ مدینہ میں آنے کے بعد منافقین بالخصوص ان کا رئیس عبد اللہ بن ابی آپؐ کی شان میں استخفاف کرتا رہتا تھا۔ آپؐ کے مدینہ آنے سے قبل اہل مدینہ اسے اپنا سردار بنانے لگے تھے اور اس کے سر پر تاجِ سیادت رکھنے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ آپؐ کے آنے سے اس کا یہ سارا خواب بکھر کر رہ گیا، جس کا اسے شدید صدمہ تھا چنانچہ انتقام کے طور پر بھی یہ شخص آپ کے خلاف کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کے علاوہ قریش مکہ اور مخصوص اہل کتاب کا رویہ اور پروپیگنڈہ مہم بھی آپؐ اور اہل ایمان کے خلاف جاری رہتی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کو عفو و درگزر اور صبر اور تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ داعیانِ حق کا اذیتوں اور مشکلات سے دوچار ہونا اس راہ حق کے ناگزیر مرحلوں میں سے ہے اور اس کا علاج صبر فی اللہ، استعانت باللہ اور رجوع الی اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

حق گوئی اور کلمہ حق: علماء کا فرض منصبی

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔۔۔ (آل عمران۔187)

اور یاد کرو جب اللہ نے ان سے عہد لیا جنہیں کتاب عطا فرمائی کہ تم ضرور اسے سب لوگوں سے بیان کروگے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔۔۔(آل عمران۔187)

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ علماء اہل کتاب سے اللہ تعالی نے عہد (میثاق) لیا۔ اس عہد میں ان کو یہ تاکیدی حکم دیا گیا تھا کہ تم آسمانی ہدایت کو ضرور لوگوں کے سامنے پوری طرح کھول کر بیان کروگے اور اس کو لوگوں سے ہر گز نہ چھپاؤ گے۔

ان آیات میں علماء اہل کتاب کے دو گناہ بیان کئے گئے۔

1۔ ان کو یہ حکم ہوا تھا کہ اللہ تعالی کی طرف سے جو احکامات آئیں ان کو سب کے سامنے بے کم وکاست بیان کریں گے اور کسی حکم کو چھپائیں گے نہیں، مگر انہوں نے اپنی دنیوی اغراض اور طمع نفسانی کی خاطر اس عہد کی پروانہ کی، بہت سے احکام کو لوگوں سے چھپالیا۔

2۔ دوسرے یہ کہ وہ نیک عمل نہیں کرتے تھے مگر چاہتے تھے کہ بغیر عمل کے ان کی تعریف کی جائے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں کتمان سے مراد اس کے احکامات کو دوسروں کے سامنے بیان نہ کرنا ہے۔ امت مسلمہ بھی اگر ایسا کرے کہ وہ قرآن کو دوسروں تک نہ پہنچائے بلکہ اس کے احکامات کو چھپائے تو یہ اس کے لیے قرآن کے کتمان کے ہم معنی ہو گا۔ اس قسم کا کتمان جس طرح علماء اہل کتاب کیلئے اللہ کے نزدیک اپنی اصل حیثیت کو کھونے کے مترادف تھا، اسی طرح یہ کتمان امت محمدیؐ کے لیے بھی اس کی اصل حیثیت کو کھونے کے ہم معنی ثابت ہو گا۔ بقول شاعر:

؎ وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اس آیت میں جس حکم کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک مطلب اللہ کی ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہے۔ یہ عین وہی حکم ہے جس کو امت مسلمہ کی نسبت سے شہادت علی الناس (البقرہ:143) میں بیان کیا گیا۔ شہادت علی الناس یا دعوت علی الناس کی یہی ذمے داری اب امت مسلمہ کے اوپر ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے علم دین کا چھپانا حرام ہے، مگر یہ حرمت اس کتمان دین یا کتمان حق کی ہے جو دنیاوی یا مالی مفاد یا طمع کی وجہ سے کیا جائے۔ لیکن بعض اوقات کسی حکم کے اظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس خطرہ کے پیش نظر مصلحتاً اگر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

جھوٹی شہرت چاہنے والوں کی مذمت

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِيْمٌ۔ (آل عمران۔188)

وہ لوگ جو اپنے مصنوعی اعمال پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے ان پر بھی ان کی تعریف و ستائش کی جائے۔ آپ انہیں ہرگز عذاب سے نجات پانے والا نہ سمجھیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(آل عمران۔188)

اس آیت میں ایسے لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو اپنے کارناموں پر خوش ہی نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان کے کھاتے میں وہ کارنامے بھی درج یا ظاہر کئے جائیں جو انہوں نے نہیں کئے ہوتے۔ یہ بیماری جس طرح عہد رسالت کے بعض لوگوں میں تھی جن کیلئے اس آیت کا نزول ہوا، اسی طرح آج بھی جھوٹی شہرت کے طلبگار، جاہ پسند قسم کے لوگوں اور پروپیگنڈے کے ذریعے سے بننے والے لیڈروں میں یہ بیماری عام ہے، چاہے وہ سیاسی رہنما ہوں یا مذہبی رہنما مثلاً وہ اپنی تعریف میں یہ سننا چاہتے ہیں کہ وہ قوم کے ساتھ بڑے مخلص ہیں، بڑے متقی ہیں، دیندار اور پارسا ہیں خادم دین ہیں، حامی شرع متین ہیں، مصلح و مزکی ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں یا وہ اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پٹوانا چاہتے ہیں کہ فلاں سیاسی لیڈر بڑے ایثار پیشہ، مخلص اور دیانت دار رہنما ہیں اور انہوں نے قوم وملت کی بڑی خدمت کی ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج کے سوشل میڈیا کے دور میں یہ بیماری اور بھی بڑھ چکی ہے۔

اس آیت میں یہ سبق دیا گیا کہ ایک مسلمان کو مصنوعی شہرت کے پیچھے نہیں پڑھنا چاہیئے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی کامیابی کیلئے ضروری نہیں کہ انسان کا نام ہو اور تاریخ میں اس کے تذکرے ہوں۔ بہت سے انبیائے کرام چاہئے کہ ایسے بھی گذرے ہیں جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا حالانکہ وہ دنیا و آخرت میں اعلیٰ درجے کے کامیاب ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:ورسلاً لم نقصصھم علیک۔ اور بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے واقعات ہم نے آپ کو نہیں سنائے۔(النساء۔164) لہٰذا اپنے تذکرے اور نام کی پرواہ کئے بغیر کام کرتے رہیں۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا

ایک صفاتی نام الشکور بھی ہے یعنی وہ قدردان ذات ہے۔ وہ اپنے بندوں کی قدر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندے کی قدردانی اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے بندے کے تھوڑے عمل پر بھی راضی ہو جاتے ہیں اور اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی حوصلہ افزائی کیلئے اس کو ایک نیکی کرنے پر کم از کم دس نیکیوں کا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، یہی نہیں بلکہ نیک اعمال کرنے پر گناہ بھی معاف فرماتے ہیں۔ یقین رکھیئے! وہ قدردان ذات آپ کی محنت اور کام کو دیکھ رہی ہے، لہذا اسی سے اجر کی امید رکھیں دنیا والوں کی جھوٹی تعریف کے پیچھے نہ پڑھیں۔

حقیقی اختیار اور قدرت کی مالک ہستی

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران۔189)

زمین اور آسمان کا (حقیقی) مالک اللہ ہی ہے اور اس کا اختیار اور قدرت ہر چیز پر ہے۔ (آل عمران۔189)

گیارہواں رکوع: اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ--- (آل عمران۔190)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

تخلیق کائنات میں غور و فکر کی دعوت، عقلمند اور سمجھدار لوگوں کی صفات، عذاب جہنم: حقیقی رسوائی، جامع دعائیں، قبولیت دعا، قبولیت دعا کی صورتیں، مستجاب الدعوات ہونے کا راز، اللہ کسی کا اجر ضائع نہیں فرماتے، دنیا کا سامان تعیش دلیل نجات نہیں، اللہ کی مہمان نوازی، ابرار سے کون لوگ مراد ہیں؟ اہل کتاب کے اچھے لوگوں کی تعریف، صبر اور ثابت قدمی۔

سورۃ آل عمران کے آخری رکوع میں دس آیات ہیں۔

تخلیق کائنات میں غور و فکر کی دعوت

اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيَاتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ۔ (آل عمران۔190)

بے شک آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آنے جانے میں البتہ عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (آل عمران۔190)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وطاقت کی چند نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ جو لوگ ان نشانیوں پر یعنی تخلیق کائنات پر غور وفکر اور تدبّر کرتے ہیں انہیں کائنات کے خالق اور اس کے اصل فرمانروا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اتنی طویل وعریض کائنات کا یہ منظم نظام، جس میں ذرہ برابر خلل واقع نہیں ہوتا، یقیناً اس کے پیچھے ایک ذات ہے جو اسے چلا رہی ہے اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔

جب انسان نظام کائنات کا بغور مشاہدہ کرتا ہے تو یہ حقیقت اس پر کھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حس پیدا کی ہو، جسے تصرف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل وتمیز عطا کی ہو، اس سے اس کی حیات دنیا کے اعمال پر باز پرس نہ ہو، اور اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظام کائنات پر غور وفکر کرنے سے انہیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

اگلی آیات میں اہل دانش کی صفات کا تذکرہ ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور کروٹوں پر لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّماوَاتِ سے لے کر آخر سورت تک آیات نبی کریم ﷺ رات کو جب تہجد کے لئے اٹھتے تو پڑھتے اور اس کے بعد وضو کرتے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ (جو کہ امّ المومنین بھی تھیں) کے گھر رات گزاری۔ حضور ﷺ جب آئے تو تھوڑی دیر تک آپؐ اپنے اہل خانہ سے گفتگو کرتے رہے پھر سو گئے۔ جب آخری تہائی رات باقی رہ گئی تو آپؐ اٹھے اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے آیت ان فی خلق السموات سے آخر سورت تک آیات کی تلاوت فرمائی۔ پھر اٹھے، مسواک کیا، وضو کیا اور تہجد کی نماز، وتر ادا کئے۔ اس کے بعد حضرت بلال کی صبح کی اذان سن کر پھر دو رکعتیں صبح کی سنتیں ادا کیں پھر مسجد میں تشریف لا کر لوگوں کو فجر کی نماز پڑھائی۔ (بخاری)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورۃ آل عمران کی آخری آیات کی تلاوت کے بعد یہ دعا پڑھی: اللھم اجعل فی قلبی نورا وفی سمعی نورا وفی بصری نورا وعن یمینی نورا وعن شمالی نورا ومن بین یدی نورا ومن خلفی نورا ومن فوقی نورا ومن تحتی نورا واعظم لی نورا یوم القیامتہ۔ (بحوالہ ابن کثیر)

اس کے بعد والی تین آیات میں بھی مغفرت اور قیامت کے دن کی رسوائی سے بچنے کی دعائیں ہیں۔

سمجھدار لوگوں کی صفات

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔(آل عمران۔191)

وہ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے ہیں،(کہتے ہیں)اے ہمارے رب تونے یہ بے فائدہ نہیں بنایا تو سب عیبوں سے پاک ہے سو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ آل عمران۔191

اس آیت میں اہل ایمان کی تعریف اور مدح بیان کی جارہی ہے کہ یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں زمین وآسمان کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ تونے اپنی مخلوق کو عبث اور بیکار نہیں بنایا بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بدلہ عطا فرمائے اور بدکاروں کو ان کی بدی کی سزا دے۔

بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے عمران بن حصین سے فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور یہ بھی نہ ہوسکے تو لیٹے لیٹے ہی سہی،یعنی کسی حالت میں اللہ ربّ العالمین کے ذکر سے غافل مت رہو دل میں خاموشی سے بھی اللہ کا ذکر کرو اور اور زبان کے الفاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ غور وفکر ایک نور ہے جو تیرے دل پر اپنا عکس ڈالے گا۔اور پھر فرماتے: اذا المراء كانت له فكرة ففى كل شئى له عبرة۔یعنی جس انسان کو باریک بینی اور سوچ سمجھ کی عادت پڑگئی اسے ہر چیز میں ایک عبرت اور آیت نظر آتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ سے منسوب قول ہے فرماتے ہیں خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا بولنا اللہ کا ذکر اور نصیحت ہو اور اس کا چپ رہنا غور وفکر ہو اور اس کا دیکھنا عبرت اور تنبیہہ ہو۔

لقمان حکیمؒ کا نصیحت آموز مقولہ ہے کہ تنہائی کی گوشہ نشینی جس قدر زیادہ ہو اور اسی قدر غور وفکر اور دور اندیشی کی عادت زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر یہ بڑھ جائے اسی قدر راستے انسان پر وہ کھل جاتے ہیں جو اسے جنت میں پہنچادیں گے۔

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں جس قدر مراقبہ اور تدبّر زیادہ ہو گا اسی قدر سمجھ بوجھ تیز ہو گی اور جتنی سمجھ زیادہ ہو گی اتنا علم نصیب ہو گا اور جس قدر علم زیادہ ہو گا نیک اعمال بھی بڑھیں گے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ارشاد ہے کہ اللہ عزوجل کے ذکر میں زبان کا چلانا بہت اچھا ہے اور اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر افضل عبادت ہے۔

حضرت مغیث اسودؒ مجلس میں بیٹھے ہوئے فرماتے کہ لوگو قبرستان باقاعدہ جایا کرو تاکہ تمہیں انجام کا خیال پیدا ہو پھر اپنے دل میں اس منظر کو حاضر کرو کہ تم اللہ کے سامنے کھڑے ہو گے اور اس وقت کو یاد کرو جب ایک جماعت کو جہنم میں لے جانے کا حکم ہو گا اور ایک جماعت کو جنت میں جانے کا حکم ہو گا۔

حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ کھنڈرات پر جاتے اور کسی ٹوٹے پھوٹے دروازے پر کھڑے رہ کر نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں فرماتے: اے اجڑے ہوئے گھر! تمہارے رہنے والے کہاں گئے؟ پھر خود فرماتے سب زیر زمین چلے گئے سب فنا کا جام پی چکے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہمیشہ کی مالک بقاء ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کا ارشاد ہے دو رکعتیں جو خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائیں اس تمام رات کی نماز سے افضل ہیں جس میں توجہ نہ ہو۔ حضرت عامر بن قیس فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے صحابہ سے سنا ہے کہ ایمان کی روشنی اور تو غور فکر اور تدبّر میں ہے۔ سیدنا حضرت عیسیٰؑ سے منسوب قول ہے کہ: اے ابن آدم! اے ضعیف انسان! جہاں کہیں تو ہو خوف خدا رکھو۔ دنیا میں عاجزی اور مسکینی کے ساتھ رہ، مسجد کو اپنا گھر بنا لو۔ اپنی آنکھوں کو رونا یعنی ندامت کے آنسو سکھا، اپنے جسم کو صبر کی عادت سکھا، اپنے دل کو غور و فکر کرنے والا بنا، کل کی روزی کی فکر آج نہ کر۔

امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک مرتبہ مجلس میں بیٹھے ہوئے رو دیئے لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: میں نے دنیا میں اور اس کی لذتوں میں اور اس کی خواہشوں میں غور فکر کیا اور عبرت حاصل کی جب نتیجہ پر پہنچا تو میری امنگیں ختم ہو گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ہر شخص کیلئے عبرت و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کی مدح و ثنا بیان کی جو مخلوقات اور کائنات سے عبرت حاصل کریں اور نصیحت حاصل کریں۔ اور ان لوگوں کی مذمت بیان کی جو قدرت کی نشانیوں پر غور نہ کریں۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

عذاب جہنّم: حقیقی رسوائی

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (آل عمران۔192)

اے ہمارے پروردگار! جسے تونے دوزخ میں داخل کیا اسے درحقیقت بڑی رسوائی میں ڈال دیا، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔(آل عمران۔192)

جامع دعائیں

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ (آل عمران۔193)

اے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے سے سنا جو ایمان کیلئے پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری برائیوں کو معاف فرما اور ہم کو دنیا سے نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔(آل عمران۔193)

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ (آل عمران۔194)

اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تونے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ فرمایا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔(آل عمران۔194)

یعنی انہیں اس بات میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنادے اور ہمارے ساتھ ان وعدوں کو پورا فرما۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پر ایمان لا کر دشمنان اسلام کی نظر میں تضحیک اور طعن و تشنیع کا ہدف بنے ہی ہیں، کہیں خدانخواستہ ہم قیامت والے دن بھی تیری بارگاہ میں نیک اعمال کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے رسواء نہ ہو جائیں۔

قبولیت دعا

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ۔۔۔ (آل عمران۔195)

توان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمالی۔۔۔(آل عمران۔195)

قبولیت دعا کی صورتیں:

دعا کی قبولیت کی تین صورتیں ہیں:

1۔ جو چیز دعا میں مانگی گئی وہی چیز مل جاتی ہے۔

2۔ دعا کے نتیجے میں کوئی مصیبت یا آفت ٹل جاتی ہے۔

3۔ دنیا میں کچھ نہیں ملتا بلکہ وہ دعا آخرت کے دن کے لیے محفوظ کر دی جاتی ہے جو کہ آخرت میں بندے کے کام آئیگی۔

دعا کے آداب و شرائط

قبولیت و آدابِ دعا سے متعلق پہلا ادب اللہ رب العزت کے فرمان فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ میں مذکور ہے کہ ایک بندہ مومن کو ایمان رکھنا چاہئے کہ وہ ذات ہمہ وقت ہمارے قریب ہے۔ اتنے قریب ہے کہ اسے ہماری ہر حاجت و ضرورت کا علم ہے، ہمارے نفع و نقصان کو ہم سے بھی بہتر جانتا ہے اور ہماری ہر مشکل کو آسان کرنے پر قادر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور اس سے دعا منگنے کا دوسرا ادب یہ ہے کہ دعا اس یقین سے مانگیں کہ مولیٰ قریب ہے، ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے، اس لیے وہ ہماری حاجت کا ہم سے بھی بہتر علم رکھنے والا ہے۔

دعا کا تیسرا ادب یقین و توکل ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے ابن آدم! جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے بخشش اور مغفرت مانگتا رہے گا اور قبولیت کی امید رکھتا رہے گا تو جو بھی گناہ و لغزش تم سے سرزد ہوتی رہے، میں تمہاری امید اور دعا کے عمل کے باعث تجھے بخشتا رہوں گا۔ حدیث قدسی میں آتا ہے:

يٰبنِیَ آدَم! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ السَّمَاء ثُمَّ اسْتَغْفِرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَکَ وَلَا أُبَالِيْ

اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان تک بھی پہنچ جائیں اور پھر بھی تو مجھ سے استغفار کرے تو مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ تیرے گناہ اتنے زیادہ ہو گئے، پھر بھی میں تمہیں بخش دوں گا۔

حدیث: مَنْ فُتِحَ لَهٗ مِنْکُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهٗ بَابُ الرَّحْمَةِ۔

تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، پس اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔

یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے اور کرتے رہنے کی توفیق دے دی گئی کہ وہ کبھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا نہ چھوڑے اور مایوسی کو قریب نہ لائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے پیغام رحمت ہے کہ اس کے لیے رحمت کے

دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دعا کا دروازہ جس پر کھل گیا گویا اللہ نے اس پر رحمت کے سب دروازے کھول دیئے۔

. ارشاد فرمایا: وَمَا سُئِلَ اللہ شَيْئًا يُعْطَى أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يُسْئَلَ العَافِيَّةَ۔

اور جتنی چیزیں بھی اللہ رب العزت سے مانگی جاتی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز جو اللہ کو محبوب ہے، جس پر اللہ خوش ہوتا ہے وہ معافی اور عافیت ہے۔

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف خواہشات وتمناؤں کی دعائیں کرتے ہیں، ان سب چیزوں میں سے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ دعا یہ ہے کہ ایک گناہگار اللہ سے معافی اور بخشش طلب کرلے۔

دعا دافع البلاء ہے: إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللہِ بِالدُّعَاءِ

دعا اس مصیبت کے لیے بھی فائدہ مند ہے جو اتر چکی ہے اور اس کے لیے بھی فائدہ مند ہے جو ابھی نہیں اتری۔ یعنی جن مصیبتوں میں ہماری زندگی گھر چکی ہے، ان کا خاتمہ بھی دعا کرتی ہے اور جو مصیبتیں ابھی نہیں اتریں اور جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ کیا حادثہ کب اور کہاں ہو جائے، دعا ان آنے والی تمام مصیبتوں کو بھی ختم کر دیتی ہے۔

خوشحالی کی دعا کی تاثیر: مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَسْتَجِيْبَ اللہ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ وَالكُرَبِ فَالْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِيْ الرَّخَاءِ۔ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ مشکلات اور تکالیف کے وقت اس کی دعا قبول فرمائے تو اسے چاہئے کہ وہ خوشحالی کے وقت میں اللہ سے زیادہ دعا کیا کرے۔

مستجاب الدعوات ہونے کا راز

صلہ رحمی سے دعائیں قبول کرتی ہیں۔

حرام خوری سے پرہیز

مستجاب الدعوات ہونے کا راز حضور ﷺ نے رزقِ حلال اختیار کرنے اور رزقِ حرام سے پرہیز کرنے کو قرار دیا۔

جس شخص کا رزق حلال ہے، اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جس کا رزق حرام ہے، اس کی دعائیں رد کر دی جاتی ہیں۔

وقتِ دعا غفلت سے اجتناب

مستجاب الدعوات ہونے کے تیسرے راز کا تعلق وقتِ دعا سے ہے۔ کچھ اوقات میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

عجلت سے اجتناب

میری دعا کب قبول ہوگی؟ اب تک کیوں نہیں ہوئی؟ یہ گلہ وشکوہ دعاؤں کی قبولیت کو روک دیتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کرنے کا وبال: دعاؤں کا قبول نہ ہونا بھی ایک عذاب اور سزا ہے

لَیُوْشِکَنَّ اللہ أَنْ یَبْعَثَ عَلَیْکُمْ عِقَابًا مِنْہُ ثُمَّ تَدْعُوْنَہُ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ ثُمَّ یَدْعُوْا خِیَارُکُمْ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ۔

اللہ کسی کا اجر ضائع نہیں فرماتے

۔۔۔أَنِّی لَا أُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنکُم مِّن ذَکَرٍ أَوْ أُنثَیٰ بَعْضُکُم مِّن بَعْضٍ۔ (آل عمران۔195)

(اور رب نے فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا تم آپس میں ایک ہو۔ (آل عمران۔195)

اس آیت میں ذکر کیا گیا کہ تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

آیت کے اندر یہ بھی نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت جب عمل میں برابر ہوں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک انعام میں بھی برابر ہوتے ہیں۔ بعضکم من بعض کا مطلب یہ کہ مرد اور عورت جنس کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اللہ تعالی نے اس مساوات کی وجہ بھی یہ بتائی کہ تم ایک دوسرے سے ہو، مرد کی ماں عورت ہوتی ہے اور عورت کا باپ مرد ہوتا ہے، بشریت میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے ان کے درمیان ایک دوسرے پر فضیلت صرف اعمال کی وجہ سے ہے۔ اس تعبیر کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک ہی شاخ سے نکلے ہیں، ایک دوسرے کی جوڑی ہیں۔

روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰؑ عصا اور ید بیضا لائے تھے۔ عیسیٰؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے۔ دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے۔ آپ فرمائیں کہ آپ کیا لائے ہیں؟ اس پر آپ نے اس رکوع کے آغاز سے یہاں تک کی آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا میں تو یہ لایا ہوں۔

دنیا کا سامان تعیش دلیل نجات نہیں

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَأْوٰىھُمْ جَھَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمِھَادُ۔ (آل عمران۔196۔197)

اے نبیؐ! دنیا کے ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کا (عیش و عشرت کے ساتھ) چلنا پھرنا تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا جو بدترین جائے قرار ہے۔ (آل عمران۔196۔197)

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن مخاطب پوری امت ہے۔ شہروں میں چلنے پھرنے سے مراد دنیا کی فراوانی، عیاشی کی آمدورفت، سیر اور وسعت مال ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ سب کچھ عارضی اور چند روزہ فائدہ ہے، اس سے اہل ایمان کو دھوکا میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اصل انجام پر نظر رکھنی چاہئے، جو ایمان میں محرومی کی صورت میں جہنم کا دائمی عذاب ہے۔

اگلی آیت میں دنیا کو متاع قلیل کہا گیا۔ یعنی دنیا کے وسائل، آسائش اور سہولتیں بظاہر کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، در حقیقت متاعِ قلیل ہی ہیں کیونکہ بالآخر انہیں فنا ہونا ہے اور ان کے بھی فنا ہونے سے پہلے وہ حضرات خود فنا ہو جائیں گے، جو ان کے حصول کی کوششوں میں اللہ کو بھی فراموش کئے رکھتے ہیں اور ہر قسم کے اخلاقی ضابطوں اور اللہ کی حدوں کو بھی پامال کرتے ہیں۔

اللہ کی مہمان نوازی

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔ (آل عمران۔198)

لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے ان کی مہمان نوازی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ (آل عمران۔198)

جو لوگ تقویٰ اور نیک زندگی گزار کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونگے۔ گو دنیا میں ان کے پاس فاسق و فاجر لوگوں کی طرح دولت کے انبار اور رزق کی فروانی نہ رہی ہو گی، مگر وہ جنت میں اللہ کے مہمان ہونگے جو تمام کائنات کا خالق اور مالک ہے اور وہاں ان ابرار (نیک لوگوں) کو جو اجر و صلہ ملے گا، وہ اس سے بہتر ہو گا جو دنیا میں اللہ کے نافرمانوں کو عارضی طور پر ملتا ہے۔

ابرار سے کون نیک لوگ مراد ہیں؟

ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ انہیں ابرار اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ماں باپ کے ساتھ اور اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے۔ جس طرح تیرے ماں باپ کا تجھ پر حق ہے اسی طرح تیری اولاد کا تجھ پر حق ہے۔ یہی روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی موقوفاً مروی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں ابرار وہ ہیں جو کسی کو ایذاء نہ دیں، حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ہر شخص کیلئے خواہ نیک ہو خواہ بد موت اچھی چیز ہے اگر نیک ہے تو جو کچھ اس کیلئے اللہ کے پاس ہے وہ بہت ہی بہتر ہے اور اگر بد ہے تو اللہ کے عذاب اور اس کے گناہ جو اس کی زندگی میں بڑھ رہے تھے اب ان کا بڑھنا ختم ہوا پہلے کی دلیل آیت: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ (آل عمران۔198)۔ اور دوسری کی دلیل آیت: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (آل عمران۔178)۔ یعنی وہ لوگ جو انکار و سرکشی کی روش پر چل رہے ہیں وہ ہماری ڈھیل دینے کو اپنے حق میں بہتر نہ خیال کریں۔ یہ ڈھیل ان کے گناہوں میں اضافہ کر رہی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہیں۔ (بحوالہ ابن کثیر)

اہل کتاب کے اچھے لوگوں کی تعریف

وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْھِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (آل عمران۔199)

اور بے شک اہل کتاب میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، ان کے دل اللہ کے حضور جھکے رہتے ہیں۔ اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔ (آل عمران۔199)

صحیح بخاری مسلم میں ہے کہ نجاشی کے انتقال کی خبر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو دی اور فرمایا کہ تمہارا بھائی حبشہ میں انتقال کر گیا ہے اور اس کی نماز جنازہ ادا کرو۔ پھر میدان میں جا کر صحابہ کی صفیں درست فرمائیں اور آپؐ نے نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ جب نجاشی کی وفات ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو۔ بعض لوگوں نے کہا دیکھئے حضورؐ ہمیں ایک نصرانی کیلئے استغفار کرنے کا حکم دیتے ہیں جو حبشہ

میں مرا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب اہل کتاب یکساں نہیں۔ اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خوف خدا رکھتے ہیں۔ آیات الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں تحریف نہیں کرتے۔ ان کے اندر عاجزی اور گریہ زاری بھی موجود ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جعفر بن ابو طالب نے جب نجاشی کے دربار میں امراء سلطنت اور علماء نصاریٰ کے سامنے سورۃ مریم کی تلاوت کی جس کے نتیجے میں سب پر رقت طاری ہوئی تو سب حاضرین دربار مع بادشاہ رو دیئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔

بخاری مسلم میں حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملتا ہے جن میں سے ایک اہل کتاب کا وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور مجھ پر ایمان لایا۔

صبر اور ثابت قدمی

يٰٓ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْاۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ آل عمران۔200

اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور خدمت دین کیلئے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔ (آل عمران۔200)

اس آیت میں چار چیزوں کی تاکید کی گئی ہے۔

1۔ صبر واستقامت،

2۔ ثابت قدمی

3۔ مرابطہ

4۔ تقویٰ

صبر لفظی معنی روکنے کے ہیں اور اصطلاح قرآن وسنت میں نفس کو خلاف طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں۔

1۔ صبر علی الطاعات: یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

2۔ صبر عن المعاصی یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے وہ نفس کیلئے کتنی ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو ان سے روکنا۔

3۔ صبر علی المصائب یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا، حد سے زائد پریشان نہ ہونا اور سب تکلیف وراحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر صبر و تحمل کا اظہار کرنا اور نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

مصابرت یا ثابت قدمی اسی لفظ صبر سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں ثابت قدم رہنا۔

وَرَابِطُوْا: مرابطہ کا مطلب ہے استقامت اور ثابت قدمی دکھانا۔ اللہ کے راستے میں وقت کی قربانی دینا رباط کہلاتا ہے۔ ایک نماز کے بعد بعد دوسری نماز کے انتظار کو بھی رباط کہتے ہیں۔

حدیث: رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیہا۔ اللہ کے راستے میں ایک دن کا رباط دنیا وما فیھا سے بہتر ہے۔(بخاری۔باب فضل رباط یوم فی سبیل اللہ)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور درجات کو بڑھاتا ہے:

1۔ تکلیف اور مشکل کے باوجود بھی کامل وضو کرنا۔

2۔ دور سے چل کر مسجدوں میں آنا۔

3۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ یہی رباط ہے۔

حدیث میں مکارہ (یعنی سخت سردی اور مشکلات کے باوجود) مکمل وضو کرنے، مسجدوں میں زیادہ دور سے چل کر جانے اور نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کو رباط کہا گیا ہے۔(صحیح مسلم کتاب الطہارۃ)

حضرت ابو سلمہ سے ایک دن حضرت ابوہریرہ نے پوچھا: اے میرے بھتیجے جانتے ہو اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟ انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ آپ نے فرمایا سنو جب یہ آیت نازل ہوئی تو کوئی غزوہ نہ تھا۔ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو مسجدوں کو آباد رکھتے تھے۔ نمازوں کو ٹھیک وقت پر ادا کرتے تھے پھر اللہ کا ذکر کرتے تھے انہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم پانچوں نمازوں پر جمے رہو اور اپنے نفس کو اور اپنی خواہش کو روکے رکھو اور مسجدوں میں بسیرا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یہی اعمال موجب ایمان ہیں۔(بحوالہ ابن کثیر)

سورت النّساء

سورہ النّساء مدنی سورت ہے اور اس کی 176 آیات ہیں۔

سورۃ النساء کے تمہیدی موضوعات

سورۃ آل عمران کی آخری آیت تقویٰ پر ختم ہوئی ہے اور یہ سورت بھی حکم تقویٰ سے شروع ہو رہی ہے۔ اس سورت کے شروع میں میل جول اور معاشرتی تعلقات یعنی حقوق العباد سے متعلق احکام ہیں۔ یتیموں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، خواتین کے حقوق، باہمی معاملات، معاشرتی تعلقات، صلح کی اہمیت۔ انسانی معاشرے میں ہر مسئلہ عدالت یا قانون کی قوت سے حل نہیں ہو سکتا۔ بیت سارے معاملات میں اخلاقی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ بہت سارے انسانی معاشرتی حقوق کی ادائیگی کا دارومدار ادب، احترام، دلداری، ہمدردی اور قلبی خیر خواہی پر ہے، اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کانٹے میں تولی نہیں جاسکتیں، اور قانون کی زبان میں ان کی پوری تعین مشکل ہے۔ کچھ پرائیویٹ معاملات میں پولیس مداخلت نہیں کر سکتی۔ ہر چیز پر ڈنڈے کے زور پر عمل نہیں کروایا جاسکتا۔ بہت سارے معاشرتی مسائل کا حل سوائے خوف خدا اور تقویٰ کے کچھ نہیں۔ بعض دفعہ اصلاح احوال کیلئے دوسرے فرد کی مداخلت بھی پرائیویسی میں مداخلت تصور کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان معاملات کی اصلاح اور حقوق کی ادائیگی کے لئے سوائے خوف خدا اور خوف آخرت کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ جس کو اسلام کی اصطلاح میں تقوٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ تقوٰی کی طاقت حکومت اور قانون کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ان معاملات میں بھی ایک انسان کو صراط مستقیم یعنی سیدھے راستے پر رکھتا ہے جہاں دوسری تمام طاقتیں، قوت نافذہ یا انفورسمنٹ کا دائرہ کار ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس سورت کا آغاز تقوی کی ہدایت سے شروع ہوتا ہے کیونکہ آگے جو ہدایات دی جارہی ہیں ان کی مکمل پابندی تقویٰ اور خوف خدا کے بغیر ممکن نہیں۔

چوتھے پارے کا بارھواں رکوع: يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ--- (النساء۔1)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

محبت و مودّت کا آفاقی اصول، انسانی اخوت و برادری، صلہ رحمی، یتیموں کے حقوق، نکاح کی اہمیت، بیوی کے حقوق کی ادائیگی، حق مہر کے احکامات، حق مہر کے حوالے سے عورت کی حق تلفی کی اقسام، ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے بارے میں احکامات۔

اس سورت کے آغاز میں ہی فرمایا گیا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ۔۔ اے لوگو! اپنے رب کی نافرمانی سے ڈرو۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اس آیت کو خطبہ نکاح میں پڑھا کرتے تھے اور خطبہ نکاح میں اس کا پڑھنا مسنون ہے۔

اس میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خطاب یاایھاالناس کے ذریعہ فرمایا گیا ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں چاہے دنیا کے جس کونے میں بستے ہوں چاہے مرد ہوں یا عورتیں۔ پھر حکم اتقوا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے لفظ رب کو اختیار کیا گیا جس میں اس حکمت کی طرف اشارہ فرمادیا کہ جو ذات تمہاری پرورش کی کفیل ہے اور جس کی شان ربوبیت کے مظاہر انسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس کی نافرمانی اور سرکشی کس قدر خطرناک ہوگی۔

پھر اسی آیت میں پوری انسانیت کے باہمی رشتے کو ایک خاص شان کے ساتھ ذکر کیا گیا کہ اس نے اپنی حکمت و رحمت سے تم سب کو پیدا کیا، انسان بنایا، سب انسانوں کو ایک ہی انسان یعنی حضرت آدمؑ سے پیدا کر کے سب کو انسانی اخوت و برادری کے ایک مضبوط رشتہ میں باندھ دیا کہ باہمی ہمدردی و خیر خواہی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں اور انسانوں میں ذات پات کی تفریق، تمام نسلی امتیازات،، رنگ، لسانیت، علاقائیت کو عزت، ذلت کا معیار نہ بنایا جائے۔

سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں ان احکام کی تمہید ہے جو آگے اس سورت میں آنے والے ہیں اس تمہید میں ایک طرف تو پروردگار عالم کے حقوق سامنے رکھ کر اس کی نافرمانی سے روکا گیا، دوسری طرف تمام افراد انسانی کو ایک باپ کی اولاد بتا کر ان میں محبت اور باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو بیدار کیا گیا تا کہ تمام معاشرتی تعلقات اور باہمی حقوق کی ادائیگی صدق دل سے ہو سکے۔

محبت و مودّت کا آفاقی اصول

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۔ (النساء۔1)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ ڈرو اس اللہ سے جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔ (النساء۔1)

اللہ تعالیٰ یایھا الناس کہہ کر تمام انسانوں سے مخاطب ہے کہ ایک جوڑے سے انسانیت کا آغاز ہوا۔ تمام نسل انسانی ایک ہی آدمؑ کا گھرانہ ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم وحوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ اس کا فطری تقاضا ہے کہ آپس میں عدل وانصاف کے تعلقات رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔ دوسرا یہ کہ جس طرح آدم تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حوا تمام نسل انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی سے بنایا ہے۔ اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر وفروتر اور فطری گنہ گار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔

عورت اور مرد دونوں ایک ہی جنس سے ہیں، دونوں ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں میں قرآن نے ان تمام جاہلی نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابل میں، ایک فروتر مخلوق قرار دیتے تھے۔

تیسرا یہ کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا خالق اللہ ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس زمین پر کسی کو ظلم وتعدی کا نشانہ بنائے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ رحمدلی، احسان اور بھلائی کی روش اختیار کرے۔

حدیث: الخلق عیال اللہ فاحبّ الخلق الی اللہ من احسن الیٰ عیالہ۔ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس اللہ کو اپنی ساری مخلوق میں زیادہ محبت اُن بندوں سے ہے جو اس کی عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور بھلائی کریں۔ (حدیث)

اس آیت میں صلہ رحمی کی بھی تاکید کی گئی۔ اوالارحام کا عطف اللہ پر ہے یعنی رحموں (رشتوں ناطوں) کو توڑنے سے بھی بچو۔ ارحام، رحم کی جمع ہے۔ مراد رشتہ داریاں ہیں جو رحم مادر کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہیں اس سے محرم اور غیر محرم دونوں رشتے مراد ہیں۔ رشتوں ناتوں کا توڑنا کبیرہ گناہ ہے جسے قطع رحمی کہتے ہیں۔ احادیث میں قرابت داریوں کو ہر صورت میں قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت بیان کی گئی ہے جسے صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ قرابت داری کو توڑنے، ان کی طرف توجہی وبے التفاتی برتنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ایک کبیرہ گناہ ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا کہ: لوگو تم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو ایک دوسرے پر شفقت کیا کرو، کمزور اور ناتواں کا ساتھ دو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: مَن أحبَّ أن يُبْسَط له في رزقه، وأن يُنسأ له في أثره فليصل رحمه۔ یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی پیدا ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔

اس حدیث سے صلہ رحمی کے دو بڑے اہم فائدے معلوم ہوگئے کہ آخرت کا ثواب تو ہے ہی، دنیا میں بھی صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق کی تنگی دور ہوتی ہے اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے اور میں حاضر ہوا تو آپ کے وہ مبارک کلمات جو سب سے پہلے میرے کانوں میں پڑے یہ تھے آپؐ نے فرمایا: يا أَيُّها النَّاسُ أَفْشوا السَّلامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا باللَّيْل وَالنَّاسُ نِيامٌ، تَدخُلُوا الجَنَّةَ بِسَلامٍ۔ اے لوگو! ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کیا کرو، اللہ کی رضاجوئی کے لئے لوگوں کو کھانا کھلایا کرو، صلہ رحمی کیا کرو اور ایسے وقت میں نماز کی طرف سبقت کیا کرو۔

صلہ رحمی کے مقابلہ میں قطع رحمی ہے جس کے بارے میں شدید وعیدیں آئی ہیں۔

حدیث: لا يدخل الجنة قاطع۔ جو آدمی حقوق قرابت کا خیال نہیں رکھتا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

حدیث: مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جب قبیلہ مضر کے چند لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس چادریں لپیٹے ہوئے آئے کیونکہ ان کے جسم پر کپڑا تک نہ تھا تو حضورؐ نے کھڑے ہو کر نماز ظہر کے بعد وعظ بیان فرمایا جس میں اس آیت کی تلاوت کی پھر آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (الحشر:18) کی تلاوت کی پھر لوگوں کو خیرات کرنے کی ترغیب دی چنانچہ جس سے جو ہو سکا ان لوگوں کے لئے دیا۔

آیت کے آخر میں خوف خدا پیدا کرنے کیلئے فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے جو تمہارے دلوں اور ارادوں سے باخبر ہے۔ اگر رسمی طور پر یا بے دلی سے کوئی کام بھی کر دیا مگر دل میں جذبہ ایثار و خدمت نہ ہو تو اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔

قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ اپنی ہدایات واحکامات کو محض دنیا کے قانون کی طرح بیان نہیں کرتا۔ بلکہ حاکمانہ

انداز کے بجائے مربیانہ انداز اپناتا ہے، محبت وتربیت کے انداز میں بیان کرتا ہے، تاکہ ذہنوں اور دلوں کی اصلاح بھی ہو۔

یتیموں کی نگہداشت

یتیم کے مال میں احتیاط

وَاٰ تُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۔ (النساء۔2)

اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کردو۔ اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر کھانہ جاؤ، بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (النساء۔2)

یتیم کا کیا مطلب ہے؟

یتیم کے لفظی معنی اکیلے اور منفرد کے ہیں۔ اسی لئے جو موتی سیپ میں تنہا ایک ہو، اس کو در یتیم کہا جاتا ہے۔
اصطلاح شرع میں اس بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے جس کا والد فوت ہو گیا ہو اور جانوروں میں اس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں مر گئی ہو۔ بالغ ہونے کے بعد شرعی اصطلاح میں اس کو یتیم نہیں کہا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وضاحت ہے: بلوغت کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی۔ (مشکوٰۃ شریف)
یتیم بچوں کی ملکیت میں اگر کچھ مال ہے جو ان کو کسی نے ہبہ کیا ہو، یا کسی کی میراث میں ان کو پہنچ گیا ہو تو یتیم کے ساتھ اس کے مال کی حفاظت بھی اس شخص کے ذمہ ہے جو یتیم کا ولی ہے۔ آیت کے اس جملے میں جو ارشاد فرمایا گیا کہ یتیموں کے مال ان کو پہنچادو اس کی تشریح آگے پانچویں آیت میں آتی ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ ان کے مال ان کو اس وقت پہنچاؤ جب دیکھ لو کہ وہ بالغ ہو گئے اور ان کو اپنے نفع ونقصان اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ کفالت یتیم ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

حدیث: اس دنیا میں سب سے اچھا گھر وہ گھر ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ اور سب سے برا گھر وہ گھر ہے جس میں ایک یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۔ (النساء۔10)

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں، اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔(النساء۔10)

آیت کا شان نزول: حدیث میں آتا ہے کہ جنگ احد کے بعد حضرت سعد بن ربیعؓ کی بیوہ اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ سعدؓ کی بچیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ احد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک دانہ تک نہیں چھوڑا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

نکاح کی اہمیّت

بیوی کے حقوق کی ادائیگی

حق مہر کی ادائیگی

وَاٰ تُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۔ (آل عمران۔4)

اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، پھر اگر وہ اس میں سے اپنی خوشی سے تمہیں کچھ معاف کر دیں تو تب اسے (اپنے لئے) ساز گار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔(آل عمران۔4)

بیوی کے مالی حقوق کا آغاز حق مہر سے ہوتا ہے۔ مہر عورت کا حق ہے، جس کی ادائیگی مرد پر لازم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:وَآتُواْ النَّسَاء صَدُقَتِہِنَّ نِحْلَةً۔ اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔(النساء:04)

حق مہر بیوی کو نکاح کے موقع پر دیا جاتا ہے اور یہ بیوی کے نان ونفقہ کے مستقل اخراجات کے علاوہ ہے۔

حق مہر کے حوالے سے عورت پر ظلم وزیادتی کی اقسام

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں حق مہر کے حوالے سے عورت کے ساتھ کئی قسم کے ظلم ہوتے تھے۔

1۔ ایک یہ کہ مہر جو عورت کا حق ہے اس کو دیا ہی نہیں جاتا تھا، بلکہ عورت کے اولیاء، شوہر سے وصول کر لیتے تھے جو سراسر ظلم تھا۔ اس رواج کو ختم کرنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا: واتوا النسآء صدقٰتھن۔۔ یعنی عورتوں کو ان کے مہر دو۔ اس حکم کے مخاطب شوہر بھی ہیں کہ وہ اپنی بیوی کا مہر خود بیوی کو دے دیں اور کسی اور کو نہ دیں۔ عورت کے اولیاء بھی اس حکم کے مخاطب ہیں کہ اگر مہر ان کو ملے تو یہ عورت کو ہی دیدیں، اس کو اپنے تصرف میں نہ لائیں۔

2۔ حق مہر کے حوالے سے دوسرا ظلم یہ تھا کہ اگر کبھی عورت کو مہر دینا بھی پڑ گیا تو بہت تلخی کے ساتھ، بادل ناخواستہ، تاوان سمجھ کر دیتے تھے، اس ظلم کا ازالہ آیت مذکورہ کے اس لفظ نحلہ سے فرمایا گیا، کیونکہ نحلہ لغت میں اس دینے کو کہتے ہیں جو خوش دلی کے ساتھ دیا جائے۔ اس آیت میں یہ تعلیم فرمائی گئی کہ عورتوں کا مہر ایک حق واجب ہے، اس کی ادائیگی ضروری ہے اور جس طرح تمام حقوق واجبہ کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح مہر کو بھی سمجھنا چاہئے۔

3۔ تیسرا ظلم مہر کے بارے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ بہت سے شوہر یہ سمجھ کر بیوی مجبور ہے، کمزور ہے مخالفت نہیں کر سکتی، دباؤ ڈال کر بیوی سے حق مہر معاف کرا لیتے تھے، جس سے در حقیقت معافی نہ ہوتی تھی مگر وہ یہ سمجھ کر بے فکر ہو جاتے تھے کہ مہر معاف ہو گیا۔ اس ظلم کے انسداد کے لئے آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا فان طبن لکم عن شی منہ نفسا۔۔ یعنی اگر وہ عورتیں اپنے دل کی خوشی سے اپنے مہر کا کوئی حصہ تمہیں دیدیں یا معاف کر دیں تو اس صورت میں تمہارے لئے وہ حلال اور جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جبر واکراہ اور دباؤ کے ذریعہ معافی حاصل کرنا تو کوئی چیز نہیں، اس سے کچھ معاف نہیں ہوتا۔

افسوس ہے کہ جاہلیت کے زمانہ کی یہ باتیں مسلمانوں میں اب بھی موجود ہیں، مختلف علاقوں اور کلچر میں ان مظالم میں سے کوئی نہ کوئی ظلم ضرور پایا جاتا ہے، ان سب مظالم سے بچنا لازم ہے۔

شریعت کا یہ اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طیب نفس یعنی دل کی خوشی سے اجازت نہ ہو، بطور قاعدہ کلیہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: خبر دار ظلم نہ کرو اور اچھی طرح سے سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال (دوسرے شخص کے لئے) حلال نہیں ہے جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔

یہی زیادتی عورتوں کے ساتھ وراثت کے مال میں بھی کی جاتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ماں یا باپ کے فوت ہو جانے پر بیٹے ہی پورے مال پر قابض ہو جاتے ہیں اور بہنوں کو حصہ نہیں دیتے۔ اگر کسی کو بہت دینداری کا خیال ہوا تو بہنوں

سے معاف کرالیتا ہے۔وہ چونکہ یہ سمجھتی ہیں کہ حصہ کسی حال میں ملنے والا نہیں،اس لئے اپنی مرضی کے خلاف معاف کرنے کو کہہ دیتی ہیں۔یہ سب حق تلفی کے زمرے میں آتا ہے۔

مساجد ومدارس یا کسی چیریٹی کے لئے اگر چندہ یا فنڈ ریزنگ کی جائے اس میں بھی دینے والے کے طیب نفس کا خیال رکھنا لازم ہے۔بعض دفعہ وفد کے دباؤ سے اگر کوئی شخص چندہ دے اور دل کی خوشی نہ ہو،صرف شرمندگی سے بچنے کیلئے دے تو ایسا چندہ لینا بھی درست نہیں۔

ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے بارے میں احکامات

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (النساء۔5)

اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے گزر بسر کا ذریعہ بنایا ہے،نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو،البتہ انہیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور ان سے نرم اور اچھے انداز میں گفتگو کرو۔النساء۔5

یہ آیت مالی آزادی کے حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہے اور بہت وسیع معنی کی حامل ہے۔اس آیت میں یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو زندگی کی ضرورت ہے،بہر حال ایسے نادان لوگوں کے اختیار وتصرف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہوں جس کے نتیجے میں نظام معاشرت اور نظام اخلاق وکردار کو خراب کر دیں۔حقوق ملکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے معاشرتی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جا سکیں۔جہاں تک آدمی کی ضروریات زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہئیں،لیکن جہاں تک مالکانہ حقوق کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق وتہذیب اور اجتماعی حدود وقیود کے لیے مضر نہ ہو۔اس ہدایت کے مطابق ہر صاحب مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔اسی طرح حکومت وقت کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود ذمہ دارانہ تصرف کے اہل نہ ہوں یا جو لوگ اپنی دولت کے ذریعے معاشرتی فساد برپا کر رہے ہوں،ان کی املاک پر ان کے تصرف کو محدود کر دیا جائے تاکہ وہ

اپنے دولت کے ذریعے اپنا اور دوسروں کا نقصان نہ کریں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں یتیم کے مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرائط عائد کی گئیں: ایک بالغ ہونا اور دوسرا ارشد، یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت۔

تیرھواں رکوع: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ۔۔۔ (النساء۔11)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

یہ سارا رکوع وراثت کے احکامات ومسائل پر مشتمل ہے۔ اس رکوع کی پہلی آیت کریمہ آیت میراث کہلاتی ہے۔ اس کے بعد کی آیت، پچھلے رکوع کی دو آیات اور اس سورت کے خاتمہ کی آیت کا تعلق بھی وراثت کے احکام سے ہے۔ ان آیات کی تفسیر کو یہاں جمع کر دیا گیا ہے تا کہ موضوعاتی ترتیب میں آسانی ہو۔

ترکہ کی تقسیم کی ترتیب اور طریقہ کار:

1۔ پہلا مرحلہ: تجہیز و تکفین کے اخراجات۔

2۔ دوسرا مرحلہ: میت کے ذمہ قرض اور مالی فرائض کی ادائیگی۔

3۔ تیسرا مرحلہ: مالی وصیت (اگر کوئی ہے تو) پر عمل۔

4۔ چوتھا مرحلہ: تقسیم وراثت۔

تقسیم وراثت کے وقت وسعت قلبی کا مظاہرہ کرو، احکام وراثت کی اہمیت۔

وراثت کے احکامات ومسائل

اللہ تعالی تمہیں اولاد میں مال تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم۔۔۔ (النساء۔11)

حدیث: رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی عیادت کو گئے۔ حضرت سعد نے کہا: یارسول اللہؐ! میرے پاس مال بہت ہے اور میری ایک ہی بیٹی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں آپؐ نے فرمایا: نہیں، انہوں نے پوچھا پھر ایک تہائی کی اجازت دیجئے آپؐ نے فرمایا خیر لیکن یہ بھی زیادہ ہے پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّكَ أَنْ تَدَعَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَدَعَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ۔

تو اگر اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جائے یہ اس سے بہتر ہے تو کہ تو انہیں فقیر چھوڑ کر جائے کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ (بخاری ومسلم)

اسلام کا متوازن قانون وراثت

مشرکین عرب کا دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی بڑی اولاد کو اس کا مال مل جاتا چھوٹی اولاد اور عورتیں بالکل محروم رہتیں اسلام نے وراثت کے احکامات نازل فرما کر سب کی مساویانہ حیثیت قائم کر دی کہ وارث تو سب ہوں گے خواہ قرابت حقیقی ہو یا بوجہ عقد زوجیت کے ہو، سب کو کم و بیش حصہ ملے گا۔ اسلام سے قبل ایک یہ ظلم بھی روا رکھا جاتا تھا کہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور صرف بڑے لڑکے جو لڑنے کے قابل ہوتے، سارے مال کے وارث قرار پاتے۔ اسلام نے اولاد میں سے ہر ایک کو وارث بنایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی شخص نے اپنی کچھ اولاد چھوڑی اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے تو یہ جنین بھی وارثوں کی فہرست میں آئے گا۔ اس کی ولادت تک تقسیم میراث ملتوی رکھنا مناسب ہو گا تاکہ یہ نومولود بچہ یا بچی بھی وراثت سے محروم نہ رہ جائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردوں کی طرح عورتوں اور بچے بچیاں اپنے والدین اور اقارب کے مال میں حصہ دار ہونگے انہیں محروم نہیں کیا جائے گا۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ لڑکی کا حصہ لڑکے کے حصے سے نصف ہے۔ یہ عورت پر ظلم نہیں ہے اور نہ ہی اس کا استخفاف ہے بلکہ اسلام کا یہ قانونِ میراث عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ عورت کو اسلام نے معاش کی ذمہ داری سے فارغ رکھا ہے اور مرد کو اس کا کفیل بنایا ہے۔ اسی طرح عورت کے مقابلے میں مرد پر کئی گنا زیادہ مالی ذمہ داریاں ہیں اس کے باوجود عورت کو وراثت سے محروم نہیں کیا گیا۔ بلکہ بعض صورتوں میں عورت زیادہ کی بھی حقدار بن سکتی ہے۔ مثلاً مال وراثت میں عورت کا حصّہ صرف بحیثیت بیٹی ہی مقرر نہیں ہے بلکہ بحیثیت ماں، بحیثیت بیوی اور بحیثیت بہن بھی الگ الگ حصّہ مقرر ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے والدین، اپنے خاوند، اپنے بھائی اور اپنی اولاد کے مال کی بھی وارث اور اپنے حصے کی حقدار ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔ (النساء۔7)

مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ النساء۔7

وراثت کے مسائل

ورثہ تقسیم کرنے سے پہلے چند اخراجات کی ادائیگی:

تجہیز وتدفین: کفن دفن کے اخراجات۔

قرض ومالی لین دین: سارے قرضے اتار دیے جائیں جس میں ادھار، مہر، زکوۃ اور چھوڑے ہوئے روزوں کا کفارہ شامل ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر میت کا مال اتنا ہے کہ بیوی کا حق مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو بھی پورا مال مہر میں عورت کو دے دیا جائے گا اور کسی وارث کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔

اگر میت پر حج فرض تھا تو ورثا کی رضامندی سے حج بدل بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہبہ یا تحفہ۔ میت اگر اپنی زندگی میں کسی کو کوئی چیز بطور تحفہ دے کر مالک بنا گیا ہو تو وہ چیز واپس نہیں لی جاسکتی۔

وصیت پر عمل۔ یہ زبانی بھی ہوسکتی ہے اور تحریری بھی۔ یہ ورثے کی کل مقدار کا ایک تہائی تک ہوسکتی ہے۔ یہ مرنے کے بعد ہی دی جاتی ہے اور وارثوں کو نہیں مل سکتی۔ (حدیث: لا وصیت لوارث)

وصیت کے متعلق سورۃ البقرہ آیت: 186 میں تفصیل گذر چکی ہے کہ آدمی کو اپنے کل مال کے ایک تہائی کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانون وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا ان میں سے کسی کو یا کسی اور فرد جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو اس کے لیے اپنے اختیار سے حصہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہ عامہ کے کام میں صرف کرنے کے لیے وصیت کی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کل ملکیت میں سے دو تہائی کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے جس میں سے شریعت کے نامزد کردہ وارثوں کو مقررہ حصہ ملے گا۔ اور ایک تہائی کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملہ میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت کر دے۔ ورثاء کی ذمہ داری ہے کہ وہ میت کی وصیت کا احترام کریں اور اس کو اس کی روح کے مطابق نافذ کریں۔ (وصیت کے احکام سے متعلق مزید دیکھئے تذکیر بالقرآن۔ پارہ: 2 رکوع: 6، آیت۔ البقرہ: 186)

اس آیت کے آخری الفاظ بہت توجہ طلب ہیں۔ فرمایا:

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔ (النساء۔7)

یعنی وراثت کے سارے مال کو تقسیم کیا جائے خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

ان الفاظ سے ایک بہت بڑی جاہلانہ رسم کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت میں وراثت کے بعض مال پر میت کے بیٹے خود بخود اپنا قبضہ جما لیتے تھے۔ مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ یہ صرف نوجوان مردوں کا حق تھا، دوسرے وارثوں کو ان سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی اس ہدایت نے بتلا دیا کہ میت کی ملکیت میں جو چیز بھی تھی، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہر چیز میں ہر وارث کا حق ہے، کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا جائز نہیں۔

موجودہ دور میں عموماً میت کا بزنس، فیکٹری، دوکان، سامان تجارت پر صرف بیٹوں کو حقدار سمجھا جاتا ہے حالانکہ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق میت جو مال بھی چھوڑتا ہے وہ میراث ہے اور اس سارے مال کی منصفانہ تقسیم ضروری ہے الا یہ کہ میت اپنی زندگی میں کوئی چیز کسی کو تحفہ میں دے جائے۔ تحفہ یا ہبہ میں بھی اولاد کے درمیان عدل ضروری ہے ورنہ یہ زیادتی ہوگی۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر میت نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو وہ کپڑا دس حصوں میں کاٹ کر وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا الا یہ کہ کوئی ایک اس کو خرید لے اور رقم بقدر حصہ تقسیم کر دی جائے۔

تقسیم وراثت کے وقت وسعت قلبی کا مظاہرہ کرو

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (النساء۔8)

اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔ اور شیریں کلامی سے پیش آیا کرو۔ (النساء۔8)

اس آیت کو بعض علماء نے آیت میراث سے منسوخ قرار دیا ہے لیکن صحیح تربات یہ ہے یہ منسوخ نہیں، بلکہ تقسیم وراثت کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم اخلاقی ہدایت ہے۔ کہ امداد کے مستحق رشتے داروں میں سے جو لوگ وراثت میں حصے دار نہ بھی ہوں تو بھی انہیں تقسیم کے وقت کچھ دے دو۔ میراث کی تقسیم کے موقع پر کنبہ کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آجائیں ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ نیز ان سے بات بھی اخلاق اور محبت سے کرو۔ میراث میں ازروئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہی، وسعت قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

میت کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو ضابطہ شرعی کے ماتحت اس کی میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا لیکن اگر اس قرآنی آیت اور اس میں بیان کردہ اخلاقی اصول کو سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے پوتیاں یا یتیم نواسے نواسیاں جو اگرچہ باقاعدہ وارث نہیں لیکن اگر وہ ضرورت مند ہوں تو اس آیت کی رو سے ان کیلئے وراثت میں سے مال دیا جاسکتا ہے۔

زندگی میں ہی وراثت کی تقسیم

وراثت کی تقسیم کسی شخص کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ اس کی موت کے وقت جو قریبی رشتہ دار زندہ ہوتے ہیں، وہ شریعت کی بتائی ہوئی تفصیلات کے مطابق اپنا حصہ پاتے ہیں۔ وراثت کسی شخص کی زندگی میں تقسیم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں ہی اپنا مال و جائیداد تقسیم کرنا چاہے تو اسے شرعی اصطلاح میں اسے ہبہ یا گفٹ کہتے ہیں لیکن ہبہ کرتے وقت تعلیم یہ ہے کہ تقسیم میں عدل و انصاف اور مساوات کی جائے۔ جتنا لڑکے کو دیا جائے اتنا ہی لڑکی کو بھی دیا جائے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اتّقوااللہ وأعدلوا فی أولادکم۔

اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو۔ (بخاری، مسلم)

امام بخاریؒ نے اس ضمن میں لکھا ہے: کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو کوئی چیز دے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ چیز دوسروں کو نہ دے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انصاف سے کام لے اور جو چیز ایک کو دی ہے وہ دوسروں کو بھی دے۔ (باب الہبۃ للولد)

قرآن مجید میں رشتوں کی پاس داری کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۔

اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو (اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو) یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔ (سورۃ النساء: 1)

آخری عمر میں والدین اولاد کے حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر اولاد کی نظر والدین کے مال پر ہو اور وہ کسی طرح اسے حاصل کر لینے کی تدبیریں سوچیں تو اس رویّے کو پسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض دفعہ

اولاد والدین کی زندگی میں ہی انھیں ہبہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیتی ہے جو ایک خود غرضانہ حرکت ہے۔
اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت نصیب فرمائے، آمین

احکام وراثت کی اہمیت

تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (النساء۔13)

یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (النساء۔13)

اللہ، رسول کی نافرمانی سے ڈرو

وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (النساء۔14)

اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ (النساء۔14)

چودھواں رکوع: وَالّٰتِىْ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ۔۔۔ (النساء۔14)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

توبہ کی اہمیت، توبہ کی تعریف اور حقیقت، حقوق الزوجین، خواتین سے حسن سلوک کی تاکید، عورت پر ظلم وزیادتی کی ممانعت، اسلام سے پہلے عورت پر ہونے والے مظالم کا انسداد۔

توبہ میں جلدی

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَـةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔17)

وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا ہے ان لوگوں کے لیے ہے جو نادانی سے سے گناہ کا کام کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا ہے۔(نساء۔17)

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ۔۔۔ النساء۔18

اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو برے کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس وقت کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔۔۔

توبہ کے معنی رجوع الی اللہ کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک غلام، جو اپنے آقا کا نافرمان بن گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنی رکھتی ہے کہ بندے کی طرف آقا کی نظر رحمت جو پھر گئی تھی وہ از سر نو اس کی طرف منعطف ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی ان بندوں کے لیے ہے جو نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں، اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے اس کا دروازہ کھلا پائیں گے۔ مگر توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف اور بے پرواہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اس وقت جبکہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر۔ اللہ بندے کی توبہ بس اسی وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ آثار موت شروع نہ ہوں۔ کیونکہ امتحان کی مہلت جب پوری ہو گئی اور کتاب زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کونسا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص بغیر اسلام کے دنیا سے رخصت ہو جائے اور دوسری زندگی کی سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

کیا قصد و اختیار سے کیا ہوا گناہ معاف نہیں ہوتا؟

اس آیت میں بجھالۃ کا لفظ آیا ہے جس کا ظاہری مطلب یہ بنتا ہے کہ اگر کوئی نادانی سے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو گی، جان بوجھ کر کرے تو توبہ قبول نہیں ہو گی۔ لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے جو تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ جہالتہ سے اسی جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ اس کو گناہ کے گناہ ہونے کا پتہ نہ ہو یا گناہ کا قصد و ارادہ نہ ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کو گناہ کے انجام بد اور اخروی عذاب سے غفلت اس گناہ پر اقدام کا سبب ہو گئی،

اگرچہ گناہ کو گناہ جانتا ہو اور اس کا قصد و ارادہ بھی کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں جہالت کا لفظ اس جگہ حماقت و بیوقوفی کے معنی میں ہے۔ ابو العالیہؒ اور قتادہؒ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس پر متفق تھے کہ: كل ذنب اصابه عبد فهو جهالة عمداً اوغيره۔ یعنی بندہ جو گناہ بھی کرتا ہے خواہ بلا قصد ہو یا بالقصد بہر حال وہ جہالت ہی ہے۔ امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا: كل عامل بمعصيته الله فهو جاهل حين عملها۔ یعنی جو شخص کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ یہ کام کرتے ہوئے جاہل ہی ہے اگرچہ صورت میں بڑا عالم نظر آتا ہو۔ (ابن کثیر)

اسی لئے حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ: امور الدنيا كلها جهالة۔ یعنی دنیا کے وہ سارے کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت سے خارج ہوں سب کے سب جہالت ہیں۔

اس لئے صحابہ و تابعین اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہو اس کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ (بحر محیط)

آیت مذکورہ میں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ اس میں قبول توبہ کے لئے یہ شرط بتلائی ہے کہ قریب زمانہ میں ہی توبہ کرلے، توبہ کرنے میں دیر نہ کرے، اس میں قریب کا کیا مطلب ہے، اور کتنا زمانہ قریب میں داخل ہے؟ رسول کریم ﷺ نے اس کی تفسیر ایک حدیث میں خود ہی بیان فرمادی: ان الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر۔ اللہ بندے کی توبہ بس اسی وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ آثار موت شروع نہ ہوں۔

خلاصہ یہ کہ من قریب کی تفسیر جو خود رسول کریمؐ نے فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری عمر کا زمانہ قریب ہی میں داخل ہے، موت سے پہلے پہلے جو توبہ کرلی جاوے قبول ہوگی۔ البتہ غرغرہ موت کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔ اس آیت میں من قریب کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی ساری عمر ہی ایک قلیل زمانہ ہے اور موت جس کو وہ بعید سمجھ رہا ہے اس کے بالکل قریب ہے۔

اس میں بیان فرمایا کہ ان لوگوں کی توبہ قابل قبول نہیں جو عمر بھر جرأت کے ساتھ گناہ کرتے رہے اور جب موت سر پر آپہنچی اور نزع روح شروع ہو گیا، موت کے فرشتے سامنے آگئے، اس وقت کہنے لگے کہ ہم اب توبہ کرتے ہیں، انہوں نے فرصت عمر گنوا کر توبہ کا وقت کھو دیا، اس لئے ان کی توبہ مقبول نہیں ہوگی، جیسے فرعون کی توبہ جس نے غرق ہونے کے وقت پکارا کہ ہم رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے ہیں تو ان کو جواب ملا کہ کیا اب ایمان لاتے ہو جب ایمان لانے کا وقت گزر چکا؟

توبہ کی تعریف اور حقیقت

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ گناہ کے تین درجے ہیں:

1۔پہلا یہ کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب ہی نہ ہو، یہ تو فرشتوں اور انبیاء کا درجہ اور خصوصیت ہے۔

2۔گناہ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے اور پھر ان پر اصرار جاری رہے، کبھی ان پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے یہ درجہ شیاطین کا ہے

3۔تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو، اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا شیاطین کا وطیرہ ہے اس لئے باجماع امت توبہ فرض ہے،

قرآن مجید کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭعَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَـيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ (تحریم۔8)

یعنی ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو سچی توبہ، تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کا کفارہ کردیں اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کردیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

کریم الکرما اور رحیم الرحماء کی بارگاہ رحمت کی شان دیکھئے کہ انسان ساری عمر اس کی نافرمانی میں مبتلا رہے، مگر موت سے پہلے سچے دل سے توبہ کرلے تو صرف یہی نہیں کہ اس کا قصور معاف کردیا جائے بلکہ اس کو اپنے محبوب بندوں میں داخل کرکے جنت کا وارث بنادیا جاتا ہے۔

حدیث: حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: التائب من الذنب كمن لا ذنب له۔

یعنی گناہ سے سچی توبہ کرنے والا ایسا ہے جس نے گویا گناہ کیا ہی نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کرے اور وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہوجائے، تو صرف یہی نہیں کہ اس پر مواخذہ نہ ہو، بلکہ اس کو فرشتوں کے لکھے ہوئے نامہ اعمال سے مٹادیا جاتا ہے، تاکہ اس کی رسوائی بھی نہ ہو۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ توبہ سچی اور توبتہ النصوح ہو، جس کی تین شرائط ہیں۔

1۔توبہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری کرے۔ حدیث میں ارشاد ہے: انما التوبۃ الندم یعنی توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔

2۔توبہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ جس گناہوں کا ارتکاب کیا ہے ان کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم وارادہ کرے۔

3۔توبہ کی تیسری شرط یہ ہے کہ گناہوں کی تلافی کی فکر کرے۔ یعنی جو حقوق اللہ اور حقوق العباد پامال ہوچکے ہیں ان کی تلافی کرے۔ مثلاً نماز روزے فوت ہوئے ہیں تو ان کی قضا کرے۔ فرض زکواۃ ادا نہیں کی اب حسب استطاعت ادا

کرنے کی فکر کرے۔ کسی کا قرض دینا ہے تو اس کو واپس کرے۔ کسی کا حق مارا ہوا ہے تو اس کی تلافی کرے۔ کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے وغیرہ۔

حقوق الزّوجین

خواتین سے حسن سلوک کی تاکید

اسلام میں بیوی کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم ہے جس کی قرآن نے بڑی تاکید کی ہے اور احادیث میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اس کی بڑی وضاحت فرمائی ہے۔

حدیث: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ

زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق بہتر ہیں اور جو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔

(ترمذی، ابو داوٗد)

اسلام سے پہلے عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اسلام نے عورت کو ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں ایک عزت کا مقام و مرتبہ عطا کیا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے سب سے بہتر ہیں۔

اسلام نے عورت کو جہاں معاشرے میں امتیازی مقام عطا کیا وہیں وراثت اور نان و نفقہ کا حق بھی اسے فراہم کیا۔ ساتھ ہی مرد کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ عورتوں کی کفالت و دیگر ضروریات کی تکمیل کرے اور اس کو تحفظ فراہم کرے

عیوب پر نظر کے بجائے خوبیوں پر رکھو

بعض اوقات ازدواجی زندگی کی ابتداء میں بیوی کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں یا شوہر کی بعض باتیں بیوی کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں جس سے وہ ایک دوسرے سے بددل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ صبر سے کام لیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلدبازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارہ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق۔ یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔

عورت پر ظلم وزیادتی کی ممانعت

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ النساء۔19

اے ایمان والو! تمہیں یہ حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کو میراث میں لے لو۔(النساء۔19)

اسلام سے پہلے عورتوں پر ہونیوالے مظالم کا انسداد

ان تین آیتوں میں ان مظالم کی روک تھام ہے جو اسلام سے پہلے عورت کئے جاتے تھے۔ان میں ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورتوں کی جان ومال کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے،عورت جس کے نکاح میں آگئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے۔

اسلام سے قبل عورت پر ایک ظلم یہ بھی ہوتا تھا کہ شوہر کے مرجانے کے بعد اس کے گھر کے لوگ اس کے مال کی طرح اس کی عورت کے بھی زبردستی وارث بن بیٹھتے تھے اور خود اپنی مرضی سے،اس کی رضامندی کے بغیر اس سے نکاح کرلیتے حتی کہ سوتیلا بیٹا تک بھی مرنے والے باپ کی عورت سے نکاح کرلیتا اور اگر چاہتے تو کسی اور جگہ نکاح نہ کرنے دیتے تھے۔اور ساری عمر وہ عورت یونہی رہنے پر مجبور ہوتی۔اسلام نے ظلم کے ان تمام طریقوں سے منع فرمایا۔

ایک ظلم یہ بھی کیا جاتا تھا کہ اگر خاوند کو بیوی پسند نہ ہوتی اور وہ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا تو ازخود اس کو طلاق نہ دیتا بلکہ اسے خوب تنگ کرتا تاکہ وہ مجبور ہوکر حق مہر جو خاوند نے اسے دیا ہوتا،ازخود واپس کرکے اس سے خلاصی پانے کو ترجیح دیتی،اسلام نے اس حرکت کو بھی ظلم قرار دیا۔

ایک یہ ظلم تھا کہ جو مال عورت کو کہیں سے وراثت میں ملا یا اس کے میکہ والوں کی طرف سے بطور ہدیہ تحفہ ملا،بیچاری عورت اس سب سے محروم وبے تعلق رہتی اور یہ سب مال سسرال کے مرد ہضم کرلیتے تھے۔

ایک ظلم یہ ہوتا تھا کہ مرد اس کو نکاح کرنے سے اس لئے روکتے تھے کہ یہ اپنا مال باہر نہ لے جاسکے بلکہ یہیں مرجائے تاکہ ہم اس کی جائیداد کے وارث بن سکیں۔

یہ سب مظالم اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کا بھی اپنے آپ کو مالک سمجھا جاتا تھا،قرآن کریم نے اس فساد کی اس جڑ کو اکھاڑ ڈالا اور اس کے تحت ہونے والے تمام مظالم کے انسداد کے لئے ارشاد فرمایا: يَآ

اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا۔ اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مالک بن بیٹھو۔

عورت کے ساتھ ظلم وزیادتی کے یہ سارے طریقے ناجائز اور حرام ہیں۔

چوتھے پارے کا آخری رکوع: حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّهٰتُکُمْ۔۔۔ (النساء۔23)

محرمات۔ سورہ نساء آیت 23 میں جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، ان کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

نسبی، رضاعی اور سسرالی رشتے سے جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان کا بیان اس آیت کریمہ میں ہو رہا ہے، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں سات عورتیں نسب (خونی رشتہ) کی وجہ سے حرام ہیں اور سات بوجہ سسرال کے پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی۔

پارہ – 5

پانچواں پارہ سورہ النساء کی آیات 24 تا 147 پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ۔۔۔ (النساء۔24)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں میں نکاح کے احکامات، محرمات کی تفصیل، محصنات سے کیا مراد ہے؟شرعی احکامات کے پیچھے حکمتیں، حقوق وفرائض، حقوق نکاح کی پابندی کرو۔(وآتوھنّ اجورھن بالمعروف)، تمہارا ہر عمل اللہ کے علم میں ہے(ان اللہ کان علیماً حکیماً)۔

نکاح کے احکامات

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ۔۔۔ (النساء۔24)

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔۔۔۔النساء۔24

جن عورتوں سے نکاح ممنوع ہے انکا ذکر ہو رہا ہے۔پچھلی آیت (نساء۔23) میں نسبی، رضاعی اور سسرالی رشتے سے جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان کا ذکر آیا تھا۔

احصان سے کیا مراد ہے؟

یاد رہے کہ احصان اور احسان دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔

قرآن کریم میں احصان چار معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔1۔شادی۔2۔ آزادی۔3۔پاکدامنی۔4۔اسلام۔

اس اعتبار سے محصنات کے چار مطلب ہیں 1۔شادی شدہ عورتیں ۔ 2۔پاکدامن عورتیں۔3۔آزاد عورتیں ۔4۔مسلمان عورتیں۔یہاں پہلا معنی مراد ہے۔

اس آیت (النساء۔24) میں بتایا جارہا ہے کہ وہ عورت جو پہلے سے شادی شدہ ہو اس سے بھی نکاح حرام ہے۔ جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، دوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا یعنی ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد شوہر والی نہیں ہو سکتی۔ بعض معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب مردوں کو تعدد ازواج کی اجازت ہے تو عورت کو کیوں نہیں۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے اس حکم میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس عورت کی اولاد کے بارے میں تعین کون کرے گا کہ وہ کس شوہر سے ہے۔ جب نسب ثابت نہیں ہو گا تو باہمی حقوق و فرائض اور اولاد کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟ وراثت کے مسائل پیدا ہونگے۔ معاشرتی لحاظ سے اولاد پر انگلیاں اٹھیں گی کہ ان کا والد کون ہے۔ اسی طرح اولاد اور والدین کے حقوق کی ادائیگی سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے پورا خاندان محروم رہے گا۔ اس کے علاوہ بے شمار سماجی مسائل کی وجہ سے عورت کیلئے ایک وقت میں ایک سے زائد شوہر ہونا باعث مصیبت ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا۔ (النساء۔24)

اللہ علیم اور دانا ہے۔

آیت کے اختتام پر یہ جملہ بڑھا کر ایک تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے، احکام مذکورہ کی اگر کوئی شخص خلاف ورزی کرے تو اگرچہ اس کی خبر کسی اور کو نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کو تو سب خبر ہے، اس سے ہر حال میں ڈرتے رہنا چاہئے۔ اور یہ بھی بتلایا کہ اس آیت میں جو احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں یہ سب کچھ حکمت پر مبنی ہیں، حکمت اس دقیق بات کو کہتے ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتی، حرمت و حلت کے احکام جو آیات میں مذکور ہیں ان کی علت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ان کو ہر حال میں ماننا لازم ہے، کیونکہ اگر ہمیں علت یا وجہ معلوم نہیں تو اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے جو علیم اور حکیم ہے۔

دوسرا رکوع: یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ۔۔۔ (النساء۔26)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اسلامی احکامات کی وضاحت، معاشرتی اور سماجی مسائل کے بارے میں اسلام کی ہدایات، سلف صالحین کا طریقہ زندگی (وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ)، اللہ کو تمہاری توبہ پسند ہے (واللہ یرید ان یتوب علیکم)، اللہ تمہارے لئے آسان احکامات چاہتا ہے (یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ)، انسان طبعاً عبادات کیلئے سست ہے (خلق الانسان

ضعیفاً)۔ ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ۔(لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ)، اسلام میں بزنس، تجارت اور مزدوری کی اہمیت۔ حلال و پاکیزہ کمائی کی شرائط، اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، کبیرہ گناہوں سے بچنے کی خصوصی تاکید، کبیرہ گناہ سے کونسے گناہ مراد ہیں، مرد اور عورت کا اجر برابر، عورت اپنی آمدن اور کمائی کی مکمل حقدار(وللنساء نصیب مما اکتسبن)۔

احکامات کی وضاحت

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (النساء۔26)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے واضح احکام بیان کر دے اور اُنہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے نیک لوگ کرتے تھے اور تمہاری توبہ قبول کرلے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔ النساء۔26

اس سورت کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں، اور اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں معاشرتی اور سماجی مسائل سے متعلق جو ہدایات دی جا چکی ہیں، ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدن کے وہ اصول و قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانہ سے ہر دور کے انبیاءؑ اور ان کے صالح پیروکار عمل کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقہ زندگی کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔

اللہ کو تمہاری توبہ پسند ہے

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔27)

اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے دور ہو جاؤ۔ النساء۔27

عرب کے جاہل معاشرے میں اسلام نے معاشرتی اور خاندانی نظام کی اصلاح کیلئے کئی اصلاحات کیں۔ قدامت پرستوں کو یہ اصلاحات سخت ناگوار گذریں جو صدیوں سے جاری رسوم و رواج اور تعصبات کے خلاف کی جارہی تھیں۔ وراثت میں عورتوں کا حصہ، بیوہ عورت کا سسرال کی بندشوں سے رہائی پانا، بالغ عورت بالخصوص مطلقہ یا

بیوہ کا عدت کے بعد اپنی مرضی سے نکاح کا اختیار ہونا، سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا، دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ اسی طرح ایک جاہلانہ روایت یہ بھی تھی کہ لوگ حائضہ عورتوں کو نہ اپنے ساتھ کھلاتے تھے اور نہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ عورت کو مخصوص ایام میں بالکل ناپاک سمجھا جاتا تھا، نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ اکھٹے بیٹھتے بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ عورتوں کو مخصوص ایام میں ایک لحاظ سے **اچھوت** سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض دوسرے مذاہب میں بھی عورتوں کے مخصوص ایام میں ان کو نہ صرف ایک **قابل نفرت چیز** سمجھا جاتا تھا بلکہ ان سے ہر لحاظ سے **معاشرتی بائیکاٹ** کیا جاتا تھا۔ یہی رواج مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا جس کے جواب میں حیض سے متعلق احکام نازل ہوئے جو سورۃ بقرہ رکوع 28 میں گذر چکے ہیں جن میں اسلام نے سوائے جماع کے حائضہ عورتوں سے تمام **معاشرتی تعلقات کو جائز** قرار دیا۔ البتہ عبادات کے حوالے سے عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حیض کی حالت میں نماز، روزہ وغیرہ سے مستثنیٰ ہیں۔

جب اسلام کے ایسے عادلانہ احکامات نازل ہوئے تو جاہلانہ روایات کے علمبرداروں میں شور اور افراتفری مچ گئی۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی اکرم ﷺ اور آپ کی دعوت واصلاحی کام کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے اس کو یہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام آئے ہیں ان کی رو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اس **اصلاح کے کام میں رکاوٹیں** ڈال رہے تھے جو اس وقت اسلامی احکامات کے تحت انجام دیا جارہا تھا۔

اللہ تمہارے لئے آسان احکامات چاہتا ہے

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ (النساء۔28)

اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پھر فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ:

یعنی اللہ پاک تم پر آسانیاں، تخفیف اور ہلکے احکام کا ارادہ فرماتے ہیں، تمہاری دقتیں دور کرنے کے لئے نکاح کے بارے میں ایسے نرم احکام دیئے جن پر سب عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔نکاح کو آسان رکھا گیا۔مہر کے بارے میں طرفین کو باہمی رضامندی سے طے کرنے کا اختیار دیا۔

پھر فرمایا:خلق الانسان ضعیفاً۔ یعنی انسان خلقی طور پر ضعیف ہے،اگر اسے بالکل ہی عورتوں سے دور رہنے کا حکم دیا جاتا تو اطاعت اور فرمانبر داری کرنے سے عاجز رہ جاتا،اس کے عجز وضعف کے پیش نظر اسے نکاح کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب دی گئی،اور نکاح کے نتیجے میں فیملی لائف قائم ہوتی ہے، آپس میں جو ایک دوسرے کو نفس اور نظر کی پاکیزگی کا نفع،اولاد جیسی نعمت اور دوسرے فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے زوجین اور خاندانی نظام کو تقویت پہنچتی ہے،پس نکاح انسانی کمزوریوں کو دور کرنے کا باہمی معاہدہ اور ایک بے مثال طریقہ ہے۔

دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۫۔۔۔(النساء۔29)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ،لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے۔۔۔

سورۃ نساء کے آغاز میں تمام انسانوں کا ایک ماں باپ سے پیدا ہونا اور سب کا ایک رشتہ اخوت میں جڑا رہنا بیان فرماکر عام انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ادائیگی کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا،پھر یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا تفصیلی بیان آیا،پھر میراث کے احکام کا بیان ہوا،جس میں یتیموں،عورتوں کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تاکید آئی،اس کے بعد نکاح کے احکام آئے کہ کس عورت سے نکاح جائز ہے کس سے درست نہیں کیونکہ نکاح ایک ایسا معاملہ اور معاہدہ ہے جس سے دوسرے کے جسم اور مال میں تصرف کرنے کا کسی کو حق ملتا ہے۔

مذکورہ آیت میں عام انسانوں کے جان ومال کی حفاظت اور ان میں ہر ناجائز تصرف کرنے کی ممانعت کا بیان ہے،خواہ وہ انسان مرد ہوں یا عورتیں اور عزیز رشتہ دار ہوں یا غیر یہاں تک کہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم سب کی جان،مال، عزت کا احترام ضروری ہے۔

بِالْبَاطِلِ میں دھوکا، فریب، جعل سازی، ملاوٹ، جھوٹ کے علاوہ ایسے تمام کاروبار اور مالی لین دین بھی شامل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔اس ممانعت میں تجارتی دھوکہ بھی شامل ہے۔ ابن جریر کی مرفوع حدیث میں ہے تجارت ایک دوسرے کی رضامندی سے ہی لین دین کرنے کا نام ہے گویا کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو تجارت کے نام سے دھوکہ دے۔ اسی طرح ممنوع اشیاء اور ممنوع کاروبار کرنا بھی باطل میں شامل ہے مثلاً منشیات، جوا وغیرہ۔ حرام اور ناجائز چیزوں کا کاروبار باہمی رضامندی کے باوجود ناجائز ہی رہے گا۔ اسی طرح وہ تمام طریقے جو شرعاًو اخلاقاً ناجائز ہوں۔باہمی لین دین سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفادو منافع کا تبادلہ ہونا چاہیے جس طرح تجارت، کاروبار، بزنس وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ آپس کی رضامندی سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب و دھوکے سے۔ جعلسازی اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر اس غلط فہمی کی بناپر ہوتی ہے کہ اندر جعل و فریب نہیں ہے۔اگر فریق ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے دھوکہ یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

تجارت کے معنی عام طور پر صرف خرید و فروخت کے لئے جاتے ہیں، مگر تفسیر مظہری میں اجارہ یعنی ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ بیع میں تو مال کے بدلہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے اور اجارہ میں محنت و خدمت کے بدلہ میں مال حاصل ہوتا ہے، لفظ تجارت ان دونوں کو حاوی ہے۔

جس طرح باطل طریقے سے دوسرے کا مال کھانا جائز نہیں اسی طرح خود اپنا مال بھی باطل طریقے سے خرچ کرنا جائز نہیں۔ مثلاً اسراف اور گناہ کے کاموں پر خرچ کرنا وغیرہ۔ (بحوالہ تفسیر بحر محیط۔ابن حیان)

آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناجائز طریقے سے کھانا حرام ہے، لیکن اگر رضامندی کے ساتھ جائز اور حلال طریقے سے مالی لین دین کرکے دوسرے کا مال حاصل کیا جائے تو وہ جائز ہے۔ اسلام میں دوسروں کا مال حاصل کرنے کے ان تمام ذرائع کی ممانعت ہے جو شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً ناجائز ہوں۔

اسلام میں بزنس اور محنت مزدوری کی اہمیت

کسب معاش کے ذرائع میں تجارت اور محنت سب سے افضل ہے۔ دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے۔

حدیث: حضرت رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال وطیب ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی خرید و فروخت (یعنی ایسا بزنس اور تجارت جس میں جھوٹ و فریب نہ ہو)۔

حدیث: حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سچا تاجر جو امانت دار ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا۔

حدیث: حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہو گا۔

پاکیزہ کمائی کی خاص شرائط

حدیث: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں اور جب کوئی سامان خریدیں تو اس کو بلاوجہ ناقص اور خراب نہ کہیں اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (حقیقت کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کی ادائیگی میں تاخیر نہ کریں اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز تاجر لوگ فاجروں، گنہگاروں کی صف میں ہوں گے سوائے اس شخص کے جو اللہ سے ڈرے اور نیکی کا معاملہ کرے اور سچ بولے۔

اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہلاکت میں نہ ڈالو

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔ (النساء۔29)

اور اپنے آپ کو (اور دوسروں کو بھی) ہلاکت میں نہ ڈالو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔

آیت کے اس حصے کو اگر پچھلے جملے کی تکمیل سمجھی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظام معاشرت خراب ہوتا ہے اور اس کے برے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔

اور اگر اسے الگ جملہ سمجھا جائے تو اس سے مراد خود کشی بھی ہو سکتی ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور ارتکاب معصیت بھی جو ہلاکت کا باعث ہے اور قتل ناحق بھی یعنی کسی معصوم انسانی جان کو قتل کرنا۔ کیونکہ اپنے جیسے کسی انسان کا قتل کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو قتل کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں اور ترتیب کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں صحیح ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا: آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے، تمہارا خیر خواہ ہے، تمہاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ تم کو ایسے کاموں سے منع کر رہا ہے جن میں تمہاری اپنی بربادی ہے یعنی جو احکام اس آیت میں دیئے گئے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق نہ کھاؤ یا کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یہ سب احکام تمہارے حق میں رحمت خداوندی ہیں تاکہ تم ان کاموں کے اخروی وبال سے بھی محفوظ رہو اور ان کے دنیوی نقصانات سے بھی۔

سات ہلاکت میں ڈالنے والے گناہ

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: اجتنبو السبع الموبقات۔۔۔ سات تباہ کرنے والی چیزوں سے بچو:

1۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا
2۔ جادو کرنا
3۔ کسی انسانی جان کو ناحق قتل کرنا۔
4۔ سود کھانا۔
5۔ یتیم کا مال کھانا۔
6۔ جنگ کے دن بھاگ جانا
7۔ پاک دامن عورتوں پر الزام لگانا جو گناہ سے بے خبر ہوں۔ (البیہقی)

قتل ناحق کی سزا

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔

(النساء۔30)

اور جو کوئی تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے آتش (دوزخ) میں ڈال دیں گے، اور یہ اللہ کیلئے کوئی مشکل نہیں۔

آیت میں ارشاد فرمایا:ومن یفعل ذلک عدوانا ظلماً فسوف نصلیہ ناراً۔

یعنی قرآنی ہدایت کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے اور جان بوجھ کر ظلم اور سرکشی کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے یا کسی بے گناہ کی جان لے لے تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے........تعدی اور ظلم کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر سہو و نسیان یا خطا سے ایسا ہو گیا تو اس کے احکام مختلف ہیں۔

کبیرہ گناہوں سے بچنے کی خصوصی تاکید

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا۔

(النساء۔31)

اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا تو ہم تم سے تمہارے چھوٹے گناہ معاف کر دیں گے۔

اس آیت سے پہلی آیات میں چند بڑے بڑے گناہوں کا ذکر اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان ہے۔ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان یہ ہے کہ جب کسی جرم پر سزا سے ڈرایا جاتا ہے جسے ترہیب کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس جرم سے باز آئے گا اس کے لئے یہ انعامات و درجات ہیں۔ اس آیت میں بھی ایک خاص انعام خداوندی کی ترغیب دی گئی ہے وہ یہ کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچ گئے تو تمہارے چھوٹے گناہوں کو ہم خود معاف کر دیں گے اور اس طرح تم ہر طرح کے بڑے چھوٹے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک وصاف ہو کر عزت و راحت کے اس مقام میں داخل ہو سکو گے جس کا نام جنت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا نامہ اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ البتہ اگر بڑے گناہوں کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مقدمہ تم پر قائم کیا جائے گا اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آجائیں گی۔

کبیرہ گناہوں سے کیا مراد ہے؟

گناہوں کے مفاسد، برے نتائج اور مضر ثمرات کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق ضروری ہے۔ اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔ کبیرہ گناہ سے مراد ہر وہ گناہ جس پر قرآن وحدیث میں سخت وعید یا

ممانعت آئی ہے یا ہر وہ کام جس سے اللہ یا اس کے رسول ﷺ نے بطور تحریم منع فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں صغیرہ گناہوں پر اصرار و مداومت بھی صغیرہ گناہوں کو کبائر بنا دیتی ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اصولی فرق کیا ہے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو گناہ کبیرہ یا بڑا گناہ بناتی ہیں:

1۔ کسی کی حق تلفی: چاہے وہ اللہ کا حق ہو، والدین، بیوی، اولاد، دوسرے عام انسان یا خود اپنا نفس۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ظلم، زیادتی یعنی حد سے گذرنا بھی کہا جاتا ہے۔

2۔ اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلہ میں استکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروانہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے، اور عمداً ان کاموں کو نہ کرے جن کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی، بے خوفی کی کیفیت اپنی اندر لیے ہوئے ہو گی اسی قدر گناہ بھی شدید ہو گا اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لیے فسق اور معصیت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

3۔ روابط کو توڑنا اور تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور درستگی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے، خواہ یہ روابط بندے اور رب کے درمیان ہوں یا ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔

اللہ ربّ العالمین، نیک اعمال کرنے پر گناہ معاف بھی فرماتے ہیں:

کچھ گناہ وضو سے معاف فرمادیتے ہیں۔

کچھ گناہ مسجد کی طرف چل کر آنے سے معاف فرمادیتے ہیں۔

کچھ گناہ نماز پڑھنے سے معاف کر دیتے ہیں۔

کچھ گناہ جمعہ پڑھنے سے معاف فرمادیتے ہیں۔

رمضان میں صیام و قیام پچھلے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

حج اپنے ماقبل گناہوں کو معاف کروا دیتا ہے۔

لیکن یہ بات یادرکھنی چاہئے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبۃ النصوح یعنی سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔وہ گناہ جن میں دوسرے بندوں کی حق تلفی شامل ہو وہ بھی اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک بندے معاف نہ کریں۔

حدیث: صحیح حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر توبہ اور استغفار کرلیا تو یہ نقطہ مٹادیا جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔جیسا قرآن میں ہے: کلا بل ران علیٰ قلوبہم۔یعنی ان کے دلوں پر زنگ لگادیا گیا ان کے بداعمال کی وجہ سے۔(41:38)

کبیرہ گناہوں میں کون سے گناہ شامل ہیں؟

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں (اکبر الکبائر) وہ تین ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔

2۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔

3۔ جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔(بخاری، مسلم)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانا۔

سود کی آمدنی کھانا۔

میدان جنگ سے راہ فرار۔

پاکدامن عورتوں پر جھوٹے الزامات لگانا۔

بیت اللہ کی بے حرمتی کرنا۔

دوسری روایات حدیث میں:

جھوٹی قسم کھانا۔

بدکاری۔

اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا اور دوسرے ضرورت مندوں کو نہ دینا۔

جادو سیکھنا۔

جادو کا عمل کرنا۔

شراب نوشی۔

بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب و سزا سے بے فکر و بے خوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

حدیث: ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلاوجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا جنات شیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل و عیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا۔ (مسند احمد، نسائی)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خائب و خاسر ہوئے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا حضرت ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا یارسول اللہ یہ محروم القسمتہ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا:

ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عباء کو ٹخنے سے نیچے لٹکاتا ہے۔

دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے۔

تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو۔

چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا بااختیار فرد ہونے کے باوجود جھوٹ بولے۔

پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے۔

چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔ (مسلم)

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔

حدیث: ایک حدیث میں ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے؟ فرمایا کہ ہاں! جو شخص کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں، کیونکہ یہی ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔ (بخاری، مسلم)

مرد اور عورت اجر میں برابر

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِن فَضْلِهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۔ (النساء۔32)

اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انھوں نے کیے اور عورتوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انھوں نے کیے اور اللہ سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

شان نزول: اس آیت کی شان نزول میں بتلایا گیا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مرد بہت سارے ایسے بیرونی امور مثلاً اللہ کی راہ میں جدوجہد اور دوسرے دینی امور میں حصہ لیتے ہیں جن سے ہم عورتیں محروم ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بحوالہ ترمذی)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ انسان یہ آرزو نہ کرے کہ کاش فلاں کا مال اور اولاد میرا ہوتا۔ (بحوالہ ابن کثیر)

قرآن مجید کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ نے سب انسانوں کو الگ الگ خصوصیات سے نوازا ہے۔

اس آیت میں بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بیشمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کسی کو مرد بنایا کسی کو عورت، کسی کو کالا، کسی کو گورا، کوئی خوبصورت ہے اور کوئی بدصورت، کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے، کوئی زیادہ ذہین ہے کوئی کم ذہین، کسی کو جسمانی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی اور صلاحیت، کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں، کسی کو زیادہ وسائل دیے ہیں اور کسی کو کم، اسی فرق و امتیاز پر انسانی معاشرت کی بنیاد قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔ جہاں سرے سے اس فرق کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں ایک دوسری نوعیت کا فساد برپا ہوتا ہے۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ کسی دوسرے کو اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے تو بے چین ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت بڑھ جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمہارے لیے مناسب سمجھے گا عطا فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو جو مختلف جسمانی قوت اپنی حکمت کے مطابق عطا کی ہے جس کی بنیاد پر وہ طاقتور کاموں میں حصہ لیتے ہیں یہ ان کے لئے قدرت کی طرف سے ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے عورتوں کو مردانہ صلاحیتوں کے کام کرنے کی آرزو نہیں کرنی چاہئے۔ عورت کو اللہ تعالیٰ نے الگ خصوصیات اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ عورتوں کی خصوصیات ان کا امتیاز ہیں۔ ان کو اپنے میدان میں اطاعت اور نیکی کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے اور اپنے میدان میں

وہ جو کچھ کمائیں گی، مردوں کی طرح ان کا پورا پورا صلہ انہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ مرد اور عورت دونوں کو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرنا چاہیے کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان استعداد، صلاحیت اور قوت کا جو فرق ہے وہ تو قدرت کا ایک فیصلہ ہے جو محض آرزو سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ کے فضل سے کسب و محنت میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں کسی کو کسی پر مطلق فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے اصل اہمیت آخرت کے لیے کمائی کی ہے جس کا اصول سب کے لیے یکساں ہے۔ لہٰذا، ایک دوسرے میں موجود خصوصیات پر فریفتہ ہونے کے بجائے اللہ کے فضل کا طلب گار ہونا ہی مفید ہو سکتا ہے اور اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو اللہ سے مانگنا اللہ کو بہت پسند ہے یاد رکھو سب سے اعلیٰ عبادت کشادگی اور وسعت و رحمت کا انتظار کرنا اور اس کی امید رکھنا ہے۔

آیت کا ایک اور مفہوم

اس آیت میں ان غیر اختیاری فضائل کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے جو دوسروں کو حاصل ہوں........ وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو دوسروں سے مال و دولت، آرام و عیش، حسن و خوبی، علم و فضل وغیرہ میں کم پاتا ہے تو عادۃً اس کے دل میں ایک مادہ حسد کا ابھرتا ہے، جس کا تقاضا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ میں بھی اس کے برابر یا زیادہ ہو جاؤں اور بسا اوقات اس پر قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جن میں انسان کے سعی و عمل کو کوئی دخل نہیں وہ محض قدرت کے انعامات ہوتے ہیں۔ جس شخص کو یہ انعامات حاصل نہیں، وہ اگر عمر بھر اس کی کوشش کرے تو یہ اس کی قدرت میں نہیں، نہ کسی دوا اور علاج یا تدبیر سے وہ ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے اور جب دوسرے کی برابری پر قدرت نہیں ہوتی تو اب اس کے نفس میں یہ خواہش جگہ پڑتی ہے کہ دوسروں سے بھی یہ نعمت چھن جائے۔ یہ بذات خود ایک گھٹیا سوچ ہے اور دنیا کے بہت سے جھگڑوں، قتل و غارت اور فساد کا سبب ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت نے اس فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: ولاتتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکمت و مصلحت جو کمالات و فضائل لوگوں میں تقسیم فرمائے ہیں کسی کو کوئی وصف دے دیا کسی کو کوئی، کسی کو کم کسی کو زیادہ، اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت پر راضی اور خوش رہنا چاہئے، دوسرے کے فضائل و کمالات کی تمنا میں نہ پڑنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ اپنے لئے رنج و غم اور حسد کے گناہ عظیم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس کو حق تعالیٰ نے مرد بنا دیا وہ اس پر شکر ادا کرے جس کو عورت بنا دیا وہ اسی پر راضی رہے اور سمجھے کہ اگر وہ مرد ہو جاتی تو شاید مردوں کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکتی اور گنہگار ہو جاتی جس کو اللہ

تعالیٰ نے خوبصورت پیدا کیا ہے وہ اس پر شکر گزار ہو کہ اس کو ایک نعمت ملی اور جو بدصورت ہے وہ بھی رنجیدہ نہ ہوا اور سمجھے کہ میرے لئے اسی میں کوئی خیر مقدر ہو گی، اگر مجھے حسن وجمال ملتا تو شاید کسی فتنہ اور خرابی میں مبتلا ہو جاتا ۔جو شخص نسب یا معاشرتی لحاظ سے بہتر حالات میں پیدا ہوا وہ اس پر شکر کرے کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اور جس کو یہ حاصل نہیں وہ اس رنج میں مبتلا نہ ہو کیونکہ یہ چیز کسی کو کوشش سے حاصل ہونے والی نہیں تھی۔ یہ سوچ اس کو گناہ میں مبتلا کر دے گی اور بجز رنج وغم کے کچھ حاصل نہ ہو گا بجائے نسب پر افسوس کرنے کے اعمال صالحہ کی فکر میں زیادہ پڑے، ایسا کرنے سے وہ بڑے نسب والوں سے بڑھ سکتا ہے۔

بعض آیات قرآنی اور ارشادات نبوی میں مسابقت فی الخیرات یعنی نیک کاموں میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کا حکم یا دوسروں کے فضائل وکمالات کو دیکھ کر ان کی تحصیل کے لئے سعی وعمل اور جدوجہد کی ترغیب آئی ہے تو وہ ان اعمال وافعال سے متعلق ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں اور کسب واکتساب سے حاصل ہو سکتے ہیں، مثلاً علمی، عملی واخلاقی کمالات کسی کے اندر دیکھ کر ان کے حاصل کرنے کی جدوجہد مستحسن اور پسندیدہ عمل ہے، یہ آیت اس کے منافی نہیں، بلکہ آیت کا آخری حصہ اس کی تائید کر رہا ہے، جس میں ارشاد ہے: للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنسآء نصيب مما اكتسبن۔ یعنی جو کوئی چیز مردوں نے کسب وعمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا اور جو عورتوں نے سعی وعمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا۔ اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ فضائل وکمالات کی تحصیل میں کسب واکتساب اور جدوجہد بیکار نہیں، بلکہ ہر مرد وعورت کو اس کی سعی وعمل کا حصہ ضرور ملے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کے علمی، عملی، اخلاقی فضائل کو دیکھ کر ان کی تمنا اور پھر تمنا پوری کرنے کے لئے سعی وعمل اور جدوجہد کرنا مطلوب اور مستحسن ہے۔ یہاں ایک مغالطہ بھی رفع ہو گیا جس میں بہت سے ناواقف مبتلا ہوا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ایک طرف بعض لوگ غیر اختیاری فضائل کی تمنا میں لگ کر اپنے عیش وآرام اور سکون واطمینان کو دنیا میں ہی برباد کر لیتے ہیں، بعض دفعہ نوبت حسد تک پہنچ جاتی ہے یعنی دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا ہونے لگی تو آخرت بھی برباد ہوئی، کیونکہ حسد کے گناہ عظیم کا ارتکاب ہوا۔ اور دوسری طرف بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی سستی کم ہمتی سے اختیاری فضائل حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے اور کوئی کہے تو اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے قسمت وتقدیر کے حوالے دینے لگتے ہیں کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ یہ آیت ان دونوں رویّوں کی اصلاح کرتی ہے۔ اس آیت نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلا دیا کہ جو کمالات وفضائل غیر اختیاری ہیں اور ان میں انسان کا کسب وعمل موثر نہیں جیسے کسی کا امیر گھرانے میں پیدا ہونا یا حسین وخوبصورت صورت پیدا ہونا وغیرہ ایسے فضائل کو

توحوالہ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور نقد رنج و غم ہے۔ البتہ جو فضائل و کمالات اختیاری ہیں جو کسب و عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب و عمل اور جدوجہد بھی ہو اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی و عمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی بلکہ ہر ایک کو بقدر محنت حصہ ملے گا مرد ہو یا عورت۔

آیت کا دوسرا مطلب: مرد اور عورت اپنی کمائی اور آمدن کے مکمل حقدار

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ۔ (النساء۔31)

مرد اپنی آمدن اور کمائی کے حقدار، اسی طرح عورتیں اپنی آمدن اور کمائی کی مکمل حقدار ہیں۔

تیسرا رکوع: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔۔۔ (النساء۔34)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

حقوق الزوجین، عورت حقوق میں برابر مگر مرد کو قوام بنا گیا، فیملی لائف کے بارے میں ہدایات، مصالحت کی کوششیں اور اصلاح احوال، سول مقدمات میں آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کا تصور، حقوق اللہ اور حقوق العباد، درس توحید، والدین کے حقوق، صلہ رحمی، یتیم و مساکین کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، عارضی پڑوسی، ہمنشیں کے حقوق، اللہ مغرور و متکبر شخص کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لایحب من کان مختالاً فخوراً)، بخل کی مزمت (بخل فی العلم، بخل فی المال)، ریاکاری کی مذمت، ایمان و انفاق ہمیشہ فائدہ مند ہی ہوتا ہے نہ کہ نقصان دہ، اللہ نہ کسی کی حق تلفی کرتا ہے نہ کسی پر ظلم (ان اللہ لایظلم مثقال ذرہ)، ابلاغ دعوت کی گواہی (شہادت علیٰ الدعوۃ)،

عورت اور مرد برابر ہیں مگر مرد کو قوام بنایا گیا

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (النساء۔34)

مرد عورتوں کے قوام (محافظ و منتظم) ہیں ان فضیلتوں کی بنا پر جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہیں۔ اور اس بنیاد پر کہ مرد معاشی کفالت کے ذمہ دار ہیں۔

اس سورت (سوۃ نساء) میں اب تک عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا تھا۔ گذر چکے ہیں، اس میں ان کی حق تلفی کی ممانعت بھی مذکور ہوئی۔ اب اس کے بعد مردوں کے حقوق کا ذکر ہو رہا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو وہ تمام انسانی حقوق دیئے جو مردوں کو حاصل ہیں، اگر عورتوں کے ذمہ کچھ فرائض مقرر کئے گئے تو مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق فرض کئے گئے۔ سورۃ بقرہ کی آیت میں ارشاد فرمایا: ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف۔(2: 822) یعنی عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ایسے ہی واجب ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں۔ اس میں دونوں کے حقوق کی مماثلت کا حکم دے کر جاہلیت کی تمام ظالمانہ رسموں کا خاتمہ کر دیا۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ دونوں کے حقوق صورت کے اعتبار سے بھی متماثل ہوں، بلکہ عورت پر ایک قسم کے کام لازم ہیں تو اس کے مقابل مرد پر دوسری قسم کے کام ہیں اور یہ ایک فطری ضرورت ہے کیونکہ جو فطری امور عورت انجام دے سکتی ہے وہ مرد انجام نہیں دے سکتا اور جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت نہیں کر سکتی۔ اس فرق کی وجہ ان خصوصیات وصفات کا مختلف ہونا ہے جو اللہ نے مرد اور عورت کو مختلف عطا کی ہیں: بما فضل الله بعضهم علی بعض۔

اس کی مثال ایسے ہے جیسے انسان کے جسم میں دل اور جگر دو اہم اعضاء ہیں۔ ایک کا کام دوسرے سے مختلف ہے یا زیادہ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے کی اہمیت کم یا ختم ہو گئی۔ وہ دونوں ایک ہی جسم کا حصہ ہیں اور اس جسم کو زندہ رکھنے کی کوشش میں برابر کے شریک ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ان کی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔

مردوں کی فطری خصوصیات کی بنیاد پر فیملی لائف میں ان کا کردار مثلاً معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ، خاندان کی حفاظت و سرپرستی جیسی ذمہ داریاں دی گئیں۔ باہمی حقوق میں اختلاف واقع ہونے کی صورت میں آپس کے تصفیہ کا طریقہ کار اور حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت کا ذکر بھی ان آیات میں کیا جا رہا ہے۔

قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ اس کا مطلب نگران یا کیئر ٹیکر کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ آیت میں مرد کی قوامیت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس آیت میں مرد کی قوامیت کی دو وجوہات بیان کی گئی ہیں: ایک مردانہ صلاحیت ہے جس میں مرد عورت سے خلقی طور پر ممتاز ہے۔ دوسری وجہ معاشی ذمہ داری ہے جس کا مکلف شریعت نے مرد کو بنایا ہے اور عورت کو

اسلام نے اس کی عفت وحیا اور اس کے تقدس وتحفظ کی خاطر اسے معاشی جدوجہد سے رخصت دی۔ہاں اگر وہ خود معاشی میدان میں آنا چاہتی ہے تو اس کی اجازت بھی موجود ہے۔

حقوق الزّوجین

فیملی لائف کے حوالے سے ہدایات

میاں بیوی مصالحت کی کوشش اور اصلاح کے اصول

اگر میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے نالاں ہوں تو کیا کیا جائے؟

اس صورتحال کا ایک حل اگلی آیت بتایا جارہا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ (النساء۔35)

اور اگر تمہیں کہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو اگر یہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر میں ہی اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے۔ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان رہتا ہے بشر طیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور مصلحین بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

نکاح کے ذریعے دو اجنبی افراد ملتے ہیں اور پوری زندگی ایک ساتھ گزارنے کا عہد کرتے ہیں۔اس لیے ان کے درمیان مزاجی ہم آہنگی ہونا ضروری ہے۔رشتہ طے کرتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ہمارے سماج میں عموماً کفو کے نام پر صرف ذات برادری دیکھی جاتی ہے اور مال داری کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے،اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد معمولی معمولی باتوں پر ٹکراؤ ہوتا ہے، تنازعات سر ابھارتے ہیں اور ازدواجی رشتے میں خوش گواری باقی نہیں رہتی۔لیکن جب نکاح ہو جائے تو زوجین میں سے ہر ایک کو رشتہ

نبھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں مردوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَن تَكْرَهُواْ شَيْئاً وَيَجْعَلَ اللّهُ فِيهِ خَيْراً كَثِيرًا۔ (النساء:19) ان (عورتوں) کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو، مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

میاں بیوی میں مصالحت کی ایک تدبیر یہ بتائی جارہی ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کرلیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بزرگ اصلاح احوال کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا کیا فائدہ ہوگا؟ اس آیت کے آخر میں ایک جملہ ارشاد فرمایا گیا: اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا۔ یعنی اگر یہ ثالث لوگ اصلاح احوال اور صلح و مصالحت کا ارادہ کرینگے اور اس کیلئے سنجیدہ کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے اس نیک کام میں برکت عطا فرمائیں گے اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کردیں گے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی تنازعات اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا آغاز اور ان کے حل کیلئے ایک مفید اضافہ ہوا، جس کے ذریعہ عدالت و حکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ دور جدید کی اصطلاح میں اس کو آوٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ بھی کہا کہتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں یہ فرمان جاری کیا تھا کہ خاندانی مقدمات کو انہیں میں واپس کردو تاکہ وہ خود آپس میں صلح کی صورت نکال لیں کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ وعداوت پیدا ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔ فقہائے حنفیہ میں سے قاضی علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن سحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو ایسے ثالثی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت وحکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کردیا کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے کیونکہ باہمی کدورت اور عداوت سے سب کو بچانا چاہئے، اس

لئے حکام اور قضاۃ کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کرلیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہوجائے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ **ثالثوں کے اختیارات** کیا ہیں۔کچھ فقہاء کہتے ہیں کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لیے سفارش کرسکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا **زوجین کے اختیار** میں ہے۔دوسرے فقہاء کے نزدیک ثالثوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کرسکتے۔البتہ معاملہ عدالت پہنچنے اور فریقین کا کسی تصفیہ پر راضی نہ ہونے کی صورت میں **مجاز عدالت کو اختیار** ہے کہ وہ معاملے کو ختم کرنے کیلئے کوئی فیصلہ کرسکتی ہے۔حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کی جو مثالیں ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات مصلحین کو مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے ان کو حاکمانہ اختیارات دے دیتے تھے۔چنانچہ حضرت عقیل بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمانؓ کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کو ثالث مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کردینا ہی مناسب ہو تو تفریق کردیں۔اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علیؓ نے حَکَم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہے ملادیں اور چاہیں جدا کردیں۔اس سے معلوم ہوا کہ ثالثین یا مصلحین بطور خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے۔البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انہیں اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلہ ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان دو آیات میں انسان کی ازدواجی اور خاندانی زندگی کیلئے جامع اور حکمت پر مبنی ہدایات ارشاد فرمائی گئیں کہ اگر اس پر پورا عمل ہوجائے تو دنیا کے اکثر جھگڑے اور تنازعات آپس میں ہی مٹ جائیں، مرد اور عورتیں سب مطمئن ہوکر اپنی ازدواجی زندگی کو ایک جنت کی زندگی کی طرح محسوس کریں اور گھریلو جھگڑے کم سے کم ہوں۔ان ہدایات کا ایک خلاصہ نیچے دیا جارہا ہے:

1۔گھر کا جھگڑا گھر ہی میں تدریجی تدبیروں کے ساتھ چکا دیا جائے۔

2۔یہ صورت ممکن نہ رہے تو ثالث کے ذریعے ان میں مصالحت کرادیں تاکہ گھر میں نہیں تو خاندان ہی کے اندر محدود رہ کر جھگڑا ختم ہوسکے۔

3۔جب یہ بھی ممکن نہ رہے تو آخر میں معاملہ عدالت تک پہنچے، وہ دونوں کے حالات و معاملات کی تحقیق کر کے عادلانہ فیصلہ کرے۔

آخر آیت میں: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ فرما کر منصف اور جج کو بھی متنبہ فرمادیا کہ تم کوئی زیادتی یا ناانصافی کروگے تو تم کو بھی ایک علیم و خبیر ذات کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

حقوق اللّٰہ اور حقوق العباد

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا ۖ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا۔ (النساء۔36)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور قریبی پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں (مثلاً خادم، ملازمین وغیرہ) سب کے ساتھ احسان کرو کہ خدا (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور) یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

زیر نظر سورۃ نساء میں حقوق العباد کا اہتمام سے ذکر ملتا ہے، شروع سورت سے یہاں تک عام انسانی حقوق کی اہمیت کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا اہتمام اور ان میں کوتاہی پر سزا، وعید اور ان دونوں یعنی بچوں اور عورتوں کے ساتھ ماضی میں ظلم روا رکھا گیا اور ظالمانہ رسمیں اختیار کی گئیں ان کی اصلاح کی گئی۔ پھر وراثت کے حقوق کا بیان آیا ہے، اس کے بعد والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور تعلق داروں اور پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق کا کچھ تفصیلی بیان آ رہا ہے اور چونکہ ان حقوق کو وہی شخص صحیح طور پر ادا کر سکتا ہے جو خوف خدا اور خوف آخرت رکھتا ہو، اس لئے ان آیات میں حقوق اللّٰہ کی تاکید فرمائی گئی اور اس کے بعد مزید حقوق العباد کا ذکر کیا گیا۔ اسی حکمت کے پیش نظر حقوق العباد سے پہلے اللہ کی عبادت کا ذکر کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے حقوق کا خیال نہ ہو تو اس سے دنیا میں اور کسی کے حقوق کی ادائیگی کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے، برادری، سوسائٹی کی شرم یا قانون سے بچنے کے لئے وہ ہزاروں راہیں اور حیلے بہانے ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ چیز جو انسان کو انسانی حقوق کے احترام پر قول و فعل میں اور ظاہر و باطن میں مجبور کرنیوالی ہے وہ صرف خوف خدا

اور تقویٰ ہے، اس لئے مختلف تعلقات اور رشتہ والوں کے حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید وعبادت کی یاد دھانی مناسب تھی۔

حقوق العباد میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا ذکر

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اس کے بعد تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا بیان فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنے حقوق کے متصل والدین کے حقوق کو بیان فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ احسانات انسان پر اس کے والدین کے ہیں کیونکہ عام اسباب میں وہی اس کے وجود کا سبب ہیں اور پیدائش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک جتنے کٹھن مراحل میں انسان کے ماں باپ ہی اس کے وجود اور پھر اس کے بقاء وارتقاء کے ضامن ہیں، اسی لئے قرآن کریم میں دوسرے مواقع میں بھی ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کے متصل بیان فرمایا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: ان اشکر لی ولولدیک۔ یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔

حدیث: ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ (بیہقی)

صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق

وَّبِذِي الْقُرْبٰى: اس آیت میں والدین کے بعد عام ذوی القربی یعنی تمام رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، قرآن کریم کی ایک جامع اور مشہور آیت میں جس کو حضور اکرم ﷺ اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا کرتے تھے: ان اللہ یامرباعدل والاحسان وایتآء ذی القربی یعنی اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں سب کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا۔ صلہ رحمی میں رشتہ داروں کی حسب استطاعت مالی مدد بھی شامل ہے اور ان سے ملاقات وخبر گیری بھی۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے۔ (بخاری، مسلم)

حدیث: حضرت سلمان ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں فقیروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور اگر اپنے ذی رحم رشتہ دار کو دیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں، ایک صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا یعنی رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے کا۔ (مسند احمد، نسائی، ترمذی)

یتیم اور مسکین کے حقوق

وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ: تیسرے نمبر پر ارشاد فرمایا والیتمی والمساکین، یتیموں اور مساکین کے حقوق کا مفصل بیان اگرچہ شروع سورت میں آچکا ہے مگر اس کی یاد دہانی رشتہ داروں کے ضمن میں فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ لاوارث بچوں اور بے کس لوگوں کی امداد و اعانت کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھیں جیسا اپنے رشتہ داروں کے لئے کرتے ہیں۔

پڑوسیوں کے حقوق

وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ: پڑوسی مسلم ہوں یا غیر مسلم یا کسی اور مذہب کے ماننے والے، تمام پڑوسی کہلائیں گے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کے دکھ سکھ میں شامل ہونا چاہیئے۔ جار الجنب قرابت دار پڑوسی کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی ایسا پڑوسی جس سے قرابت داری نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ پڑوسی سے بہ حیثیت پڑوسی کے حسن و سلوک کیا جائے چاہے وہ رشتہ دار ہو یا نہ ہو۔

عارضی پڑوسی

آیت میں الصاحب بالجنب اور جار الجنب فرمایا گیا ہے۔ الصاحب بالجنب سے مراد رفیق سفر بھی ہے اور ہم نشین دوست بھی۔ بعض نے جار الجنب سے غیر مسلم پڑوسی مراد لیا ہے۔ اس کے علاوہ جار الجنب کا ایک مطلب عارضی یا وقتی پڑوسی بھی کیا گیا ہے مثلاً کسی مجلس یا آفس میں ساتھ بیٹھنے والا، بس یا ٹرین میں ساتھ بیٹھنے والے مسافر۔ اسی طرح ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے مثلاً آپ قطار میں کھڑے ہیں اور کوئی آپ کے ساتھ کھڑا ہے، کسی دکان پر آپ شاپنگ کر رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے ارد گرد خریداری میں مصروف ہو یا سفر کے دوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ ان عارضی پڑوسیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آنا چاہیئے۔ یہ عارضی ہمسائیگی بھی ہر مہذب اور شریف معاشرے میں آدمی پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو، کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

اس سے مراد رفیق سفر، شریک کار، بیوی اور وہ شخص ہے جو کسی کی ہم نشینی اختیار کرے۔اس کی تعریف میں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جنہیں تحصیل علم، کوئی کام سیکھنے کے لئے یا کسی کاروباری سلسلہ میں آپ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے ۔(فتح القدیر)

بعض مفسرین نے فرمایا کہ صاحب بالجنب میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک ہے، صنعت مزدوری میں، دفتر کی ملازمت میں، سفر میں حضر میں۔(روح المعانی)

الفاظ قرآن ان سب معانی کو متحمل ہیں، پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی........اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا نہ ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، مستقل ہو یا عارضی، بہر حال اس کا حق ہے کہ بقدر استطاعت اس کی امداد و اعانت اور خبر گیری کرنا ایک مسلمان پر لازم ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: بخدا وہ مومن نہیں، بخدا وہ مومن نہیں، بخدا وہ مومن نہیں۔ دریافت کیا گیا کون اے اللہ کے رسولؐ؟ آپؐ نے فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی تکلیفوں سے محفوظ نہ ہو۔

حدیث: رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جبرائیل امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کی رعایت و امداد کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کر دیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

حدیث: ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی محلہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔(ترمذی، مسند احمد)

حدیث: ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں، جب کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ (مسند احمد)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا۔ (النساء۔36)

بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

آیت کا یہ آخری جملہ پچھلے تمام ارشادات کا تکملہ ہے کہ پچھلے آٹھ نمبروں میں جن لوگوں کے حقوق کی تاکید آئی ہے اس میں کوتاہی وہ ہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں تکبر اور فخر و غرور ہے۔ فخر و غرور اور تکبر اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے:

حدیث: حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو، حاضرین میں سے ایک آدمی نے سوال کیا، لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں ان کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں اور جمال کو پسند بھی فرماتے ہیں، تکبر نام ہے حق رد کرنے کا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا۔

اس حدیث میں کبر کی بطور خاص مذمت سے یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور جن جن لوگوں سے حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ اس پر عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل کبر سے خالی ہو گا۔ متکبر اور مغرور شخص صحیح معنوں میں نہ حق عبادت ادا کر سکتا ہے اور نہ اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ حسن سلوک کا اہتمام۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

بخل کی مذمّت

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ (النساء۔37)

اور ایسے لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی اور بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں اور اللہ نے انہیں اپنے فضل سے جو دیا ہے اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں فرمایا گیا کہ جو لوگ متکبرین ہوتے ہیں وہ حقوق واجبہ میں بھی بخل کرتے ہیں اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے اور دوسروں کو بھی اپنے قول و عمل سے اس بری صفت کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

آیت میں بخل کا لفظ آیا ہے، جس کا اطلاق عرف عام میں حقوق مالیہ کے اندر کوتاہی کرنے پر ہوتا ہے۔ آیت کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بخل کا لفظ عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو بخل بالمال اور بخل بالعلم دونوں کو شامل ہے۔ بظاہر یہاں مال کا بخل بیان ہو رہا ہے اگرچہ علم کا بخل بھی اس میں داخل ہے۔

انفاق کی فضیلت اور بخل کی مذمت کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

حدیث: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! بخیل کے مال و دولت کو ضائع کر دے۔

حدیث: حضرت اسماءؓ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اسماء! خیر کے راستہ میں خرچ کیا کرو اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کر دے گا اور انفاق سے بچنے کے لئے بہت زیادہ حفاظت نہ برت ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا شروع کر دے گا اور کم از کم جو تجھ سے ہو سکے اس کے دینے سے دریغ نہ کرو۔

حدیث: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سخی اللہ سے بھی قریب ہے جنت سے بھی قریب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے، اور جہنم کی آگ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے بھی دور ہے جنت سے بھی دور ہے لوگوں سے بھی دور ہے اور آگ سے قریب ہے اور جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہو) اس کنجوس سے بہتر ہے جو عبادت گذار ہو۔

حدیث: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا دو عادتیں کسی مومن میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بداخلاقی۔

آیت میں پھر فرمایا گیا:

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

اور اللہ نے انہیں اپنے فضل سے جو دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔

اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے، نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: انّ اللہ اذا انعم نعمۃ علی عبد احبّ ان یظھر اثرھا علیہ۔ اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہونا چاہئے۔

ریاکاری کی مذمت

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا۔ (النساء۔38)

اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کیلیے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخرت پر سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اُسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔ (النساء۔38)

بخل (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا) یا خرچ کرنا لیکن ریاکاری یعنی نمود و نمائش کے لئے کرنا۔ یہ دونوں باتیں اللہ کو سخت ناپسند ہیں اور ان کی ندامت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ یہاں قرآن کریم میں ان دونوں باتوں کو ان لوگوں کا وطیرہ بتایا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور شیطان ان کا ساتھی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوق واجبہ میں کوتاہی کرنا بخل کرنا معیوب ہے اسی طرح لوگوں کو دکھانے کے لئے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت برا ہے، وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوتا اور حدیث کی رو سے اسے شرک اصغر قرار دیا گیا ہے۔

حدیث: محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے، صحابہ نے پوچھا، شرک اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ریا۔ (احمد بحوالہ مشکوۃ)

حدیث قدسی: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شرک ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

حدیث: بیہقی کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب اعمال صالحہ کا ثواب تقسیم ہو گا تو اللہ تعالیٰ ریاکاری اور دکھلاوا کرنے والوں سے فرمائیں گے کہ ان لوگوں کے پاس چلے جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم دنیا میں نیک عمل کرتے تھے اور دیکھ لو کہ کیا ان کے پاس تمہارے اعمال کا ثواب اور اس کی جزاء ہے۔

حدیث: شداد بن اوس سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے نماز پڑھی دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا۔

ایمان و انفاق فائدہ مند ہی ہوتا ہے نہ کہ نقصان دہ

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا۔

(النساء۔39)

اور اگر یہ لوگ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا تھا اس میں سے خرچ کرتے تو ان کا کیا نقصان ہوتا اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔

اللہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتے، نیکی پر اجر عظیم عطا فرماتے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

(النساء۔40)

بے شک اللہ کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا اور اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے اجر عظیم بخشے گا۔ النساء۔40

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتے

رب العالمین فرماتے ہیں کہ میں کسی پر ظلم نہیں کرتا، کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا، بلکہ اس کا اجر و ثواب کئی گنا بڑھا چڑھا کر قیامت کے روز عطا فرماؤں گا جیسے اور آیت میں ہے: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا۔ ہم عدل کا ترازو رکھیں گے۔ (الانبیاء۔21)۔ بخاری و مسلم کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے واپس جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے برابر ایمان دیکھو اسے جہنم سے نکال لاؤ۔ پس بہت سی مخلوق جہنم سے آزاد ہو گی۔ حضرت ابو سعید یہ حدیث بیان فرما کر فرماتے اگر تم چاہو تو آیت قرآنی کے اس جملے کو پڑھ لو: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (4:40) حضرت سعید بن جبیر (رح) فرماتے ہیں مشرکین کے عذاب میں بھی اس آیت کے باعث کمی کر دی جاتی ہے۔ (بحوالہ ابن کثیر)

آیت کے اندر فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اعمال حسنہ کا ثواب اور جزائے خیر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں فرماتے بلکہ اپنی طرف سے اس میں اور اضافہ فرما دیتے ہیں اور آخرت میں اپنی طرف سے ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک نیکی کی دس نیکیاں

لکھی جاتی ہیں۔ اس اجر عظیم کا کیا تصور کیا جاسکتا ہے جو بارگاہ رب العزت سے ملتا ہے: وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ اور اپنے پاس سے اجر عظیم بخشے گا۔

آیت میں جو لفظ ذرۃ آیا ہے اس کا ترجمہ معروف ہی ہے اہل عرب کم وزن اور حقیر ہونے میں اس کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے۔

ابلاغ دعوت کی گواہی

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا۔ (النساء۔41)

پھر کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے گواہ بلائینگے اور تمہیں (یعنی محمد ﷺ کو) اس امت پر گواہ کر کے لائیں گے۔

ہر امت میں سے اس کا پیغمبر اللہ کی بارگاہ میں گواہی دے گا کہ یا اللہ! ہم نے تو تیرا پیغام اپنی قوم کو پہنچا دیا تھا، اب انہوں نے نہیں مانا تو ہمارا کیا قصور؟ ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ آسمانی تعلیمات اور دین کا راستہ جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی، اسے میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر یہی شہادت محمد ﷺ اپنے دور کے لوگوں پر دیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دور آپؐ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔

حدیث: ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سننے کی خواہش ظاہر فرمائی وہ سناتے ہوئے جب اس آیت (النساء۔41) پر پہنچے تو آپؐ نے فرمایا بس اب کافی ہے، حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں دیکھا تو آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ (بخاری)

علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا اور اپنی امت کے کوتاہ عمل اور بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا اس لئے آنسو مبارک جاری ہو گئے۔

بہر حال اس آیت سے معلوم ہوا کہ گزشتہ امتوں کے انبیاء اپنی اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہوں گے، اور آپ بھی اپنی امت کے اعمال کی گواہی دیں گے........ قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی امت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآن کریم میں اس کا اور اس کی شہادت کا بھی ذکر ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔

چوتھا رکوع: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی۔۔۔ (النساء۔43)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اسلام کے تدریجی احکامات کی حکمت، آسان سے مشکل کی طرف حکم، بتدریج حرمت شراب، آداب مسجد اور مسائل تیمم، طہارت کی اہمیت، کتاب الٰہی میں تحریف، گفتگو اور الفاظ کا ہیر پھیر (یحرفون الکلم عن مواضعہ)، بعض اہل کتاب کی دنیا پرستی کا تذکرہ، گمراہی کے خریدار، سمع اطاعت کی ترغیب (سمعنا واطعنا)، اہل کتاب کو دعوت اسلام، شرک اکبر الکبائر، خود نمائی کی بیماری اور تزکیہ نفس، منہ پر تعریف کی ممانعت۔

بتدریج حرمت شراب اور پس منظر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔۔۔

(النساء۔43)

اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھو سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

یہ شراب کی حرمت کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۃ بقرہ (آیت 219) میں گزرا۔ اس میں صرف یہ بتا کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے حتّٰی کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً 4 ہجری کی ابتدا میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آجائے۔ اس کے کچھ مدت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۃ مائدہ آیت 90-91 میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیاء کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا دوہرا اعظیم تر گناہ ہے۔

اسی بنا پر نبی ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اونگھ جاتا ہو تو اسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ یعنی جب نماز پڑھے تو آدمی کو اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔

آداب مسجد اور مسائل تیمم

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔

(النساء۔43)

اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو، اور پھر (وضو یا غسل کیلئے) پانی نہ ملے تو پاک مٹی (یا ریت، پتھر) پر تیمم کر لو اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر کے، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

یعنی ناپاکی کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ کیونکہ نماز کے لئے طہارت ضروری ہے۔

صعیدا طیبا سے مراد پاک مٹی یا جنس زمین میں سے کوئی چیز مثلاًریت، پتھر وغیرہ ہے۔

تیمم کیا ہے؟

تیمم کا لغوی معنی قصد اور ارادہ کرنا ہے۔ دین میں تیمم کا حکم اُس وقت ہے جب نماز اور دیگر امور کی بجا آوری کے لیے (کم از کم ایک میل کے اندر) پانی دستیاب نہ ہو یا بوجہ بیماری یا عذر پانی استعمال نہ کر سکتا ہو۔

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ ہاتھ پاک مٹی یا پاک پتھر یا چٹان پر مار کر کلائی تک دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر پھیر لے۔ (کہنیوں تک ضروری نہیں) اور منہ پر بھی پھیر لے۔

حدیث: ضربۃ للوجہ والکفین۔ نبی اکرم ﷺ نے تیمم کے بارے میں فرمایا کہ یہ دونوں ہتھیلیوں اور چہرے کے لیے ایک ایک دفعہ ہاتھ پھیرنا ہے۔ (مسند احمد)

ہر وہ پاک چیز جو زمین کی جنس (مٹی، پتھر، ریت، چٹان وغیرہ) میں سے ہو اس پر تیمم کرنا درست ہے خواہ اس پر گرد و غبار لگا ہوا ہو یا نہ ہو۔

تیمم کی سہولت کس کو حاصل ہے؟

بیمار جسے وضو کرنے سے نقصان یا بیماری میں اضافے کا اندیشہ ہو، مسافر کو اگر پانی دستیاب نہ ہو تو تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ پانی نہ ملنے کی صورت میں یہ اجازت مقیم کو بھی حاصل ہے۔ لیکن بیمار اور مسافر کو چونکہ اس قسم کی ضرورت عام طور پر پیش آتی تھی اس لیے بطور خاص ان کے لیے اجازت بیان کر دی گئی ہے۔

تیمم وضو اور غسل دونوں کا متبادل ہے۔ قضائے حاجت سے آنے والا اور بیوی سے مباشرت کرنے والا ان کو بھی پانی نہ ملنے یا سخت سردی میں مجبوری کی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی یا پتھر پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہر حال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: جعلت تربتها لنا طهورا اذا لم نجد الماء۔ جب ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔ (صحیح مسلم۔ کتاب المساجد)

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں تمام لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئی ہیں: ہماری صفیں مثل فرشتوں کی صفوں کے ترتیب دی گئیں ہمارے لئے تمام زمین مسجد بنائی گئی اور زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک اور پاک کرنے والی بنائی گئی جب ہمیں پانی نہ ملے۔ مسلم

فاقد الطہورین کیا کرے؟

اگر پانی اور تیمم دونوں پر قدرت نہ ہو جیسے عموماً ہوائی جہاز میں یا سخت برفانی علاقے میں صورتحال پیش آسکتی ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ وقتی طور پر بغیر وضو کے نماز پڑھ لے اور پھر پانی پر قدرت پانے کے بعد وضو کر کے نماز کا اعادہ کر لے۔

کتاب الٰہی میں تحریف

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ۔ (النساء۔44)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب کا ایک حصہ عطا کیا گیا وہ گمراہی خرید رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ۔

علماء اہل کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ انہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ (اوتو نصیب من الکتاب) دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو انہوں نے کتاب الٰہی کا ایک حصہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتاب الٰہی میں

سے ان کے پاس موجود تھا اس کی روح اور اس کے مقصد و مدعا سے بھی وہ لاعلم ہو چکے تھے۔ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات، عقائد کی موشگافیوں اور فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دینداری کے جوہر سے خالی تھے، اگرچہ علماء دین اور رہبران ملت کہے جاتے تھے۔

اس آیت میں بعض اہل کتاب کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں، نبی آخر الزماں ﷺ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے روگردانی کرتے ہیں اور اللہ کا دیا ہوا جو علم ان کے پاس ہے اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں ۔خود اپنی کتابوں میں نبی اکرمؐ کی بشارتیں پڑھتے ہیں لیکن اپنے نذرانوں کے لالچ میں اس حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے ۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دین اسلام کے پیروکار بھی راہ راست سے بھٹک جائیں اور ہدایت اور سچے دین کو چھوڑ دیں۔

اگلی آیت میں اسی نکتے کی مزید تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ وہ کلام اللہ کے مطلب کو بھی بدل دیتے ہیں اور خلاف منشائے الٰہی تفسیر کرتے ہیں اور ان کا یہ فعل جان بوجھ کر ہوتا ہے اور افتراء بازی پر مبنی ہوتا ہے۔ان کا لہجہ بھی طعن آمیز ہوتا ہے۔دراصل یہ لوگ حیلوں بہانوں سے حضورؐ کی بے ادبی اور گستاخی بھی کرتے تھے پس انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس روش کو چھوڑ دیں۔

گفتگو اور الفاظ کا ہیر پھیر: يحرفون الكلم عن مواضعه۔(النساء۔46)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: اس کے تین مطلب ہیں ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردوبدل کرتے ہیں۔دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمدؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کی صحبت میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقہ سے روایت کرتے ہیں۔بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی طرف آنے سے روکا جائے۔

سمع و معصیت (سن کر بھی نافرمانی کرنا) کی روش

شرک اکبر الکبائر

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا۔ (النساء۔48)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اِس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اُس نے تو بہت ہی بڑا بہتان باندھا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتٰی کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جاسکتا۔ ع بعض اہل کتاب دین کی جزئیات کا بڑا اہتمام کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے نہ ہی اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔

حدیث: تین قسم کے اعمال نامے

حدیث بروایت حضرت عائشہ صدیقہؓ: الدواوین ثلاثہ۔۔۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اعمال نامے تین قسم کے ہوں گے:

1۔ ایک وہ اعمال نامہ جس کو اللہ ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ اللہ کا فرمان ہے "بے شک اللہ اس کو ہرگز معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

2۔ دوسرے اعمال نامے میں وہ گناہ درج ہونگے جو بندوں نے آپس میں ایک دوسرے ساتھ زیادتی کی ہوگی اللہ اس کو ہرگز معاف نہ کرے گا یہاں تک کہ بندے ایک دوسرے سے اپنا حق وصول نہ کرلیں۔

3۔ تیسرے اعمال نامے میں وہ گناہ ہوگا جس کا تعلق حقوق اللہ (اللہ اور بندوں سے) ہے، یہ اللہ کے حوالے ہے جسے چاہے گا، عذاب دے گا اور جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔ (مشکوٰۃ)

حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندے تو جب تک میری عبادت کرتا رہے گا اور مجھ سے نیک امید رکھے گا میں بھی تیری خطائیں معاف فرماتا رہوں گا۔ میرے بندے اگر تو ساری زمین بھر کی خطائیں بھی لے کر میرے پاس آئے گا تو میں بھی زمین کی وسعتوں جتنی مغفرت کے ساتھ تجھ سے ملوں گا بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ (مسند احمد)

حدیث: جو بندہ لا الہ الا اللہ کہے پھر اسی پر اس کا انتقال ہو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔(مسند احمد)

حدیث: ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہؐ! جنت واجب کر دینے والی چیزیں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا جو شخص بغیر شرک کئے فوت ہوا اس کے لئے جنت واجب ہے اور جو شخص شرک کے ساتھ فوت ہوا اس کے لئے جہنم واجب ہے۔(بحوالہ ابن کثیر)

خود نمائی کی بیماری اور تزکیہ نفس

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا (النساء۔49۔50)

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی اور ستائش خود کرتے ہیں حالانکہ تزکیہ نفس تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور (انہیں اگر تزکیہ حاصل نہیں ہوتا تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔

دیکھو یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر کس طرح جھوٹ باندھتے ہیں۔ ان کے گناہگار ہونے کیلئے یہی کھلا گناہ کافی ہے۔

اپنی مدح سرائی اور عیوب سے پاک ہونیکا دعویٰ جائز نہیں

آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بعض اہل کتاب اپنے آپ کو مقدس اور پارسا بتلاتے تھے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو اپنی پاکی بیان کر رہے ہیں، ان پر تعجب کرنا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنی یا دوسروں کی پاکی بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

اپنی مدح و تعریف تین وجوہات کی وجہ سے درست نہیں:

1۔ اس کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، جو ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

2۔ خاتمہ بالخیر کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ ایمان و تقوی پر ہوگا یا نہیں، اس لئے اپنے آپ کو مقدس بتلانا خلاف خوف الٰہی ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ قیامت کے قریب ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک آدمی صبح کو مومن ہوگا لیکن (پروپیگنڈے کا شکار ہو کر) شام کو کافر ہو جائے گا۔ یبیع دینہ بعرض من الدنیا۔۔ جب تک کوئی بندہ زندہ ہے اس کے راہ راست سے ہٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہٰذا کسی کو دنیا میں ہی تقویٰ کا سرٹیفکیٹ دے دینا درست نہیں۔ اس کا فیصلہ روز محشر کے دن ہوگا اور یہ معاملہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

3۔ ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات اس دعوے سے لوگوں کو یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ یہ آدمی اللہ کے ہاں اس لئے مقبول ہے کہ یہ تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے، حالانکہ یہ جھوٹ ہے، کیونکہ انسان بہر حال انسان ہے۔ بہت سے عیوب بندہ میں موجود ہوتے ہیں چاہے دنیا کی نظر میں وہ بہت نیک اور پارسا ہو۔

حدیث: ایک روایت میں حضرت زینب بنت ابی سلمہ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس وقت چونکہ میرا نام برہ تھا (جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک) میں نے وہی بتلایا، تو آپؐ نے فرمایا: لاتزكوا انفسكم، الله اعلم باهل البر منكم، سموها زينب۔ یعنی تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو کہ تم میں سے کون پاک ہے، پھر برہ کے بجائے آپ نے زینب نام رکھا۔ (مسلم)

منہ پر تعریف وتوصیف کی ممانعت

قرآن کریم کی اس آیت اور اس کے شان نزول کی روایات سے معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کی غیر ضروری مدح و توصیف بالخصوص اپنا یا دوسروں کا تزکیہ نفس کا دعویٰ کرنا، اپنے آپ کو پاک صاف بنا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا صحیح نہیں۔ تعریفوں کے پل باندھ دینا، شیخیاں بگھارنا اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا ایک غیر اخلاقی عادت ہے۔ انسان بہر حال انسان ہے اس کو خود نمائی اور خود ستائش زیب نہیں دیتی۔ بقول شاعر:

؎ اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

قرآن کریم کے دوسرے مقام پر فرمایا گیا: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ اپنے نفسوں کی پاکیزگی اور ستائش مت کرو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم میں متقی کون ہے۔ (سورہ النجم۔32)

حدیث: حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ: ان نحثو فی وجوه المداحين التراب۔ (صحیح مسلم، کتاب الزھد) ہم تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹی ڈال دیں (یعنی منہ پر ان کی اصلاح کریں)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک آدمی کو ایک دوسرے آدمی کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپؐ نے فرمایا: ويحك قطيت عنق صاحبك۔ افسوس ہے تجھ پر تو نے اپنے ساتھی کو جیتے جی مار دیا پھر فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کو کسی کی لا محالہ تعریف کرنی ہے تو اس طرح کہا کرے کہ میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں۔ کسی کا تزکیہ بیان نہ کرے۔ (صحیح بخاری)

پانچواں رکوع: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ۔۔۔ (النساء۔51)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

طاغوت سے اجتناب، جبت اور طاغوت سے کیا مراد ہے؟ حضور اکرمؐ سے حسد کرنے والوں کی مذمت، اللہ کے فضل کے مستحق کون لوگ، انبیاء کی تکذیب، ایمان اور اعمال صالح: لازم وملزوم، امانت اور عدل وانصاف، امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرو (ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الیٰ اھلھا)، سوشل جسٹس سسٹم کی بنیاد: انسانوں کے درمیان عدل وانصاف (واذا حکمتم بین الناس اب تحکمو بالعدل)۔ اسلام میں اطاعت کی بنیاد تین چیزوں پر: اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت (اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم)، اولی الامر سے کون مراد ہے؟ حکومت وقت، امراء وحکام، آئمہ وعلماء، یا دونوں؟ ریاست اور عوام کے حقوق وفرائض۔ مسائل وتنازعات کی صورت میں قرآن وسنّت کی طرف رجوع (فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول)۔

طاغوت سے اجتناب

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔ (النساء۔51)

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جِبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور منکرین (یعنی مشرکین مکہ) کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔

اس آیت میں بعض اہل کتاب کے ایک فعل پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود یہ (جبت) بت، کاہن یا ساحر (جھوٹے معبودوں) پر ایمان رکھتے اور مشرکین مکہ کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں۔

شان نزول: ابن ابی حاتم میں ہے کہ مدینہ سے حی بن اخطب اور کعب بن اشرف مکہ والوں کے پاس آئے تو اہل مکہ نے ان سے کہا تم اہل کتاب اور صاحب علم ہو ذرا بتاؤ کہ ہم بہتر ہیں یا محمدؐ۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کیا ہو؟ اور وہ کیا ہیں؟ تو اہل مکہ نے کہا ہم صلہ رحمی کرتے ہیں، اونٹ ذبح کر کے دوسروں کو کھلاتے ہیں، غلاموں کو آزاد کرتے ہیں حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور محمدؐ تو صنبور ہیں، انہوں نے تو ہمارے رشتے ناتے تڑوا دیئے۔ اب بتاؤ ہم اچھے یا وہ؟ تو ان دونوں نے کہا تم بہتر ہو اور تم زیادہ سیدھے راستے پر ہو اس پر یہ آیت اتری۔ **نفسانی خواہشات** بعض اوقات آدمی کو دین

ایمان سے محروم کر دیتی ہیں۔ کعب بن اشرف ایک ممتاز یہودی عالم تھا جو اللہ پر ایمان رکھتا تھا اور اسی کی عبادت کرتا تھا، لیکن جب اس کے دل و دماغ پر نفسانی خواہشات کا بھوت سوار ہوا تو اس نے مسلمانوں کے خلاف قریش سے الحاق کرنا چاہا، قریش مکہ نے اس کے ساتھ ملنے کی یہ شرط لگائی کہ وہ ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ کرے، اس نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا محض علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا اگر صحیح معنی میں اس کا اتباع نہ ہو اور محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی سے مکمل اجتناب نہ ہو، ورنہ آدمی اپنے مذہب جیسی عزیز چیز کو بھی اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں بچتا۔

دوسری روایت میں ہے کہ مدینہ کے قبائل بنو وائیل اور بنو نضیر کے چند سردار جب عرب میں حضورؐ کے خلاف نفرت کی آگ لگا رہے تھے اور جنگ کی تیاری میں تھے اس وقت جب یہ قریش مکہ کے پاس آئے تو انہوں نے انہیں عالم اور پارسا سمجھ کر ان سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارا دین اچھا ہے یا محمد کا؟ تو ان لوگوں نے کہا تم اچھے دین والے اور ان سے زیادہ صحیح راستے پر ہو۔ اس پر یہ آیت اتری۔ (بحوالہ ابن کثیر)

جبت سے کیا مراد ہے؟

جِبْت کے اصل معنی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسری تمام وہمی و خیالی باتوں کو جبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جسے ہم اردو زبان میں اوہام کہتے ہیں۔

حدیث: جبت کے معنی کے بارے میں ایک حدیث میں آتا ہے: ان العیافة والطرق والطیرة من الجبت۔ پرندے اڑا کر، خط کھینچ کر، بدفالی اور بدشگونی لینا جبت میں شامل ہے۔

یعنی یہ سب شیطانی کام ہیں اور اہل عرب میں یہ چیزیں عام تھیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جبت سے مراد سحر ہے۔ اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔

طاغوت سے کیا مراد ہے؟

طاغوت کے ایک معنی شیطان بھی کئے گئے ہیں۔ دراصل معبودان باطل کی پرستش شیطان ہی کی پیروی ہے۔ اس لئے شیطان بھی طاغوت میں شامل ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ طاغوت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی عبادت اللہ کے سوا کی جائے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مالک بن انس کا قول زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے، ارشاد ہے: ان اعبدواللہ واجتنبوا الطاغوت۔

حضور اکرمؐ سے حسد کرنے والوں کی مذمت

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔54)

پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم عطا فرمایا۔

Or do they envy the people for Allah's bounties? Indeed, We have given the descendants of Abraham the Book and wisdom, along with great authority. (4:54)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جو علم و فضل اور جاہ و جلال عطا کیا تھا، اس پر بعض لوگ جلتے تھے اور حسد کرتے تھے جس کا اس آیت میں ذکر ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ قرآن و حدیث میں حسد و بغض کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے۔ حسد خواہ دنیاوی کمال پر ہو یا دینی کمال پر دونوں حرام ہیں۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

حدیث: حضرت زبیر نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ تمہاری طرف (بھی) پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے اور وہ حسد ہے اور بغض ایسی خصلت ہے جو مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔

اللہ کے فضل کے مستحق لوگ کون؟

یعنی بنو اسرائیل کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت اور آل میں سے ہیں، ہم نے نبوت بھی دی اور بڑی سلطنت و بادشاہی بھی۔ ملک عظیم سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوام عالم پر قائدانہ کردار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

انبیاء کی تکذیب

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا۔ (النساء۔55)

پھر ان میں سے بعض نے اس کتاب کو مانا اور بعض اس سے رک گئے اور دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

ان پر کچھ ایمان لائے اور کچھ نے اعراض کیا۔ یہاں حضورؐ کو تسلی دی جارہی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ! اگر یہ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لارہے تو کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی انبیاء کی تکذیب کی جاچکی ہے۔ حق بذات خود حق ہے کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے اس کی صداقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایمان اور اعمال صالحہ: لازم وملزوم

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَـهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا۔ (النساء۔57)

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے اُن کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انہیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

اس آیت میں اہل ایمان کے لئے آخرت میں جو ابدی نعمتیں ہیں، ان کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ جَعَلَنا اللّٰہ مِنْھُمْ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ذکر کرکے واضح کردیا کہ ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ایمان، عمل صالح کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے پھول مگر خوشبو کے بغیر، درخت ہو لیکن بغیر ثمر۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خیر القرون کے مسلمانوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ان کی زندگیاں ایمان کے پھل یعنی اعمال صالحہ سے مالامال تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ دور گذر گیا اور اسلام صرف کتابوں میں رہ گیا۔ بقول شاعر:

؎ مسلمان در گور و مسلمانی در کتب

یعنی مسلمان تو قبروں میں چلے گئے اور مسلمانی صرف کتابوں میں رہ گئی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص ایسے عمل کرتا ہے جو اعمال صالحہ کی لسٹ میں تو آتے ہیں مثلاً راست بازی، امانت ودیانت، ہمدردی وغم گساری اور دیگر اخلاقی خوبیاں لیکن کرنے والا اگر ایمان کی دولت سے محروم ہے یا اگر وہ صاحب ایمان تو ہے مگر وہ نیک اعمال دنیاوی نمود ونمائش کیلئے کرتا ہے تو اس کے یہ اعمال، دنیا میں تو اس کی شہرت ونیک نامی کا ذریعہ

ثابت ہوسکتے ہیں لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی کیونکہ ان کا سرچشمہ ایمان نہیں ہے یا ایمان تو ہے مگر ان اعمال کے اندر اخلاص نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اچھے اعمال کو عند اللہ ثمر آور بناتی ہیں۔

امانت اور عدل و انصاف

امانتوں کو انکے اہل کے سپرد کرو،

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا۔ (النساء۔58)

بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، بیشک اللہ تمہیں کیا ہی اچھی نصیحت فرماتا ہے، بیشک اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے۔ کعبہ کی خدمت اسلام سے پہلے بھی بڑی عزت سمجھی جاتی تھی اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزز و ممتاز مانے جاتے تھے اسی لئے بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، زمانہ جاہلیت سے ایام حج میں حجاج کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، جس کو سقایہ کہا جاتا تھا، اسی طرح بیت اللہ کی کچھ خدمات حضورؐ کے دوسرے چچا ابو طالب کے سپرد تھی، اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقررہ ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہ کی ذمہ داری تھی۔ عثمان بن طلحہ کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریمؐ اپنے کچھ صحابہ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے تشریف لائے (اس وقت تک عثمان بن طلحہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے) انہوں نے حضورؐ کو اندر جانے سے روکا اور انتہائی ترشی دکھائی، آپ نے بڑی بردباری کے ساتھ ان کے سخت کلمات کو برداشت کیا، پھر فرمایا، اے عثمان شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، جبکہ مجھے اختیار ہوگا کہ جس کو چاہوں سپرد کردوں۔۔۔ آپ یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اس کے بعد جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے یقین سا ہوگیا کہ آپ نے مجھے کچھ فرمایا ہے وہ ہوکر رہے گا، میں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا ارادہ کرلیا لیکن قوم کے دیکھ کر اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکا۔

مکہ کی پرامن فتح کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی کیونکہ وہ خاندانی طور پر خانہ کعبہ کے چابی بردار چلے آرہے تھے، انہوں نے چابی پیش کردی۔ آپؐ نے بیت اللہ کے اندر نماز ادا فرمائی اور باہر تشریف لائے تو پھر کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ لو اب یہ کنجی ہمیشہ تمہارے ہی خاندان کے پاس رہے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ جب حضور اکرمؐ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ یہ آیت اس وقت کعبہ کے اندر نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں حضورؐ نے دوبارہ عثمان بن طلحہ کو بلا کر کنجی ان کو سپرد کی۔ ایک لحاظ سے یہ آیت حضرت عثمان بن طلحہؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے خانہ کعبہ کی چابیاں لے کر حضرت عثمان بن طلحہ کو دے کر فرمایا تھا کہ: یہ تمہاری چابیاں ہیں۔ ان کے حقدار تم ہو۔ آج کا دن وفا اور نیکی کا دن ہے۔ وہ آپؐ کے اس حسن اخلاق سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول فرمالیا۔

یہاں تک آیت کے شان نزول پر کلام تھا اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آیت کا شان نزول اگرچہ کوئی خاص وقوعہ ہوا کرتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری امت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ آیت کا یہ سبب نزول اگرچہ خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اس کے مخاطب عوام اور حکام دونوں ہیں۔

آیت میں تاکید کی جارہی ہے کہ امانتیں انہیں پہنچاؤ جو امانتوں کے اہل ہیں۔ اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ امانت بصیغہ جمع استعمال فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ جو واقعہ آیت کے شان نزول کا بیان کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔

تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا: امانات میں ایک تو وہ امانتیں شامل ہیں جو کسی نہ کسی کے پاس رکھوائی ہوں۔ ان میں خیانت نہ کی جائے بلکہ باحفاظت عند الطلب لوٹا دی جائیں۔ دوسرے عہدے اور ذمہ داریاں اہل لوگوں کو دیئے جائیں۔ پچھلی امتوں کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب مذہبی پیشوائی، عہدے اور مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کردیے جو نااہل، بد اخلاق اور بد دیانت تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ یہاں اہل اسلام کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی

صلاحیت ہو۔ اگر بالفرض کسی منصب اور عہدے کیلئے مکمل اہلیت والا کوئی نہ ملے تو میسر لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

احادیث میں ادائے امانت کی تاکید

حضور اکرم ﷺ نے اداء امانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے، حضرت انس فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہو گا کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

خیانت نفاق کی علامت ہے

حدیث: حضرت ابوہریرہ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتلاتے ہوئے ایک علامت یہ بتلائی کہ جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (بخاری، مسلم)

حدیث: بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ، رسول اور سب مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة۔ یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو۔ (بخاری، کتاب العلم)

محفل یا میٹنگ کی بات بھی امانت ہے

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: المجالس بالامانة۔ یعنی محفل یا میٹنگ امانتداری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔

مطلب یہ ہے کہ مجلس یا میٹنگ میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے، ان کی اجازت کے بغیر اس کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔ آن لائن سوشل گروپس یا آن لائن میٹنگ کی گفتگو بھی شامل ہے۔

مشورہ بھی امانت ہے

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: المستشار مؤ تمن۔ یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔ اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر

جانتے ہوئے خلاف مشورہ دے دیا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہو گیا، اسی طرح کسی نے آپ سے اپنا راز کہا تو وہ اس کی امانت ہے، بغیر اس کی اجازت کے کسی سے کہہ دینا خیانت ہے۔ آیت مذکورہ میں ان تمام امانتوں کا حق ادا کرنے کی تاکید ہے۔

امانت، دیانت سے عاری شخص کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا

حدیث: لا ایمان لمن لا امانتہ لہ ولا دین لمن لا عھد لہ۔۔۔

جس شخص کے اندر امانتداری نہیں اس کے اندر ایمانداری نہیں اور جس شخص کے اندر عہد وحلف کی پاسداری نہیں اس کے اندر کوئی دینداری نہیں۔

یہاں تک پہلی آیت کے ابتدائی جملہ کی تفسیر تھی، آگے آیت کے دوسرے جملہ کی تفسیر ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ: کہ فیصلہ کرنے لگو تو عدل وانصاف کے ساتھ کیا کرو۔

آیت میں امانت کا حکم دینے کے بعد عدل وانصاف کا حکم دیا گیا۔ آیت کے پہلے جملہ میں ادائے امانت کا حکم ہے اور دوسرے میں عدل وانصاف کا۔ اس ترتیب یعنی پہلے امانت اور پھر انصاف کے اندر نہایت لطیف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ عدل وانصاف کا قیام اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا کہ جن کے ہاتھ میں انصاف کرنے کے اختیارات ہوں وہ پہلے صادق وامین نہ ہوں۔ اس ترتیب کا یہ تقاضا ہے کہ امارت، حکومت اور عہدوں پر صرف انہی لوگوں کو مقرر کیا جائے جو باصلاحیت اور اہل ہونے کے ساتھ ساتھ امانت ودیانت کی رو سے بھی اپنے منصب یا عہدہ کے اہل ہوں ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ نااہل، خائن اور کرپٹ لوگ عہدوں پر قابض ہو جائیں گے اور عدل وانصاف ممکن نہیں رہے گا۔ لہٰذا انصاف کیلئے پہلے دیانتدار اور امانتدار لوگوں کا عدل کے مناصب پر فائز ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک رشوت خور یا خائن جج کو عدالت میں بٹھا دیا جائے گا تو اس سے انصاف قائم کرنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اس نے تو انصاف کا قتل عام ہی کرنا ہے۔ اس لئے آیت میں عدل سے پہلے امانت کا حکم دیا گیا۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ: اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے بَيْنَ النَّاسِ فرمایا بین المسلمین یا بین المومنین نہیں فرمایا۔ اس میں اشارہ فرمادیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہم وطن، ہم رنگ، ہم زبان ہوں یا غیر۔ فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہو کر عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کریں۔ جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آئے تو نسل و وطن اور رنگ و زبان یہاں تک کہ مذہب ومسلک کا امتیاز کئے بغیر عدل وانصاف کا فیصلہ کریں۔

پچھلی امتوں کی ایک خامی یہ تھی کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے۔وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلف ایمانداری نگل جاتے تھے۔صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

حدیث: ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ سب سے پہلے اللہ کے سایہ کے نیچے کون جائے گا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس بات کا زیادہ علم ہے، تو پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے:

1۔جن کے سامنے جب حق آجائے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔

2۔اور جب ان سے سوال (یعنی خیرات کرنے کا تقاضا) کیا جاتا ہے تو مال کو خرچ کرتے ہیں۔

3۔اور جب وہ فیصلہ کرتے ہیں تو ایسا عادلانہ فیصلہ کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے لئے کرتے۔

اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء۔59)

اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہؐ کی اور تم میں سے اولی الامر (اختیار والوں کی)۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف (یعنی قرآن کی طرف) اور رسولؐ کی طرف (یعنی احادیث و سنت رسولؐ کی طرف)، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔

یہ آیت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔اس آیت سے اخذ ہونے والے اہم نکات یہ ہیں:

1۔اسلام کے تصور دین میں اطاعت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ایک مسلمان کیلئے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ضروری ہے۔رسول کی اطاعت بھی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔باقی اطاعتیں اس کے بعد ہیں۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ خالق کی نافرمانی کرکے مخلوق کی اطاعت نہ کرو۔

2۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے:

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من عصانی فقد عصی اللہ۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

3۔ مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جس کا نام اولی الامر کی اطاعت ہے۔ اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ آئمہ و علماء ہوں یا ملکی انتظام کرنے والے حکام یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے انحراف کرکے اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اس حوالے سے اطاعت کی شرائط و آداب اور حدود و قیود مختلف ہیں جن کا انحصار مقامی اور معاشرتی حالات، ملکی قوانین پر بھی ہے۔

اولی الامر سے کون مراد ہے؟

اولی الامر لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے، جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام و انتظام ہو۔ اس کے بارے میں مفسرین کی دو آراء ہیں:

1۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، مجاہدؒ اور حسن بصریؒ نے اولی الامر کے مصداق علماء و فقہاء کو قرار دیا ہے کہ وہ حضور اکرمؐ کے نائب ہیں اور دین کا نظام و انتظام ان کے ہاتھ میں ہے۔

2۔ بعض صحابہ کرام جن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ: اولی الامر سے مراد حکام اور امراء ہیں جن کے ہاتھ میں نظام حکومت ہے۔

امام ابو بکر جصاص اولی الامر کی تعیین کے بارے میں ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اولی الامر سے یہ دونوں مراد ہیں۔ البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اولی الامر اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں ایک قانونی طریقے سے وہ تو صرف اہل حکومت ہی کرسکتے ہیں دوسری

صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ علماء و فقہاء ہی کو حاصل ہے جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے ہی علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ اور از روئے دین ان پر ان کے احکام کی اطاعت ضروری بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اولی الامر کا اطلاق صحیح ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اولی الامر کا اطلاق دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء کو بھی اور حکام و امراء کو بھی، کیونکہ معاشرتی نظام ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لحاظ سے اولی الامر کا لفظ عام ہے۔ امراء یعنی اولی الامر اور علماء دونوں اس سے مراد ہیں جیسے کہ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا: لولا ينهاهم الربانيون۔۔۔ یعنی ان کے علماء نے انہیں جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہ روکا؟ اور دوسری جگہ فرمایا گیا: فاسئلوا اهل الذکر ان كنتم لا تعلمون۔ جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو کہ اگر تمہیں علم نہ ہو۔

اولی الامر یا علماء فقہاء کی اطاعت مشروط ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: لا طاعة لمخلوق فی معصيته الخالق۔ اللہ کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت درست نہیں۔ سنو فرمانبرداری صرف معروف میں ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے چاہے دل چاہے یا نہ چاہے لیکن اس وقت تک کہ (اللہ و رسولؐ کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو سمع و اطاعت ضروری نہیں۔ (ابو داؤد)

حدیث: بخاری شریف میں ہے سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنایا گیا ہو۔

حدیث: مسلم شریف میں ہے حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں مجھے میرے خلیل یعنی رسالت مآب ﷺ نے سننے کی وصیت کی اگرچہ ناقص ہاتھ پاؤں والا حبشی غلام ہی صاحب امر ہو۔

ان تمام احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ اولی الامر یا علماء کی اطاعت صرف اس لیے کرنی ہو گی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام و فرمودات بیان کرتے ہیں اور اس کے دین کی طرف ارشاد و ہدایت اور رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ علماء و فقہا بھی دینی امور و معاملات میں حکام کی طرح یقیناً مرجع عوام ہیں لیکن ان کی اطاعت بھی صرف اس وقت تک کی جائے گی جب تک کہ عوام کو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بتلائیں لیکن اگر وہ اس سے انحراف کریں تو عوام کے لیے ان کی اطاعت بھی ضروری نہیں بلکہ انحراف کی صورت میں جانتے بوجھتے ان کی اطاعت کرنا معصیت اور گناہ ہو گا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ایک مسلمان کیلئے چاہے وہ جس ملک میں بھی رہائش پذیر ہو مقامی اور ملکی قوانین کا احترام ضروری ہے اور کسی قانون یا اصول کو توڑنا درست نہیں۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کیلئے پر امن کوششیں اور اسلام کا پیغام دعوت و محبت کا پرچار بھی کرتے رہنا چاہئے۔

چھٹا رکوع: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا۔۔۔(النساء۔60)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

طاغوت سے اجتناب، قرآن وسنّت سے اعراض کرنے والے، مصالحت اور صلح میں دھوکہ بازی، منافقین سے چشم پوشی اور نصیحانہ رویہ اور قول بلیغ کی تاکید، محبت واطاعت رسولؐ کا اجر: جنت میں رفاقت رسولؐ، رفاقت رسولؐ میں معاون اعمال، رسول اللہ کی رفاقت کسی رنگ، نسل پر موقوف نہیں، نیک لوگوں کا ساتھ اور صحبت اللہ کا فضل ہے(ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین۔۔)

طاغوت سے اجتناب

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭوَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔(النساء۔60)

اے نبیؐ! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

یہ آیت ان منافقین کے بارے میں اتری ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن درپردہ دور جاہلیت کی طرف جھکنا چاہتے تھے۔ جیسے اور آیت میں ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِـعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا۔ (البقرۃ:170) یعنی جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کی فرمانبرداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کی پیروی پر ہی اڑے رہیں گے۔ ایمان والوں کا جواب ایسا تو نہیں ہوتا بلکہ ان کا جواب

دوسری آیت میں اس طرح مذکور ہے:اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔یعنی ایمان والوں کو جب اللہ رسول کے فیصلے اور حکم کی طرف بلایا جائے تو ان کا جواب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے تہ دل سے قبول کیا۔(النور:51)

یہ آیت اپنے حکم کے اعتبار سے عام ہے۔یہ آیت ہر اس شخص کی مذمت کا اظہار کرتی ہے جو کتاب وسنت سے روگردانی کرے۔اپنے فیصلے قرآن وسنت کے خلاف کرائے۔

طاغوت کا ایک مطلب متکبرانہ انداز میں حق سے سے منہ موڑلینا بھی ہے۔

قرآن وسنّت سے اعــراض کرنے والے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔(النساء۔61)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ(قرآن)کی طرف اور رسول(یعنی سنت رسولؐ)کی طرف آجاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ تم سے اعراض کرتے ہیں۔

اسی منافقانہ طرز عمل کے بارے میں اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا:

مصالحت میں دھوکہ بازی

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ بِاللهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا۔ (النساء۔62)

پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟اُس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔

یعنی یہ مخصوص لوگ(یعنی منافقین)جب اپنے ہی شامت اعمال اور کرتوتوں کی وجہ سے عتاب الٰہی کا شکار ہو کر مصیبتوں میں پھنستے ہیں تو پھر آکر کہتے ہیں کہ ہم تو صرف صلح، مصالحت اور بھلائی چاہتے ہیں۔

منافقین کے اس طرز عمل کے باوجود مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ ان سے خیر خواہانہ رویہ رکھیں، ان کو نصیحت اور بھلائی کی تاکید کرتے رہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا گیا:

منافقین سے چشم پوشی، نصیحانہ رویہ اور قول بلیغ کی تاکید

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا۔ (النساء۔63)

اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ بس آپ ان سے چشم پوشی کیجئے، انہیں نصیحت کرتے رہئے اور انہیں ایسا وعظ کیجئے جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم نے ان کے دلوں کے تمام بھیدوں سے واقف ہیں (جس پر ہم ان کا مواخذہ کریں گے) لیکن اے پیغمبر! آپ ان کے ظاہر کو سامنے رکھتے ہوئے در گزر ہی فرمایئے۔ ان منافقین کو آپ خیر خواہانہ نصیحت فرمادیں جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، یعنی آخرت کا خوف دلا کر ان کو مخلصانہ اسلام کی طرف دعوت دیں اور نصیحت اور قول بلیغ کے ذریعے سے ان کے اندر کی اصلاح کی کوشش جاری رکھئے!

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام کی سازشوں، گستاخانہ رویوں، جاہلانہ عادات اور غیر اخلاقی حرکات کو چشم پوشی، عفوودرگزر، وعظ، نصیحت اور قول حسن کے ذریعے سے ہی ناکام بنانے کی سعی کی جانی چاہئے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ادفع بالتی ھی احسن۔ یعنی برائی کو اچھائی سے مٹاؤ۔

اطاعت رسول ﷺ ہی ضامن نجات ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَـهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔64)

ہم نے ہر رسول کو صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی فرمانبرداری کی جائے اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آجاتے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے اور رسول ؐ بھی ان کے لئے استغفار کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا اور مہربان پاتے۔

مغفرت کے لئے بارگاہِ الٰہی میں ہی توبہ و استغفار ضروری اور کافی ہے۔ لیکن یہاں فرمایا جارہا ہے کہ: اے پیغمبرؐ! وہ تیرے پاس آتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور تو بھی ان کے لئے مغفرت کرتا۔ یہ اسلوب اس لئے اپنایا گیا کہ کہ چونکہ انہوں (منافقین) نے رسول اللہؐ کو نظر انداز کرکے اپنے تنازعات کے فیصلوں کے لئے دوسروں کی طرف رجوع کرکے آپؐ کا استخفاف کیا تھا۔ اس لئے اس کے ازالے کے لئے انہیں آپؐ کے پاس آنے کی تاکید کی گئی۔

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپؐ اس کے لئے دعا مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور حضورؐ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔ یہ بعض سلف صالحین کا قول ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اصل بخشش عطا کرنے والی ذات صرف اللہ رب العالمین کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہؐ کو دفن کرکے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آکر گر گیا اور زار و قطار روتے ہوئے آیت مذکورہ (النساء۔64) کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسول کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول اس کے لئے دعاء مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں اس وقت جو لوگ حاضر تھا ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضہ اقدس کے اندر سے آواز آئی قد غفر لک یعنی تیری مغفرت کر دی گئی۔ (تفسیر بحر محیط)

کہتے ہیں کہ صاحب علم روضہ رسولؐ کی زیارت کیلئے گئے تو خیال پیدا ہوا کہ بہت مبارک مقام، رسول اللہؐ سے کوئی دعا کروں، کوئی چیز مانگوں، اولاد مانگوں، رزق مانگوں، لیکن اسی وقت خیال آیا کہ خود آپ ﷺ کس سے مانگتے تھے؟ آپؐ نے تو جب بھی دعا کی تو اللہ ہی سے کی، جب بھی مانگا تو اللہ ہی سے مانگا۔ لہٰذا ہمیں بھی دعا اسی ہستی سے مانگنی چاہئے جس سے خود رسول اللہؐ مانگتے تھے۔

اگلی آیت میں منافقین پر یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ جب تک وہ رسول اللہ کو اپنا فیصل نہیں مانتے اس وقت تک ان کا ایمان خطرے میں ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء۔65)

سو تیرے رب کی قسم ہے یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی کسی بات (حدیث) سے اختلاف ایمان کے منافی ہے۔ یہ آیت منکرین حدیث کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اطاعت رسولؐ سے انحراف اسلام سے انحراف ہے۔ اس آیت میں رسول اکرمؐ کی عظمت اور علو مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت کی واضح تشریح فرمائی گئی کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضورؐ کے مقام و مرتبہ کو اور آپؐ کے احکامات (احادیث و سنن) کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہ کرے اور اس بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی بھی نہ پائے۔ تنگی پانے کا مطلب یہ ہے کہ جو کام حضورؐ سے قولاً یا عملاً ثابت ہو، اس کے کرنے سے دل میں تنگی محسوس کرنا بھی ضعف ایمان کی علامت ہے، مثلاً جہاں شریعت نے تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی وہاں تیمم کرنے پر جس شخص کا دل راضی نہ ہو وہ اس کو تقویٰ نہ سمجھے بلکہ اپنے دل کا روگ سمجھے، حضور اکرمؐ سے زیادہ کوئی متقی نہیں ہو سکتا جس صورت میں حضورؐ نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی اور خود بیٹھ کر ادا فرمائی، اگر کسی شخص کا دل اس پر راضی نہ ہو اور ناقابل برداشت محنت و مشقت اٹھا کر کھڑے ہی ہو کر نماز ادا کرے، تو وہ سمجھ لے کہ اس کے دل میں روگ ہے۔ ہاں معمولی ضرورت یا تکلیف کے وقت اگر رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرے تو درست ہے، مگر مطلقاً شرعی رخصتوں سے تنگدلی محسوس کرنا کوئی تقویٰ نہیں۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمتوں پر عمل کرنے سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح رخصتوں پر عمل کرنے کو بھی پسند فرماتے ہیں۔

دین و دنیا کے معاملات میں ایک مسلمان کیلئے سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو خود حضور اکرم ﷺ کا اپنا معمول رہا اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرام کا جس پر عمل رہا۔ اس آیت کا حکم صرف حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لئے ہے جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی اکرمؐ لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و راہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کیلئے فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لایومن احدکم حتی یکون هواہ تبعا لما جئت بہ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔

محبت واطاعت رسولؐ کا اجر: جنّت میں رفاقت رسولؐ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (النساء۔69)

جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ یہ بہترین رفیق ہیں۔

آیت کا شان نزول: ابن جریر میں ہے کہ ایک انصاری حضور ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا کہ سخت مغموم ہیں سبب دریافت کیا تو جواب ملا کہ حضورؐ! یہاں تو صبح شام ہم لوگ آپ کی خدمت میں آجاتے ہیں، دیدار بھی ہو جاتا ہے اور صحبت بھی میسر آجاتی ہے۔ لیکن کل قیامت کے دن تو آپؐ نبیوں کی اعلیٰ مجلس میں ہوں گے ہم تو آپ تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ حضورؐ نے کچھ جواب نہ دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضورؐ نے ایک آدمی بھیج کر اس صحابی کو یہ خوشخبری سنادی۔ بعض صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا اور ہمیں اس سے کم تر مقام ملے گا اور یوں ہم جنت میں آپؐ کی صحبت، رفاقت اور دیدار سے محروم رہیں گے جو ہمیں دنیا میں حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار کر ان کی تسلی کا سامان فرمایا۔ (بحوالہ ابن کثیر)

رفاقت رسولؐ میں معاون اعمال

اس آیت میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا صلہ بتلایا جارہا ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: المرء مع من احب۔ آدمی ان کے ساتھ ہو گا جن سے اس کو محبت ہو گی۔

حدیث: بعض صحابہ کرام نے بطور خاص نبی اکرمؐ سے جنت میں رفاقت کی درخواست کی: اسالک مرافقتک فی الجنۃ۔ میں جنت میں آپؐ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ جس پر نبی اکرمؐ نے انہیں کثرت سے نفلی نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی: فأعنی علی نفسک بکثرۃ السجود۔ پس تم کثرت سجود کے ساتھ میری مدد کرو۔

حدیث: ایک اور حدیث ہے: التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشہداء۔ راست باز، امانت دار، تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔ (ترمذی)

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صحابہ کرام کو جتنی خوشی اس فرمان رسولؐ کو سن کر ہوئی اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی، کیونکہ وہ جنت میں بھی رسول اللہؐ کی رفاقت پسند کرتے تھے۔

حضرت انس فرماتے ہیں واللہ میری محبت تو حضورؐ سے ہے حضرت ابو بکر (رض) سے ہے اور حضرت عمر (رض) سے ہے تو مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے بھی انہی کے ساتھ اٹھائے گا اگرچہ میرے اعمال ان جیسے نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کسی رنگ نسل پر موقوف نہیں

حدیث: حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک کالا حبشی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا جو پوچھنا ہو پوچھو؟ اس نے پوچھا: یارسول اللہؐ! آپ کو صورت میں رنگ میں نبوت میں اللہ عزوجل نے ہم پر فضیلت دے رکھی ہے۔ اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لاؤں جس پر آپ ایمان لائے ہیں اور ان احکام کو بجالاؤں جنہیں آپ بجالارہے ہیں تو کیا جنت میں آپ کا ساتھ ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں ضرور (تم اپنی کالی رنگت اور بدصورتی سے نہ گھبراؤ)۔۔۔(رواہ الطبرانی فی معجم الکبیر بحوالہ ابن کثیر)

اسی حبشی کے سوال وجواب ہی پر سورۃ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی: هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيأً مذكوراً۔ حبشی نے حیرت سے سوال کیا یارسول اللہ میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جن کو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ضرور۔۔۔۔

دعا: یااللہ تو ہمارے دل بھی اپنے پیارے حبیب نبی اکرم ﷺ کی محبت سے بھر دے اور ہمارا حشر بھی انہی کے ساتھ کردے۔ آمین

صدیقین سے مراد کمال ایمان وکمال اطاعت کے حامل لوگ ہیں۔ نبوت کے بعد اس کا مقام ہے۔ امت مسلمہ میں اس مقام میں **حضرت ابو بکر صدیق** رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے ممتاز ہیں۔ اور اسی لیے بالاتفاق بعد از انبیاء علیہم السلام افضل ہیں۔ صدیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت **راستباز** ہو، جس کے اندر **صداقت پسندی** اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ ایسے راستباز

لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابل اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔

صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ادخلو فی السلم کافّہ کا مصداق بنیں یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کامل طور پر ادا کریں۔ صالح سے مراد وہ شخص بھی ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگوں کی صحبت اور رفاقت دنیا و آخرت میسر آجائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

نیک لوگوں کی رفاقت اللہ کا فضل ہے

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا۔ (النساء۔70)

یہ اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے (یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کے فضل و کرم کا حقدار ہے)۔

ساتواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔۔۔ (النساء۔71)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں اسلام دشمن عناصر سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ہدایت، متحد اور طاقتور ہو کر زندہ رہو، اپنا دفاع مضبوط کرو، مدافعانہ صلاحیتیں پیدا کرو، منافقین کی مفاد پرستی، مظلوم کی فریاد، ظلم اور کھٹن کے ماحول میں نجات کی دعا، دعاء بندہ مومن کا ہتھیار۔ مظلوم کی دادرسی۔

طاقتور اور متحد ہو کر زندہ رہو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔۔۔ (النساء۔71)

اے ایمان والو! اپنی حفاظت کا سامان مکمل رکھو۔۔۔

یعنی اپنا دفاع مضبوط رکھو۔ اپنی حفاظتی تدابیر اور بچاؤ اختیار کرو۔ ایک حدیث مبارکہ کے اندر آپ ﷺ نے فرمایا: لا تتمنو لقاء العدو، فاذا لقیتم فاصبرو۔ کہ جنگ کی آرزو نہ کرو لیکن اگر جنگ مسلط کر دی جائے تو ثابت قدمی دکھاؤ۔

منافقین کی مفاد پرستی

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا۔
وَلَىِٕنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔(النساء۔72۔73)

اور یقیناً تم میں بعض وہ بھی ہیں جو پس و پیش کرتے ہیں پھر اگر تمہیں کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ اور اگر تمہیں اللہ کی جانب سے کوئی نعمت نصیب ہو جائے تو یہی (منافق افسوس کرتے ہوئے) یوں کہے گا گویا تمہارے اور اس کے درمیان کچھ دوستی ہی نہ تھی کہ اے کاش! میں ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا۔

ظلم اور گھٹن کے ماحول سے نجات کی دعا

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (النساء۔74)

اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

اشارہ ہے ان مظلوم بچوں، عورتوں اور مردوں کی طرف جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے یہ غریب طرح طرح سے تختہ مشق ستم بنائے جا رہے تھے۔ ظالموں کی بستی سے یہاں مراد مکہ ہے۔ ہجرت کے بعد وہاں باقی رہ جانے والے مسلمان خاص طور پر بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے قریش مکہ کے ظلم ستم سے تنگ آ کر اللہ کی بارگاہ میں مدد کی دعا کرتے تھے۔ یہ دعا عام ہے اور کوئی بھی مجبور ولاچار شخص مصیبت اور پریشانی بالخصوص گھٹن کے ماحول میں اس دعا کا ورد کر سکتا ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نامساعد حالات اور مصائب میں دعا ایک بہترین علاج ہے۔

دعا بندہ مومن کا ہتھیار

حدیث: الدعاء سلاح المؤمن ، وعماد الدين ، ونور السماوات والأرض۔ دعا ایک بندہ مومن کا ہتھیار ہے، دین کا ستون ہے اور آسمان وزمین کا نور ہے۔(صحیح حدیث)

اس آیت سے ایک اہم ہدایت بھی معلوم ہوتی ہے کہ مظلوم کی فریاد کی دادرسی کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ ایک حدیث کے مطابق مظلوم کی دعا اور عرش کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔

حدیث: حضرت براء بن عازب روایت فرماتے ہیں کہ ہمیں نبی اکرم ﷺ نے سات باتوں کا حکم دیا:

1۔جنازہ کے ساتھ چلنا۔

2۔مریض کی عیادت کرنا۔

3۔دعوت کو قبول کرنا۔

4۔مظلوم کی مدد کرنا۔

5۔قسم، عہد یا حلف پورا کرنے میں دوسرے کی مدد کرنا۔

6۔سلام کا جواب دینا۔

7۔چھینک کا جواب دینا یعنی یرحمک اللہ کہنا۔ (بخاری)

آٹھواں رکوع: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ۔۔۔(النساء۔77)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

مکی دور جیسے مشکل حالات میں ہدایات، موت مضبوط قلعوں میں بھی آسکتی ہے، ہماری بعض پریشانیاں خود ساختہ ہیں (ماأصابک من سیئۃ فمن نفسک)، دنیاوی آزمائشوں اور مشکلات کے پیچھے حکمتیں، سنّت کی آئینی حیثیت، رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت (من یطع الرّسول فقد اطاع اللہ)۔ اعراض اور توکل، پر مذہبی رہنما کیلئے ہدایت (فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ)، قرآن میں تدبر کرو (افلایتدبرون القرآن)، حسن معاشرت کا ایک اصول، افواہوں اور پروپیگنڈوں پر کان نہ دھرو، کوئی خبر ملے تو پہلے تحقیق کر لیا کرو، اللہ کا فضل، بھلائی کی سفارش، سفارش پر معاوضہ رشوت ہے، سلام کے فضائل و آداب (واذا حییتم بتحیۃ فحیّوا باحسن منھا اوردّوھا)۔ یوم حشر کی حاضری سب کیلئے۔

مکی دور جیسے حالات میں ہدایات

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰ تُوا الزَّکٰوۃَ۔۔ (النساء۔77)

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔۔۔

مکے میں مسلمان چونکہ تعداد اور وسائل کے اعتبار سے لڑنے کے قابل نہیں تھے اس لئے مسلمانوں کی خواہش کے باوجود انہیں قتال سے روکا گیا اور انہیں صبر و ضبط کا درس دیتے ہوئے دو باتوں کی تاکید کی جاتی رہی:

1۔ ایک یہ کہ دشمنان اسلام کے ظالمانہ رویے کو صبر اور حوصلے سے برداشت کریں اور عفو و درگزر سے کام لیں۔

2۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے رہیں مثلاً نماز، زکوٰۃ اور دیگر عبادات پر عمل کا اہتمام کرتے رہیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے۔

یہ ہدایات عام ہیں اور مسلمان جہاں بھی اقلیت میں ہوں ان کو ان ہدایات کو سامنے رکھنا چاہیۓ۔ بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ بھی مراد لیا ہے کہ اصلاح معاشرہ سے پہلے اصلاح نفس مقدم ہے بالخصوص مکی دور جیسے حالات میں یا جہاں بھی مسلمان اقلیت میں ہوں اور اعلانیہ دعوت دین سے بحیثیت کمیونٹی نقصان ہوتا ہو، ایسی ہر جگہ پر ان کو اصلاح معاشرہ سے پہلے اصلاح نفس پر توجہ دینی چاہیۓ۔ اسی حکمت کے پیش نظر مکہ کے ابتدائی دور میں بامر الٰہی اعلانیہ دین کی جدوجہد سے روکا گیا جس کا ذکر اس آیت کے اندر بھی ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰ تُوا الزَّکٰوۃَ۔۔ تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو (یعنی صبر کرتے رہو) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔۔ (النساء۔77)۔ اس نقطہ نظر کے حامی مفسرین اپنی دلیل میں اسی آیت کے حکم: اقیموا الصلوۃ واتوالزکوۃ۔۔۔ کا حوالہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم نماز اور زکوٰۃ کا دیا جو اصلاح نفس کا پہلا قدم ہے، اس حکم کے بعد معاشرتی اصلاح اور جدوجہد کے احکامات دیئے گئے جو اصلاح معاشرہ کا سبب ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیۓ، چنانچہ درجہ کے اعتبار سے بھی مشکل حالات میں قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور ثانی کا فرض کفایہ ہے جس سے اصلاح نفس کی اہمیت اور اس کا مقدم ہونا ظاہر ہے۔ البتہ جس جگہ یا ملک میں مکی دور جیسے حالات یا مشکلات نہیں ہیں اور مسلمانوں کیلئے کوئی معاشرتی مشکلات، قانونی رکاوٹیں یا پریشانیاں نہیں ہیں وہاں ایک مسلمان پر اصلاح نفس اور اصلاح معاشرہ دونوں فرض عین ہیں۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا۔ (النساء۔77)

(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کہ دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور جو متقی و پرہیز گار ہے اس کے لئے آخرت بہت بہتر ہے اور تم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

موت مضبوط قلعوں میں بھی آسکتی ہے

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔ (النساء۔78)

(اے موت سے ڈرنے والو!) تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آ پکڑے گی، گو تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور جب انہیں بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور جب کوئی برائی اور تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی وجہ سے ہے۔ کہہ دیجیے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

حدیث: عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالَ : أَخَذَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِي ، فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ ، أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ : إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ،وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ۔(بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا شانہ پکڑ کر فرمایا: "دنیا میں اس طرح رہو، جیسے تو مسافر یا راستہ چلنے والا ہو۔" عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو اور صبح کے وقت شام کے منتظر نہ رہو۔ اپنی صحت کو مرض سے پہلے غنیمت جانو اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت جانو۔ (بخاری)

ہماری بعض پریشانیاں خود ساختہ ہیں

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ (النساء۔79)

اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے (یعنی اسے اپنی خرابی نفس کی طرف منسوب کر)۔ اے محمدؐ! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔

یعنی جب فتح و کامیابی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر یہ فضل نبی ہی کے ذریعہ سے فرمایا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے پڑنے لگتے ہیں تو سارا الزام نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں اشارہ منافقین مدینہ کی طرف ہے کہ وہ ناکامی کی صورت میں شکست کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے ناکامی کا ملبہ نبی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

دنیاوی جزا و سزاء کے پیچھے حکمتیں

دنیاوی نعمتیں اللہ کے فضل و کرم سے ہیں یعنی کسی نیکی یا اطاعت کا صلہ نہیں ہے، کیونکہ نیکی کی توفیق بھی دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ علاوہ ازیں اس کی نعمتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ایک انسان کی عبادت و اطاعت اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس آیت میں یہ بھی اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنی ہی عبادت کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہو سکتا اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے پھر اللہ کی نعمتیں بھی تو بے حساب ہیں: وان تعدو نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ اللہ کی لامحدود نعمتوں کا حق ہماری محدود عبادات اور اطاعات سے کیسے ادا کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہماری عبادات واطاعت بھی رب العالمین کے شایان شان نہ ہوں۔ اس لئے ہم سب کو ہر وقت اللہ کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہیئے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جنت میں جو بھی جائے گا، محض اللہ کی رحمت سے جائے گا اپنے عمل کی وجہ سے نہیں صحابہ اکرام رضوان اللہ علیھم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ بھی اللہ کی رحمت کے بغیر جنت میں نہیں جائیں گے آپؐ نے فرمایا کہ: ہاں جب تک اللہ مجھے بھی اپنے دامن رحمت میں نہ ڈھانک لے۔ (صحیح بخاری)

جہاں نیکی اللہ کی توفیق سے ہوتی ہے وہاں برائی بھی اگرچہ اللہ کی مشیت سے ہی آتی ہے۔ جیسا کہ کل من عند اللہ سے واضح ہے۔ مصیبت کا خالق بھی اللہ ہی ہے اور وہ اللہ کی مشیت اور حکمت کے تحت آتی ہے لیکن اس کے آنے کا سبب بعض دفعہ خود انسان کے اپنے اعمال ہوتے ہیں۔

حدیث: حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندے کو جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے، اور اللہ بہت سارے گناہوں کو (ویسے ہی) معاف فرما دیتے ہیں۔

یہ مصیبت کسی گناہ کی سزا یا کسی آزمائش کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بہت ساری مصیبتیں انسان کے شامت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وما اصابک من سیئة فمن نفسک۔۔ یہاں سیئة سے مراد مصیبت ہے اس لئے فرمایا یہ تمہارے نفس سے ہے یعنی تمہاری غلطیوں، کوتاہیوں اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔ جس طرح فرمایا: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اور بہت سارے گناہ تو اللہ معاف ہی فرما دیتا ہے۔

یہ مصیبت اور پریشانیاں اللہ کے نیک بندوں پر بھی آتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ: اشد البلاء الانبیاء ثم الامثل۔۔۔ سب سے زیادہ مشکل حالات اور پریشانیاں انبیاءؑ پر آئیں۔ ان کے بعد جو بھی نیک ہوتا ہے اس پر مصائب اور مشکلات آتی ہیں۔ ایک بندہ مومن کیلئے دنیا کے مصائب و تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن کر اخروی نجات کا سبب بن جاتی ہیں۔

حدیث: حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے ایک بندہ مومن کو کوئی مصیبت پریشانی پہنچتی ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ دنیا سے جاتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک گناہ بھی نہیں ہوتا۔

ہر صاحب ایمان کو آزمائش کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ راہ حق میں مشکلات آسکتی ہیں: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ اور (ان آزماشوں میں) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے۔ (البقرہ۔155)

اس کے بعد آیت کے اندر فرمایا گیا:

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا: اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام انسانیت کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

آپ ﷺ کی رسالت تمام عالم اور تمام انسانیت کیلئے عام ہے۔ یہ آیت ایک لحاظ سے ختم نبوت کی بھی دلیل ہے۔ وارسلنک للناس رسولاً اس سے ثابت ہوا کہ حضور اکرمؐ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپؐ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رسالت پورے عالم کے انسانوں کے لئے عام ہے۔ خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تا قیامت پیدا ہوں۔ (تفسیر مظہری)

رسولؐ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا۔ (النساء۔80)

جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ لے گا تو ہم نے آپ کو ان کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا (یعنی آپ ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں)۔

یعنی یہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہو گی۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام وہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ تمہارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی راہ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمہارے ذریعہ سے پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔

اعراض اور توکل

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (النساء۔81)

آپ ان سے اعراض (یعنی چشم پوشی) کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اور اللہ اس ذمہ داری کے لئے کافی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں کچھ لوگ (منافقین مدینہ) دورخی پالیسی رکھتے تھے، زبان سے کچھ کہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے۔ یہ لوگ آپؐ کی مجلس میں جو باتیں ظاہر کرتے ہیں، اپنی نجی مجلسوں میں ان کے برعکس باتیں کرتے اور سازشوں کے جال بنتے تھے۔ اس سے حضور اکرمؐ کو سخت کوفت ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اس آیت میں ایک خاص ہدایت دی گئی ہے۔ آپؐ! ان سے اعراض کریں یعنی چشم پوشی سے کام لیں اور اللہ پر توکل کریں۔ ان کی باتیں اور سازشیں آپؐ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی کیونکہ آپ کا ولی اور کارساز اللہ ہے۔

ہر مذہبی رہنماء کیلئے ہدایت

اس آیت میں دی گئی ہدایت ہر دینی پیشوا، ہر امام، ہر داعی الی اللہ اور ہر مربّی کیلئے بھی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو، اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کے الٹے سیدھے سوالات اور الزامات اس کے سر ڈالیں گے۔ دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم واستقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن رکھنی چاہئے، اگر اس کی نیت، کوشش اور نصب العین صحیح ہو گا تو انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔ اور اس اخلاص کی بنیاد پر اللہ کے ہاں تو اجر ہے ہی، چاہے دنیاوی کامیابی یا عزت ملے یا نہ ملے۔

قرآن میں تدبّر کرو

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (النساء۔82)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس میں فکر و تدبر کی دعوت دی جا رہی ہے۔

اس سلسلے میں چند نکات قابل غور ہیں:

1۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلایتدبرون فرمایا افلایقرؤن نہیں فرمایا اس سے بظاہر ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کا مقصد قرآن کو سمجھنا اور اس پر غور و فکر یعنی تدبّر ہے نہ کہ صرف تلاوت و قرآت۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تلاوت قرآن ایک بہت بڑی سعادت اور باعث اجر و ثواب ہے مگر یہ نزول قرآن کا مقصد نہیں ہے۔ قرآن کا اصل مقصد اس کو پڑھ کر یا سمجھ کر اس پر عمل ہے اور اس کا پیغام یا دعوت دوسروں تک پہنچانا ہے اور یہ مقصد تدبّر قرآن سے ہی حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ صرف تلاوت قرآن سے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ تدبر قرآن سب کیلئے ہے کہ ہر انسان اس کتاب کے مطالب میں غور و فکر کرے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف علماء، فقہاء اور مجتہدین کا کام ہے درست نہیں ۔ البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ایک مجتہد تدبر کر کے ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا جبکہ عام فرد صرف اپنا فہم قرآن حاصل کرے گا۔ عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہو گی، جو کلید کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم یا استاد سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ

ہو سکے تو کوئی مستند و معتبر تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں بلکہ علماء سے رجوع کریں۔

یہ بات بھی یادر کھنی چاہئے کہ قرآن وسنت کی تفسیر و تشریح پر کسی ایک فرد کی اجارہ داری نہیں ہے۔ آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تفسیر قرآن کو صرف فلاں فرد نے ہی سمجھا۔ تدبر قرآن کیلئے ہر شخص کو یہ حق ہے کہ قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں وہ قرآن میں غور و فکر کر سکتا ہے۔ البتہ جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اگر اس کے پاس نہیں ہیں تو اسے تفسیر بالرّائے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن وسنت میں نہ ملے تو انہی میں غور فکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔(قرطبی)

اسی آیت میں پھر فرمایا گیا:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (النساء۔82)

اگر یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید بعض منفرد خصوصیات کا حامل ہے:

1۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہوتا تو اس کے مضامین اور بیان کردہ واقعات میں تعارض و تناقص ہوتا۔ کیونکہ ایک تو یہ کوئی مختصر سی کتاب نہیں ہے بلکہ ایک ضخیم اور مفصل کتاب ہے، جس کا ہر حصہ اعجاز و بلاغت میں ممتاز ہے۔ حالانکہ انسان کی بنائی ہوئی بڑی تصنیف میں زبان کا معیار اور اس کی فصاحت و بلاغت قائم ہی نہیں رہتی۔

2۔ دوسرے اس میں پچھلی قوموں کے وہ واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جنہیں اللہ علام الغیوب کے سواء کوئی اور بیان نہیں کر سکتا۔

3۔ تیسرے ان حکایات و قصص میں نہ باہمی تعارض و تضاد ہے اور نہ ان کا چھوٹے سے چھوٹا کوئی جزئیہ قرآن کی کسی اصل سے ٹکراتا ہے۔ حالانکہ ایک انسان گزشتہ واقعات بیان کرے تو تسلسل کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کی تفصیلات میں تعارض و تضاد واقع ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے ان تمام انسانی کوتاہیوں سے مبراء ہونے کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ یقیناً کلام الٰہی ہے اس نے فرشتے کے ذریعے سے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔

اللہ کا فضل

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (النساء۔83)

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند آدمیوں کے سوا باقی شیطان کی اتباع کر لیتے۔

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اس آیت میں بعض کمزور اور جلد باز مسلمانوں کا رویہ ان کی اصلاح کی غرض سے بیان کیا جارہاہے۔اس آیت کا یہ بھی مقصد ہے کہ بلا تحقیق باتوں کا پھیلانا یا جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا گناہ اور بڑا فتنہ ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہئے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ماسمع۔ یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من حدث بحديث وهويرى انه كذب فهوا احد الكاذبين۔ یعنی جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔(تفسیر ابن کثیر)

بھلائی کی سفارش اور برائی کی سفارش

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا۔ (النساء۔85)

جو بھلائی کی سفارش کریگا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

شفاعت یا سفارش سے کیا مراد ہے؟

اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرمایا گیا۔ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا اور بری سفارش کرنیوالے کو عذاب کا۔جائز شفاعت یا سفارش کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو،دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود

بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچا دیں۔ اس کو شرعی اصطلاح میں سفارش کرنا کہتے ہیں۔ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا اور اسی طرح جو کسی ناجائز کام کے لئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حدیث: عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الدال علی الخیر کفاعلہ یعنی جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کر دے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو۔ (البزار، والطبرانی)

اسی طرح ناجائز یا برے کام میں کسی کی مدد کرنا یا اس کی سفارش کرنا سخت گناہ ہے:

حدیث: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے کسی کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہو گا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ومایوس ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

دوسروں کی جائز مدد کی اسلام کے اندر تاکید آئی ہے:

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: واللہ فی عون العبد ماکان العبد فی عون اخیہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی بھائی کی امداد میں لگا رہے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہے اور حرام ہے۔

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس کو سخت حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے، خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے اور دعا کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے:

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے بھائی کے لئے کوئی دعاء خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے: ولک بمثل یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

سلام کو رواج دینا

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا۔ (النساء۔86)

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے (یا کوئی تحفہ یا دعا دے) تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ النساء۔86

شروع اسلام میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ کج خلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انہیں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمہارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک مسلمان جو ایک داعی و مبلغ بھی ہوتا ہے، جس کی زندگی کا مشن اور مقصد سارے لوگوں کی بھلائی اور ہدایت ہوتا ہے اس کیلئے بد اخلاقی، ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اسے غیر مسلموں کے ساتھ تو اور اچھا رویہ رکھنا چاہیئے۔

آیت میں تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے اصل معنی ہیں الدعاء بالحیاۃ یعنی درازی عمر کی دعا دینا یہاں یہ سلام کرنے کے معنی میں ہے۔ (فتح القدیر)

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں سے ہے اور السلام علیکم کے معنی یہ ہیں کہ اللہ رقیب علیکم یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔ اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے۔ دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لئے کہتے ہیں، لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ دعائیہ کلمہ بھی ہے کہ سلام دینے والا اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں۔ پھر حیات طیبہ کی دعاء ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہنچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور دوسرے کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔ اسی کے ساتھ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے

ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے ضمن میں وہ یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔

ہمیشہ سلام کا اچھا جواب دو

حدیث: سلام کا اچھا جواب دینے کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں ورحمۃ اللہ کا اضافہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے جواب میں وبرکاتہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن کوئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے تو پھر اضافے کے بغیر انہی الفاظ میں جواب دیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ صرف السلام علیکم کہنے سے دس نیکیاں اور اس کے ساتھ ورحمۃ اللہ کہنے سے بیس نیکیاں اور برکاتہ کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ (مسند احمد)

اسلام جیسا کی اس کے نام سے ہی واضح ہے کہ امن اور سلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ ایک مومن بندہ جب دوسرے سے ملتا ہے تو سب سے پہلے سلامتی ہی کی دعا (السلام علیکم: تم پر سلامتی ہو، اللہ کی امان میں رہو۔) کرتا ہے۔ یہ وہ پہلا پیغام ہوتا ہے جس کو ایک دوسرے سے ملتے وقت پہنچایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو سلام کا پیغام پہنچانا ضروری ہے۔ اس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اس ایک جملے سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام امن اور سلامتی کا علم بردار ہے۔

ہر ایک کو سلام کرو

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ سلام کرو ہر شخص کو جسے تم جانتے ہو اور جسے نہیں جانتے۔ (بخاری، مسلم)

حدیث: حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلا دو اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔ (بخاری، مسلم)

سلام میں ابتداء کرنے والا تکبر سے بری ہے

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: البادی بالسلام بری من الکبر۔ سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے۔

حدیث: حضرت ابو امامہ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتداء کرے۔(مسند احمد، ترمذی)

اپنے گھروالوں کو بھی سلام کرو

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا: بیٹے! جب گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کیا کرو، یہ تمہارے لئے اور تمہارے گھر والوں کیلئے باعث برکت ہوگا۔(ترمذی)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: أَوَلاَ أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلاَمَ بَيْنَكُمْ۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے؟ آپس میں سلام دعا کی عادت ڈالو۔(مسلم)

سلام میں بخل نہ کرو

حدیث: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے۔(طبرانی فی معجم کبیر)

یوم حشر کی حاضری سب کیلئے

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔(النساء۔87)

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے۔

نواں رکوع: فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ۔۔۔ (النساء۔88)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

منافقین کی سازشوں اور چالوں سے ہوشیار رہیں، منافقین کی اقسام، مفاد پرست لوگ، صلح، جنگ سے متعلق احکام۔

منافقین کی چالوں سے ہوشیار رہو

فَمَا لَكُمْ فِيْ الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْاؕ اَ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ (النساء۔88)

پھر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں حالانکہ اللہ نے ان کے اپنے کرتوتوں کے باعث ان (کی سوچ) کو الٹا کر دیا ہے۔ اور جس سے اللہ توفیق ہدایت سلب کر لے تو تم اس کے لیے (ہدایت کا) راستہ نہیں پاؤ گے۔

یہاں منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو احد کی جنگ میں مدینہ سے کچھ دور جا کر واپس آ گئے تھے یہ کہتے ہوئے کہ ہماری بات نہیں مانی گئی۔ جنگ احد کے ان واقعات کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ ان منافقین کے بارے میں اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ہمیں ان منافقین سے (بھی) لڑنا چاہئے، دوسرا گروہ اسے مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شہر طیبہ ہے جو خود بخود میل کچیل کو اس طرح دور کر دے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو چھانٹ دیتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

ان منافقین کی کئی اقسام تھیں جن میں سے چند کا ذکر اس رکوع میں کیا جا رہا ہے۔ بعض غدّاری کی حد تک جا پہنچے تھے جن کا الگ طور پر ذکر کیا گیا۔

منافقین کی ایک قسم وہ تھی جنہوں نے باوجود استطاعت کے ہجرت نہیں کی حالانکہ اوائل اسلام میں اسلامی تعلیمات پر عمل کیلئے صرف ایک ہی محفوظ شہر تھا اور وہ مدینہ منورہ تھا۔ لہٰذا حکم دیا گیا تھا کی سب مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔ کچھ لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لیے اٹھ کر نہ آئے کہ انہیں اپنے گھر بار، اعزہ و اقربا اور اپنے مفادات دین کی بہ نسبت عزیز تر تھے۔ جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے اور ہجرت پر قادر نہ تھے ان کو مُسْتَضْعَفِين میں شمار کر کے ہجرت سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا تھا۔

مفاد پرست لوگ

اگلی آیت میں منافقین کی ایک اور قسم بیان کی جا رہی ہے:

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔۔۔ (النساء۔91)

ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔

منافقین کی ایک قسم وہ بھی تھی جو مفاد پرستی کی راہ پر گامزن تھی۔ یہ دراصل مفاد پرستوں کا ٹولہ تھا۔ جب یہ مسلمانوں کے پاس آتے تو اسلام کا اظہار کرتے تاکہ مسلمانوں سے محفوظ رہیں۔ اور جب اپنی قوم میں جاتے تو شرک و بت پرستی کرتے تاکہ وہ انہیں اپنا ہم مذہب سمجھیں اور یوں دونوں طرف سے مفادات حاصل کرتے۔

دسواں رکوع: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا۔۔۔ (النساء۔92)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

انسانی جان کا احترام، قتل وغارت گری کی شدید مذمت، قتل ناحق کی سزا جہنم، خون ناحق کرنے والا جنت کا حقدار نہیں، یہ ایک ناقابل معافی، قصاص ودیت کے متعلق مسائل، مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا قتل بھی ناقابل معافی جرم ہے۔ قتل عمد اور قتل خطاء میں فرق اور ان کے مختلف احکام، کفارہ اور جرمانہ میں فرق، جو تمہیں سلام کرے اسے مسلمان سمجھو بشرطیکہ عقیدہ کی خرابی نہ ہو، سلام اور نماز مسلمان کی علامت، کسی کو مسلمان سمجھنے کیلئے علامات اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش درست نہیں، ہر مخلص صاحب ایمان کیلئے اجر ہے۔

قتل ناحق ناقابل معافی جرم ہے

قصاص ودیت کے مسائل

مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا قتل ناقابل معافی جرم ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا۔۔۔ (النساء۔92)

اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے مسلمان کا خون کرے، الا یہ کہ اُس سے نادانستہ ایسا سرزد ہو جائے۔۔۔

شان نزول: یہ آیت حضرت ابو درداء(رض) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ انہوں نے دوران جنگ ایک دشمن شخص پر حملہ کرنا چاہا، ابھی تلوار سونتی ہی تھی تو اس نے کلمہ پڑھ لیا لیکن ان کی تلوار چل گئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ جب حضور اکرم ﷺ سے یہ واقعہ بیان ہوا تو حضرت ابو درداء(رض) نے اپنا یہ عذر بیان کیا کہ اس نے صرف جان بچانے کی غرض سے یہ کلمہ پڑھا تھا، آپؐ نے ناراض ہو کر فرمایا: اشققت قلبہ۔۔ کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟

یہ آیت اور حدیث لمحہ فکریہ ہے ان لوگوں کیلئے جو دوسروں کو غیر مسلم بنانے میں اور ان پر کفر کا لیبل لگانے میں حد درجہ احتیاط نہیں کرتے۔

قتل وغارت کی شدید مذمت

قتل ناحق کی سزا۔ جہنّم کی آگ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔93)

وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کرر کھا ہے۔

یہ قتل عمد کی سزا ہے۔

قتل کی تین قسمیں ہیں:

1۔ قتل خطاء جس کا ذکر ما قبل کی آیت میں ہے۔

2۔ قتل شبہ عمد جو حدیث سے ثابت ہے۔

3۔ قتل عمد جس کا مطلب ہے ارادہ اور نیت سے کسی کی جان لینا۔

اسلام میں ان تینوں جرائم کی الگ الگ سزائیں بیان کی گئیں۔

اس آیت میں قتل عمد پر نہایت سخت وعید بیان کی گئی ہے مثلا اس کی سزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہنا ہو گا نیز اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور عذاب عظیم بھی ہو گا۔ اتنی سخت سزائیں بیک وقت کسی بھی گناہ کی بیان نہیں کی گئیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی کو قتل کرنا اللہ کے ہاں کتنا بڑا جرم ہے احادیث میں بھی اس کی سخت مذمت اور اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں قتل کا تعلق چونکہ حقوق العباد سے ہے جو محض توبہ سے بھی ساقط نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث عائشہ میں بیان کیا گیا کہ الدواوین ثلاثہ۔۔۔یعنی اعمال نامے کی تین قسمیں ہیں۔ اس حدیث میں فرمایا گیا کہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہ اس وقت تک معاف نہیں ہونگے جب تک بندے معاف نہ کریں۔ بعض علماء مذکورہ سخت وعیدوں کے پیش نظر قاتل کیلئے قبول توبہ کے بھی قائل نہیں۔ البتہ دوسری نصوص سے توبۃ النصوح کی صورت میں اس کی معافی ممکن ہے۔ یہاں قاتل کیلئے جہنم کی سزاء جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب

ہے کہ اگر اس نے توبہ نہیں کی تو اس کی یہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ اس جرم پر اسے دے سکتا ہے اسی طرح توبہ نہ کرنے کی صورت میں خلود (ہمیشہ جہنم میں رہنے) کا مطلب بھی مکث طویل یعنی لمبی مدت ہے۔

قتل خطاء کی دیت

وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا۔۔۔ (النساء۔92)

مقتول کے ورثاء کو خون ادا کرنا ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور نیکی (احسان کرتے ہوئے) معاف کردیں۔

اسلام کی تعلیمات میں قتل خطاء کی صورت میں ورثاء کو دیت لے کر معاف کرنے کا اختیار ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے دیت یا خوں بہا کی مقدار سو اونٹ، یا دو سو گائیں، یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خوں بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انہی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے معین کی جائے گی۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے زمانہ میں نقد خوں بہا دینے والوں کے لیے 8 سو دینار یا 8 ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے، لہٰذا اب سونے کے سکے میں ایک ہزار دینار، یا چاندی کے سکے میں 12 ہزار درہم خوں بہا دلوایا جائے گا۔ مگر واضح رہے کہ خوں بہا کی یہ مقدار جو مقرر کی گئی ہے قتل عمد کی صورت کے لیے نہیں ہے بلکہ قتل خطا کی صورت کے لیے ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ہر جرم بشمول قتل پر تحقیق کرنا، مجرم کا تعین کرنا اور سزا دینا قانون نافذ کرنے والے اداروں اور قانونی عدالتوں کا کام ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو قانونی معاملات بالخصوص جرائم کی تفتیش میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور نہ اپنے طور پر مجرم کا تعین کر کے سزا کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

اسلام کی تعلیمات میں قصاص یا دیت لینے کا حق اگرچہ مقتول کے ورثاء کا ہے مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں بلکہ اس حق کو حاصل کرنے کے لئے عدالت یا حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

(بحوالہ قرطبی)

کفارہ اور جرمانہ میں فرق

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔92)

یہ (کفارہ) اللہ کی طرف سے قبول توبہ کیلئے ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

قرآن میں جہاں بھی کفارہ کا حکم دیا گیا تو اس کے پیچھے خاص حکمت ہے۔ پہلی بات یہ سمجھنی چاہئے کہ کسی بھی گناہ یا عبادت میں کوتاہی کا کفارہ جرمانہ کی طرح نہیں ہے۔ یعنی یہ جرمانہ نہیں بلکہ توبہ کی طرح ہے۔ جرمانہ میں ندامت و شرمساری اور اصلاح نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہو وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حقوق کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے، اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے، تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لغوی معنی ہیں چھپانے والی چیز۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

جو تمہیں سلام کرے اسے مسلمان سمجھو

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَ لْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔۔۔ (النساء۔94)

اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔

ابتدائے اسلام میں السلام علیکم کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کلمہ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمہارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا تم مجھ سے دشمنی نہ کرو۔ اس مقصد کے تحت ابتداء اسلام میں سلام کا لفظ مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔
خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے لوگوں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔ اس لئے ابتداء اسلام میں سلام اور نماز کو مسلمان کی نشانی مقرر کیا گیا۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں سلام سے اطاعت مراد لیا ہے۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق تمہیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ سچا نہ ہو۔ حقیقت تو

تحقیق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ بہرحال تمہارا کسی کو مسلمان سمجھنے میں غلطی کرنا اس سے بدر جہا زیادہ بہتر ہے کہ تم کسی بے گناہ کو نقصان پہنچاؤ۔

کسی کو مسلمان سمجھنے کے لئے علامات اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش کرنا جائز نہیں۔

مذکورہ آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ بغیر تحقیق کے اس کے قول کو نفاق پر محمول کرے۔ اس سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہو خواہ کلمہ پڑھ کر یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے۔

حدیث: ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذا رائیتم الرجل یعتاد الی المساجد، فاشھدو لہ بالایمان۔۔ جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ باقاعدگی سے مسجد میں نماز کیلئے آتا جاتا ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہو گا، فرض کر لو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا: لانکفراھل القبلۃ بذنب۔ یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے غیر مسلم نہیں کہتے۔

بعض روایات حدیث میں بھی اسی قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہل قبلہ مسلمان سمجھو خواہ وہ کتنا ہی گنہگار یا بد عمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص نکتہ طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو ایمان کے منافی ہے مثلاً عقیدہ کی خرابی یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرنا جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور واضح ہے۔ جیسے مسیلمہ کذاب صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا اپنی اذان میں اشھد ان لا الہ اللہ کے ساتھ اشھد ان محمد رسول اللہ بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول کہتا تھا جو نصوص قرآن و سنت کا کھلا ہوا انکار تھا لہٰذا اس کے کلمہ پڑھنے کے باوجود اس وقت باجماع صحابہ اس کو مسلمان تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ کلمہ گو یا اہل قبلہ یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعی اسلام ہونے کے بعد کسی عقیدے کی خرابی کا مرتکب نہ ہو۔

آیت کا حکم عام ہے

اس آیت کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ تم کوئی کام بغیر تحقیق کے محض گمان پر نہ کرو۔ کسی بھی واقعہ کی تحقیق کے بغیر فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اذاضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا۔ یعنی جب تم اللہ کی راہ میں چلتے ہو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو۔ محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ سفر کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس آیت کا سبب نزول واقعات سفر ہی میں پیش آئے یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے لہٰذا وہاں غلط فہمی کا امکان کم ہوتا ہے۔ اصولاً یہ حکم عام ہے۔ سفر ہو یا حضر، بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں۔

حدیث: ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔

اس آیت کے نزول کا سبب کچھ خاص واقعات ہیں جن کا ذکر نیچے بیان کیا جا رہا ہے۔

شان نزول: احادیث میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کسی علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، صحابہ کو دیکھ کر چرواہے نے سلام کیا۔ بعض صحابہ نے سمجھا کہ شاید وہ جان بچانے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بغیر تحقیق کئے اسے دشمن سمجھ کر قتل کر ڈالا اور بکریاں (بطور مال غنیمت) لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جس پر تنبیہ کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس واقعے کی سخت مذمت اور سرزنش فرمائی اور فرمایا کہ مکہ میں پہلے تم بھی چرواہے کی طرح ایمان چھپانے پر مجبور تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اس بے گناہ کے قتل کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس سے ملتے جلتے اور بھی واقعات روایات میں ملتے ہیں جن میں سے ایک حضرت مقداد کا بھی ہے۔ آپؐ نے حضرت مقداد کو بلوایا اور فرمایا تم نے یہ کیا کیا؟ ایک کلمہ گو کو قتل کر دیا؟ کل قیامت کے دن تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے سامنے کیا جواب دو گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ نبی ﷺ نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ قتل ناحق کے اس طرح کے واقعات میں حضور ﷺ نے مقتولین کے ورثاء کی دلجوئی بھی فرمائی اور ان کو دیت بھی دی گئی۔

(بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

بیان القرآن میں ہے کہ چونکہ یہ ابتداء اسلام تھا۔ اس وقت تک صحابہ کو یہ مسئلہ واضح طور پر معلوم نہ تھا اسلئے ان کو غلط فہمی ہوئی۔ اس پر صرف فہمائش پر اکتفا کیا گیا اور اس فعل پر ان کے لئے کوئی وعید نازل نہیں فرمائی گئی۔

ہر مخلص صاحب ایمان کیلئے اجر ہے

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰىؕ۔۔۔ (النساء۔95)

ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کی راہ میں نکلنے والے اور گھروں میں بیٹھنے والے برابر نہیں تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (نابینا صحابی) نے عرض کیا کہ ہم تو اس سعادت سے محروم ہیں کیونکہ معذور ہونے کی وجہ سے اللہ کی راہ میں نکلنے سے قاصر ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ بغیر عذر کے کا استثناء نازل فرمادیا یعنی عذر کے ساتھ بیٹھ رہنے والوں پر کوئی حرج نہیں اور ان کیلئے بھی نیت کا ثواب موجود ہے۔
حسن نیت کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ نے کسی شاعر کے بڑے خوبصورت اشعار نقل کیے ہیں:

یا راحلین الی البیت العتیق لقد
سرتم جسوما وسرنا نحن ارواحا
انا اقمنا علی عذر وعن قدر
ومن اقام علی عذر فقد راحا

یعنی اے اللہ کے گھر کے حج کو جانے والو! اگرچہ تم اپنے جسموں سمیت اس طرف چل رہے ہو لیکن ہم بھی روحانی طور پر اسی سفر پر جا رہے ہیں۔ سنو! ہماری مجبوری اور عذر نے ہمیں اس مبارک سفر پر جانے سے روک رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ عذر سے رکنے والا، جانے والے سے (اجر میں) کچھ کم بھی نہیں ہوتا۔

گیارھواں رکوع: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ اَنْفُسِهِمْ۔۔۔ (النساء۔97)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

ہجرت کی ضرورت واہمیت، اگر کسی جگہ دین پر عمل ناممکن ہو جائے تو دوسری جگہ ہجرت کر لو (الم تکن ارض اللہ واسعہ)، ہجرت اور حسن نیت، ہجرت کا اجر، ہجرت کی دوسری قسم: گناہوں سے ہجرت یعنی ان کو چھوڑنا۔

اگر کسی جگہ دین پر چلنا ناممکن ہو جائے تو دوسری جگہ ہجرت کرلو

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔۔۔ (النساء۔97)

کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

ہجـــرت کی فضیلت واہمیّت

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِى الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔100)

جو کوئی اللہ کے دین کیلئے گھربار چھوڑے گا وہ زمین میں بہت سی قیام کی جگہیں اور وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے خدا اور سول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے گا اس کے بعد اسے موت بھی آجائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں ہجرت کی فضیلت واہمیت بیان کی گئی، اس کے علاوہ رزق یا جگہوں اور ملکوں کی کشادگی وفراخی کا بھی ذکر ہے۔

ابتداء اسلام میں ہجرت تمام مسلمانوں پر فرض تھی۔ یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت شرط ایمان تھی اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے۔ شرعی ہجرت کا یہ حکم خاص طور پر ابتداء اسلام میں تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور ہجرت کیلئے فرض عین کی صورت باقی نہیں رہی۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت کے احکام بدل گئے ہیں۔ حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے: لا ہجرۃ بعد الفتح ۔۔۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی۔

البتہ بعض انتہائی نامساعد حالات میں اگر کسی جگہ دین کی تعلیمات پر عمل بالکل ناممکن ہو جائے تو ہجرت کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوانین، عالمی معاہدوں، جغرافیائی حدبندیوں اور سفری پابندیوں کی وجہ سے ہجرت کے احکام ومسائل کو دور جدید کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

ہجرت اور حسن نیت لازم وملزوم ہیں۔ اس کی وضاحت اس حدیث میں بیان کی جارہی ہے:

حدیث: ایک حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: انما الاعمال بالنیات، وانمالکل امریء مانویٰ۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہجرت کی پس اس کی ہجرت ان ہی کے لئے ہے اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی نیت سے ہجرت کی پس اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس نیت سے اس نے ہجرت کی۔ (بخاری ومسلم)

نیت کی درستگی کا یہ حکم عام ہے جو دین کے ہر کام کو شامل ہے۔ یعنی اس کو کرتے وقت اللہ کی رضا پیش نظر رکھنا ہوگی ورنہ وہ عمل بارگاہ الٰہی میں مقبول نہ ہوگا۔

ہجرت کا اجر

حدیث: ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الھجرۃ تھدم ماکان قبلھا والحج یھدم ماکان قبلہ۔ یعنی ہجرت ان سب گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔ اسی طرح حج بھی اپنے ماقبل گناہوں کو معاف کروادیتا ہے۔

ہجرت کی دوسری قسم: گناہوں کو ترک کرنا

ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے: لاتنقطع الھجرۃ حتی تنقطع التوبۃ۔ یعنی ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے۔ (صحیح بخاری)

علامہ عینیؒ شارح بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے: ان المراد بالھجرۃ الباقیۃ ھی ھجر السیئات۔ یعنی اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں رسول کریمؐ ارشاد فرماتے ہیں: المھاجرمن ھجر مانھی اللہ عنہ۔ یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے:

1۔ دین کے لئے ترک وطن کرنا، مثلاً صحابہ کرام اپنا وطن مکہ ترک کرکے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔

2۔ گناہوں کا چھوڑنا۔

بارھواں رکوع: وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ۔۔۔ (النساء۔103)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

سفر میں نماز مختصر کرسکتے ہو، صلوٰۃ الخوف، جنگی یا ہنگامی حالت میں نماز کے احکام، نماز کے بعد اللہ کا ذکر، نماز مقررہ وقت پر فرض ہے۔

سفر میں نماز کو قصر کرسکتے ہو

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ۔

اور جب تم سفر پر جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو مختصر کرکے پڑھو۔(النساء۔101)

قصر نماز اللہ کی طرف سے مسافر کیلئے تحفہ ہے

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: صدقة تصدق الله بها عليكم، فاقبلوا صدقته۔

یہ (قصر نماز) اللہ تعالی کا انعام اور احسان ہے اسے قبول کرو۔(مسلم)

قصر نماز کا مطلب یہ ہے کہ مسافر ہر چار رکعت والی فرض نماز دو رکعت پڑھے گا۔ مغرب کی نماز تین رکعت ہی پڑھی جائے گی۔ سنتوں کا حکم دورانِ قصر یہ ہے کہ فجر کی سنتیں بہر حال پڑھنی ہوں گی۔ اس کے علاوہ باقی نمازوں کی مؤکدہ سنتیں نہ پڑھنے کا اختیار ہوگا، البتہ سفر جاری نہ ہو تو پڑھنا افضل ہے۔ وتر کی نماز بھی چونکہ واجب ہے اس لئے سفر میں بھی پڑھی جائے گی۔

صلوٰۃ الخوف یعنی خوف کی حالت کی نماز (النساء۔102)

ہنگامی اور جنگی حالات میں نماز

حالت جنگ میں نماز خوف کی کئی قسمیں، مختلف صورتیں اور حالتیں ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو ورنہ فرداً فرداً ہی سہی قبلہ رخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو، سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو، رکوع وسجدہ ممکن نہ ہو تو اشارہ ہی سے سہی، ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ بعض حالات میں انفرادی طور پر ایک ہی رکعت نماز اشارے سے پڑھنے کا جواز موجود ہے۔ اگر پھر بھی نماز پر قادر نہ ہو تو صرف ایک سجدہ کرلے یہ بھی ذکر اللہ ہے، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ صرف ایک تکبیر بھی کافی ہے۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر

ایسی پر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جاسکے تو نماز کو موخر کی جائے کیونکہ فقہاء نے مخصوص حالات میں نماز کو موخّر کرنے کی رخصت بھی دی ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جنگ خندق میں سورج ڈوب جانے کے بعد ظہر، عصر کی نماز پڑھی تھی۔اس حدیث کی بنیاد پر بعض نے صلوٰۃ الخوف کی آیت (النساء۔102) کو منسوخ بھی قرار دیا ہے۔فقہاء احناف میں امام ابویوسفؒ اس آیت کے حکم کو حضورؐ کے زمانے کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں چونکہ یہ لفظ ہیں: واذا کنت فیھم۔۔ کہ جب آپؐ ان میں موجود ہوں اور یہ خطاب نبی اکرمؐ سے ہے تو معلوم ہوا کہ صلوۃ خوف کا حکم آپؐ کے بعد منسوخ ہے۔اب ایسے حالات میں نماز میں کمی یا تبدیلی کے بجائے نماز کو حالات کے پر سکون ہونے تک موخر کر دیا جائے۔فاذا اطماننتم فاقیمو الصلوٰۃ۔۔۔ جب سکون واطمینان مل جائے تو نماز قائم کرو۔(النساء۔103)۔

مخصوص حالات میں نماز موخر کرنے کے جواز میں ایک اور حدیث بنو قریظہ بھی پیش کی جاتی ہے۔بنو قریظہ کی طرف بھیجے گئے لوگوں کو حضورؐ نے تاکید کی تھی کہ تم میں سے کوئی بھی بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھے۔یہ جماعت ابھی راستے میں ہی تھی تو عصر کا وقت ہو گیا۔ بعض نے کہا حضورؐ کا مقصد اس فرمان سے صرف یہی تھا کہ ہم جلدی بنو قریظہ تک پہنچ کر نماز پڑھیں لہٰذا انہوں نے راستے میں ہی عصر پڑھ لی اور بعض نے عصر کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد بنو قریظہ کی جگہ پہنچ کر ادا کی۔جب اس بات کا ذکر حضورؐ سے ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ دونوں نے درست کیا۔(بحوالہ ابن کثیرؒ)

نماز کو موخر کرنے کا حکم صرف حالت جنگ کے ساتھ خاص نہیں۔ ہر ایسی ہنگامی یا اضطرابی کیفیت جس کی وجہ سے نماز میں توجہ اور یکسوئی حاصل نہ ہو سکے تو ایسی صورتحال میں نماز کو موخر کرنے کی رخصت ہے۔اس کی کئی صورتیں ہیں:

1۔اگر کوئی بندہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں (مثلاً نشہ کے زیر اثر ہے) تو اس وقت اسے نارمل حالت تک واپس آنے تک نماز کو موخر کرنا چاہیئے۔قرآن مجید میں ذکر ہے: لا تقربو الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلمو ما تقولون۔

2۔اسی طرح اگر کسی وقت کسی کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہے مثلاً دوران سفر اگر وہ نماز کیلئے رکتا ہے تو اسے ڈاکوؤں کا خطرہ ہے تو اس وقت بھی وہ نماز کو محفوظ مقام تک پہنچنے تک موخر کر سکتا ہے۔

3۔اسی طرح فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر نیند یا سخت تھکاوٹ کا غلبہ ہو کہ اسے نماز میں توجہ حاصل نہیں ہو سکتی تو اسے بھی وقتی طور پر نماز کو موخر کر دینا چاہیئے۔

4۔اسی طرح اگر کسی کو سخت بھوک لگی ہے اور نماز کا بھی وقت ہے تو اسے پہلے کھانا کھانا چاہئے اور اس کے بعد یکسوئی سے نماز پڑھنی چاہئے۔ قضائے حاجت لاحق تو بھی یہی حکم ہے۔پہلے رفع حاجت کرے اس کے بعد نماز پڑھے۔

5۔جو بندہ طہارت یعنی وضو اور تیمم دونوں پر قادر نہیں جسے فقہی اصطلاح میں فاقد الطھورین کہتے ہیں تو وہ بھی طہارت حاصل ہونے تک نماز کو موخر کر سکتا ہے۔

نماز کے بعد اللہ کا ذکر کرو

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ۔ (النساء۔103)

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔

نماز مقرّرہ وقت پر فرض ہے

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ (النساء۔103)

بے شک نماز اہل ایمان پر پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔النساء۔103

اس میں نماز کو مقررہ وقت میں پڑھنے کی تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر شرعی عذر کے دو نمازوں کو جمع کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح کم از کم ایک نماز غیر وقت میں پڑھی جائے گی جو اس آیت کے خلاف ہے۔

تیرھواں رکوع: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔۔۔ (النساء۔105)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

قرآن کتاب حق ہے، اسلام کی عدل وانصاف کی روایت، بغیر تحقیق کسی کی حمایت یا طرفداری نہ کرو، استغفار اور سچی توبہ، کرپٹ لوگوں کی حمایت اور وکالت نہ کرو (ولا تکن للخائنین خصیما)، خیانت اور دھوکہ دہی اللہ سے نہیں چھپ سکتی، قیامت کے روز کون ان مجرموں کی وکالت کرے گا، توبہ واستغفار کی برکات، سچی توبہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی، گناہگار کا اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اپنی غلطیوں کا الزام دوسروں پر نہ ڈالو۔

کتاب حق

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭوَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا۔(النساء۔105)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔

آیت کا شان نزول: یہ آیت ایک غیر مسلم کے دفاع میں نازل ہوئی۔ یہ آیت بلاشبہ اسلام کے شاندار عدل و انصاف کی روایت کی مظہر ہے۔ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ سب کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے چاہے کوئی مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملہ سے بحث کی گئی ہے جو اسی زمانہ میں پیش آیا تھا۔
اس آیت کے شان نزول میں بتلایا گیا ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ نے ایک انصاری کی زرہ چرالی، جب اس کا چرچہ ہوا اور اسے بے نقاب ہونے کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر پھینک دی اور بنی ظفر کے کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے، ان سب نے آپس میں اتفاق کر کے زرہ چوری کا الزام اس یہودی پر تھوپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی برأت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے رہے اور کہا کہ یہ یہودی جو حق کا انکار اور اللہ کے رسول کا منکر ہے، اس کی بات کا کیا اعتبار، بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی اکرم ؐ اس مقدمہ کی ظاہری روداد سے متاثر ہو کر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرمادیتے اتنے میں وحی آئی اور معاملہ کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔ اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی اکرم ؐ کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اور ایسی صورتیں ججوں اور منصفوں کو پیش آتی رہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط روداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ اسلام کا ابتدائی دور تھا، اگر نبی اکرم ؐ روداد مقدمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرمادیتے تو اسلام کے مخالفوں کو ایک بہت بڑا اخلاقی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ یہاں تو انصاف کا قتل عام ہو رہا ہے، یہاں تو وہی جتھہ بندی اور عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف دعوت و تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدمہ میں مداخلت فرمائی۔
قرآن کریم نے ایک مسلمان کی چوری کھول دی اور ایک غیر مسلم کو بری کر دیا۔
ان رکوعوں میں ایک طرف ان مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنہوں نے محض خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملہ

میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہر گز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر مجرم ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر بے گناہ بھی ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

مندرجہ بالا آیت سے چند نکات معلوم ہوتے ہیں:

1۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ بھی بحیثیت ایک انسان غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں۔

2۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ عالم الغیب نہیں تھے ورنہ آپؐ پر فوراً صورتحال واضح ہو جاتی۔

3۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؑ کی حفاظت فرماتا ہے اور اگر کبھی حق کے پوشیدہ رہ جانے اور اس سے ادھر ادھر ہو جانے کا مرحلہ آجائے تو فوراً اللہ تعالیٰ متنبہ فرما دیتا ہے اور اصلاح فرما دیتا ہے اور یہی عصمت انبیا کا تقاضا ہے۔ یہ وہ مقام عصمت ہے جو انبیاء کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

اس آیت کے شان نزول کے واقعے میں چند لوگوں نے چوری خود کی اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن اپنی چرب زبانی سے ایک بے گناہ غیر مسلم کو چور ثابت کرانے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ کردار اسلام کی عادلانہ تعلیمات کے بالکل برعکس تھا اس لئے اس پر اللہ رب العالمین نے فوری متنبہ فرما دیا۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ جرم اس کیلئے جائز ہے۔ اگر وہ قصوروار ہو گا تو ضرور سزا کا مستحق ہو گا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں بلکہ کہیں بھی کسی غیر مسلم کے ساتھ ناانصافی جائز نہیں۔ اسی طرح مسلمان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مسلمانوں کو ہر صورت دوسرے مسلمان کا ساتھ دینا چاہئے چاہے وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام کا ابدی اصول ہے کہ: کونو قوامین شہداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین۔۔۔ ہمیشہ حق کی گواہی دو چاہے تمہارے اپنے قریبی لوگوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: کونو مع الصادقین۔ سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغیر تحقیق کے کسی کی حمایت نہیں کرنی چاہئے۔ اسی طرح فریقین میں سے جب تک کسی کے متعلق پورا یقین نہ ہو کہ وہ حق پر ہے اس کی حمایت اور طرفداری کرنا جائز نہیں۔ علاوہ ازیں اگر کوئی فریق دھوکے، فریب اور اپنی چرب زبانی سے عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے گا درآں حالیکہ وہ صاحب حق نہ ہو تو ایسے فیصلے کی عند اللہ کوئی اہمیت نہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انما انا بشر وانتم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علیٰ نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشیء من حق اخیہ فلا یاخذنہ فانما اقطع لہ قطعۃً من النار۔

میں ایک انسان ہوں، میرے پاس کوئی شخص مقدمہ لے کر آتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم میں سے وہ شخص دلیل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز ہو اور میں (اس کے دلائل سے متاثر ہو کر) اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ تو اگر میں (غلطی سے) کسی مسلمان کا حق دوسرے شخص کو دے دوں، تو یہ اس کے لیے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے، خواہ وہ اسے اُٹھا کر لے جائے یا اسے چھوڑ دے۔ (بخاری، مسلم)

استغفار اور سچی توبہ کرو

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔106)

اور اللہ سے استغفار کیجئے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

کرپٹ لوگوں کی حمایت نہ کرو

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا۔ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا۔ (النساء۔107۔108)

جو خود اپنی ہی خیانت کرتے ہیں آپ ان کی وکالت نہ کریں۔۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو بد دیانت اور بدکار ہو۔

جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ دل اور دماغ کو جو قوتیں اس کے پاس بطور امانت ہیں وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا ساتھ دیں۔ اور اپنے ضمیر کو جسے اللہ نے اس کے اخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں رکاوٹ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر خیانت کے ان مراحل کو پایہ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

آیت میں فرمایا گیا کہ آپ ایسے کرپٹ اور خیانت کار لوگوں کا ساتھ نہ دو اور ان کی حمایت اور وکالت بھی نہ کرو۔

خیانت اور دھوکہ دہی اللہ سے نہیں چھپ سکتی

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا۔ (النساء۔108)

یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات (خیانت، دھوکہ دہی) چھپاسکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپاسکتے جب کہ وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ رہتا ہے جب وہ ناپسندیدہ باتوں کی سازش کرتے ہیں۔ اِن کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔

قیامت کے روز کون ان مجرموں کی وکالت کرے گا

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَاۗ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔ (النساء۔109)

تم لوگوں نے ان مجرموں کی دنیا میں تو طرفداری اور حمایت کرلی مگر روز قیامت اللہ کے سامنے کون ان کی طرفداری کرے گا اور ان کا وکیل ہو گا۔

Here you are advocating for them in this life, but who will ˹dare to˺ advocate for them before Allah on the Day of Judgment? Or who will come to their defence? (4:109)

توبہ و استغفار کی برکات

وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔110)

جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار (سچی توبہ) کرے تو اللہ کو بخشنے والا، مہربانی کرنے والا پائے گا۔

سچی توبہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی

اللہ تعالیٰ اپنا کرم اور اپنی مہربانی کو بیان فرماتا ہے کہ جس گناہ سے جو کوئی توبہ کرے اللہ اس کی طرف مہربانی سے رجوع کرتا ہے، ہر وہ شخص جو رب کی طرف جھکے رب اپنی مہربانی سے اور اپنی وسعت رحمت سے اسے ڈھانپ لیتا ہے اور اس کے صغیرہ کبیرہ گناہ کو بخشش دیتا ہے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر وہ وضو کرکے دو رکعت نماز ادا کرکے اللہ سے استغفار (سچی توبہ) کرے تو اللہ اس کے اس گناہ کو بخش دیتا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران:135) کی تلاوت کی۔

گناہگار اپنا ہی نقصان کرتا ہے

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔111)

اور جو گناہ کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے اور اللہ بخوبی جاننے والا ہے۔

اس مضمون کی ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لا تزروازرة وزر اخریٰ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، یعنی کوئی کسی کا ذمہ دار نہیں ہو گا، ہر نفس کو وہی کچھ ملے گا جو کما کر ساتھ لے گیا ہو گا۔

اپنی غلطیوں کا الزام دوسروں پر ڈالنے کی مذمت

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــــَٔــةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــــًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (النساء۔112)

اور جو شخص بھی کوئی غلطی یا گناہ کرکے اس کا الزام دوسرے بے گناہ کے سر ڈال دیتا ہے وہ بہت بڑے بہتان اور کھلے گناہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

جس طرح ایک شخص بنو ابیرق نے چوری خود کی اور الزام کسی اور پر لگا دیا۔ ایسی گھٹیا حرکت کا جو بھی مرتکب ہو گا وہ اس آیت کا مصداق ہے۔

اس آیت میں ایک عام ضابطہ ارشاد فرمایا گیا کہ جو شخص خود کوئی جرم کرے اور پھر یہ جرم کسی بے قصور انسان کے ذمہ لگائے (جیسا کہ اس واقعہ میں بنو ابیرق نے چوری خود کی اور الزام ایک غیر مسلم یہودی پر لگا دیا) تو اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لاد لیا۔ اپنے گناہ کا الزام دوسرے پر لگانا دوگنے عذاب کا سبب ہے۔ اور آیت: ومن یکسب خطیئة اواثما ثم یرم بہ۔۔ (النساء۔211) سے معلوم ہوا کہ وہ شخص گناہ خود

کرے اور اس کا الزام دوسرے بے گناہ آدمی پر لگا دے، تو اس نے اپنے گناہ کو دوگنا اور نہایت سخت کر دیا اور عذاب شدید کا مستحق ہو گیا، ایک تو خود اصل گناہ کا عذاب، دوسرے افتراء اور بہتان کا شدید عذاب۔

چودھواں رکوع: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ۔۔۔ (النساء۔113)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

انبیاء کرامؑ کیلئے اللہ کا خاص فضل: معصوم عن السیّات، خاص حفاظت و نگرانی، ہمیشہ اچھے کاموں کیلئے مشورہ اور میٹنگ کرو نہ کہ سازشوں کیلئے، اصلاح ذات البین یعنی صلح وصفائی کی اہمیت، رسولؐ کی مخالفت کا وبال۔

انبیاءؑ کیلئے اللہ کا خاص فضل

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَىْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔(النساء۔113)

اے نبیؐ! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالاں کہ در حقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی اس خاص حفاظت و نگرانی کا ذکر ہے جس کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے فرمایا ہے۔ یہ عصمت انبیاء انبیاءؑ کا گناہوں سے معصوم ہونا اللہ کے فضل خاص اور اس کی رحمت خاصہ کا مظہر ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ لوگ غلط استغاثہ اور جھوٹا مقدمہ پیش کر کے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں فیصلہ حاصل کر بھی لیتے تو نقصان انہی کا تھا، تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مجاز اتھارٹی یا عدالت کو دھوکہ دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرا لیتا ہے وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ حق پر ہے حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ جج کے فیصلہ سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ۔۔۔(النساء۔113)

اور آپ کو ان باتوں کا علم دیا ہے جن کا آپ کو پہلے علم نہ تھا۔

اللہ نے آپ ﷺ پر فضل واحسان فرمایا اور کتاب وحکمت بھی عطا فرمائی۔ ان کے علاوہ دیگر بہت سی باتوں کا آپؐ کو علم دیا گیا جن سے آپ پہلے بے خبر تھے یہ بھی گویا آپ کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہے کیونکہ جو خود عالم الغیب ہو اسے تو کسی اور سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جسے دوسرے سے معلومات حاصل ہوں وحی کے ذریعے سے یا کسی اور طریقے سے وہ عالم الغیب نہیں ہوتا۔

ہمیشہ اچھے کاموں کا مشورہ کیا کرو

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَن يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔114)

لوگوں کی زیادہ تر سرگوشیوں میں کوئی خیر وبھلائی نہیں ہے سوا اس کے کہ کوئی صدقہ دینے، نیکی کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی بات کرے اور جو شخص خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ایسا کرے ہم اسے اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

اصلاح ذات البین یعنی باہمی صلح صفائی کی اہمیت

اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ:

اس آیت میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی:

1۔ صدقہ وخیرات،

2۔ بھلائی کی باتوں کی ترویج واشاعت

3۔ اصلاح ذات البین یعنی لوگوں کے درمیان صلح کرانا

ان تین باتوں کی احادیث میں بھی بڑی فضیلت آئی ہے۔

معروف کے معنی ہیں ہر وہ کام جو دین میں اچھا سمجھا جائے اور اس کے مقابل منکر ہے، یعنی ہر وہ کام جو دین میں ناپسندیدہ اور اجنبی ہو۔ امر بالمعروف، ہر نیکی کے حکم اور ترغیب کو شامل ہے، جس میں مظلوم کی امداد کرنا، حاجتمندوں کو قرض دینا، گم شدہ کو راستہ بتادینا وغیرہ سب نیک کام داخل ہیں اور صدقہ اور اصلاح بین الناس بھی اگرچہ اس میں داخل ہے، لیکن ان کو خاص اس لئے بیان کیا گیا کہ ان دونوں چیزوں کا فائدہ دوسرے انسانوں کو ہوتا ہے اور

معاشرتی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ نیز یہ دونوں کام خدمت خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں، ایک فائدہ پہنچانا یعنی اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانا، دوسرے دفع مضرت یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا۔ صدقہ نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اور اصلاح بین الناس خلق اللہ کے مضرت اور نقصان سے بچانے کا اہم عنوان ہے، اس لئے جمہور علماء تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوۃ، صدقات واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے۔

صلح کرانے کی فضیلت

لوگوں کی باہمی رنجشیں دور کرنے اور ان کے آپس میں مصالحت و موافقت پیدا کرنے کے متعلق رسول کریم ﷺ کے ارشادات نہایت اہم ہیں۔ ایک حدیث میں اسے نفلی روزوں، نفلی نمازوں اور نفلی صدقات و خیرات سے بھی افضل بتلایا گیا ہے:

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ألا أخبركم بأفضل من درجة الصلاة والصيام والصدقة ؟ قالوا بلى، قال إصلاح ذات البين وفساد ذات البين هي الحالقة۔

کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتاؤں جو درجے میں (نفلی) نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل ہے؟ صحابہ نے عرض کی کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لڑنے والوں کے درمیان صلح کروادینا۔۔ (ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد)

یہاں تک کہ صلح کرانے والے کو جھوٹ تک بولنے کی اجازت دے دی گئی تا کہ اسے ایک دوسرے کو قریب لانے کے لئے اور فتنہ و فساد اور لڑائی جھگڑا سے بچانے کیلئے دروغ مصلحت کی ضرورت پڑے تو وہ اس حربہ کو بھی اختیار کر سکتا ہے:

حدیث: ليس الكذاب الذى يصلح بين الناس، فينمى خيرا و يقول خيرا۔ (بخاری)

وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے اچھی بات پھیلاتا ہے اور اچھی بات کرتا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کی عیادت کے لئے کچھ لوگ گئے۔ ان میں سعید بن حسان بھی تھے تو آپ فرماتے ہیں اے سعید! تم نے ام صالح کی روایت سے جو حدیث بیان کی تھی آج اسے پھر سناؤ۔ آپ سند بیان کرکے فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا: انسان کی تمام باتیں قابل مواخذہ ہیں بجز اللہ کے ذکر اور اچھے کاموں کے بتانے اور برے کاموں سے روکنے کے۔ حضرت سفیان نے کہا یہی مضمون اس آیت میں ہے: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (النباء۔38) میں ہے۔ یہی مضمون سورۃ العصر میں ہے۔

آیت کے آخر میں ایک اور اہم مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ نیکیاں صدقہ اور امر بالمعروف اور اصلاح بین الناس اسی وقت معتبر اور مقبول ہوسکتی ہیں، جبکہ ان کو اخلاص کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے، اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

رسول کی مخالفت کا وبال

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَـهُ الْهُدٰى وَ يَـتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (النساء۔115)

اور جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے ہم اُسے (دنیا میں) اُس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے (آخرت میں) دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

جب مذکورہ بالا مقدمہ میں وحی الٰہی کی بنا پر نبی ﷺ نے اس خائن مسلمان کے خلاف اور اس بے گناہ یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمادیا تو اس نام نہاد مسلمان پر جاہلیت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبیؐ کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کھلم کھلا مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور امت کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی، دین اسلام سے خروج ہے جس پر یہاں جہنم کی وعید بیان فرمائی ہے۔ مومنین سے مراد صحابہ کرام ہیں جو دین اسلام کے اولین پیرو اور اس کی تعلیمات کا کامل نمونہ تھے۔ اس آیت کی بنیاد پر امت مسلمہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام میں اجماع صحابہ حجت ہے۔ اس لئے صحابہ کرام کے راستے اور منہاج سے انحراف بھی دین سلام سے انحراف ہی ہے۔

بعض مفسرین نے سبیل المومنین سے مراد اجماع امت لیا ہے یعنی اجماع امت سے انحراف بھی دراصل دین اسلام سے انحراف ہے۔ اجماع امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علماء وفقہا کا اتفاق یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتفاق یہ دونوں صورتیں اجماع امت کی ہیں اور دونوں کا انکار یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کا مطلب دائرہ اسلام سے اخراج ہے۔ تاہم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے۔ لیکن اجماع صحابہ کے بعد کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع واتفاق کے دعوے تو بہت سے مسائل میں کئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت ایسے اجماعی مسائل بہت ہی کم ہیں۔ جن میں فی الواقع امت کے تمام علماء وفقہا کا اتفاق ہو۔ تاہم ایسے جو مسائل بھی ہیں، ان کا انکار بھی ناجائز ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔(ترمذی)

پندرہواں رکوع: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔۔۔ (النساء۔115)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

شرک: اکبر اکبائر، شیطان کی عبادت کا مطلب، وقت اور مال میں شیطان کا حصہ، شیطانی عزائم اور ارادے، اللہ کی تخلیق کو بدلنا، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی سے کونسی چیزیں مراد ہیں، شیطانی دھوکہ، جہنم کا ٹھکانہ، اخروی کامیابی کی شرائط: ایمان اور عمل صالح، برے کاموں کا انجام، مرد و عورت دونوں کا اجر برابر، کامیابی کا معیار اور نمونہ، کائنات کی مالک ہستی۔

شرک: اکبر الکبائر

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ (النساء۔115)

بیشک اللہ اس گناہ کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جو (گناہ) اس سے نیچے ہے جس کے لئے چاہے معاف فرما دیتا ہے، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ واقعی دور کی گمراہی میں بھٹک گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے قرآن کی کوئی آیت مجھے اس آیت سے زیادہ محبوب نہیں۔(ترمذی)

حدیث: رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے:

سب سے زیادہ سچی بات اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہتر ہدایت محمدؐ کی ہدایت ہے اور تمام کاموں میں سب سے برا کام دین میں نئی بات نکالنا ہے اور ہر ایسی نئی بات کا نام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا۔ (النساء۔116)

وہ اللہ کو چھوڑ کر نسوانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور اُس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں۔

اِنٰثًا سے یہاں مراد یا تو وہ بت ہیں جن کے نام مؤنث تھے جیسے لات، عزیٰ، مناۃ، نائلہ وغیرہ یا مراد فرشتے ہیں کیونکہ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اس کے بعد فرمایا گیا کہ وہ شیطان کی بھی

عبادت کرتے ہیں۔ غیر اللہ مثلاً بتوں، فرشتوں اور دیگر ہستیوں کی عبادت دراصل شیطان کی عبادت ہے۔ کیونکہ شیطان ہی انسان کو اللہ کے در سے چھڑا کر دوسروں کے آستانوں اور چوکھٹوں پر جھکاتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

شیطان کی عبادت کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے راستے پر چلنا اور ہر معاملے میں شیطان کی بات ماننا دراصل شیطان کی عبادت کی طرح ہی ہے۔ شیطان کو اس معنی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے کھڑا ہو کر اس کی عبادت اور پرستش ادا کرتا ہو یا اس کو الوہیت کا درجہ دیتا ہو، البتہ اسے معبود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں اور اپنا کنٹرول شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اور جدھر جدھر وہ چلاتا ہے ادھر ادھر چلتا ہے گویا کہ یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا خدا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی عبادت ہے اور جو شخص اس طرح کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔

وقت اور مال میں شیطان کا حصہ

وَقَالَ لَاَ تَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔ (النساء۔118)

شیطان نے اللہ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے (ان کے مال اور وقت میں) ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔

یعنی شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس مکروہ عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ انسانوں کے اوقات میں ان کی محنتوں اور کوششوں میں، ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں ان کے مال میں سے اپنا حصہ لے کر رہے گا اور ان کو فریب دے کر ایسا اپنے پیچھے چلائے گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک حصہ شیطان کے راستے میں یعنی گناہ کے کاموں میں صرف کریں گے۔

مزید شیطانی عزائم

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا۔ (النساء۔119)

میں انہیں بہکاؤں گا، میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا، میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے۔ جس نے اللہ کے بجائے شیطان کو اپنا ولی و سرپرست بنالیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔

یہ وہ باطل امیدیں ہیں جو شیطان کے وسوسوں اور دخل اندازی سے پیدا ہوتی اور انسانوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ یہ بحیرہ اور سائبہ جانوروں کی علامتیں اور صورتیں ہیں۔ عرب لوگ ان کو بتوں کے نام وقف کرتے تو شناخت کے لئے ان کا کان وغیرہ چیر دیا کرتے تھے۔

اللہ کی تخلیق بدلنا

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔۔۔ (النساء۔119)

وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلیاں کریں گے۔۔۔

اللہ کی تخلیق میں تبدیلی سے کیا مراد ہے؟

اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کے کئی مطلب مفسرین نے بیان کئے ہیں:

پہلا مطلب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت میں تغییر سے اللہ کے دین میں تبدیلی مراد ہے۔ اس قول کی وضاحت یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام قرار دینا یا اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے امور و اشیاء کو حلال بنادینا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا ہے یعنی اللہ نے فطرتاً انسان کو جس دین پر پیدا کیا ہے اس سے ہٹانا اللہ کی تخلیق میں تبدیلی ہے۔ زجاج کہتے ہیں: یہ آیت اپنے عموم پر نہیں بلکہ ایک خاص تناظر میں نازل ہوئی ہے لہٰذا اس میں وہی چیزیں شامل ہیں جو نزول قرآن کے وقت لوگ کرتے تھے یعنی غیر اللہ کے نام پر کان وغیرہ کاٹنا یا چیرنا۔ اس کے علاوہ اور کئی صورتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج، پتھر اور آگ وغیرہ اشیاء مختلف مقاصد کے لئے بنائی ہیں، لیکن ان کے مقصد تخلیق کو بدل کر ان کو معبود بنالینا اللہ کی تخلیق کو بدلنے کی طرح ہے۔ اس آیت میں اصل موضوعِ بحث شرک اور شرک سے جڑے افعال کی ممانعت اور مذمت ہے۔

دوسرا مطلب:

تخلیق خدا میں تبدیلی کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے، جس کے لیے اللہ نے اسے پیدا نہیں کیا اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس آیت کی رو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات مثلاً ہم جنس پرستی، جنس تبدیل کرنا، رہبانیت، مردوں اور عورتوں کو بلاوجہ بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے

بے شمار افعال جو دنیا میں ہو رہے ہیں دراصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ ان کے کرنے والے لوگ خالق کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں

تیسرا مطلب:

تیسرا قول یہ ہے کہ خدائی ساخت میں ردوبدل کرنے کی مطلق ممانعت نہیں ہے صرف مخصوص جسمانی تصرفات ممنوع ہیں۔ تغیْرُ خَلقِ اللہ یعنی اللہ کی تخلیق کو بدلنا کی کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس سے مراد تغیر فطرت بھی ہے۔ اسی وجہ سے جین ایڈیٹنگ یا کلوننگ کو فقہاء نے ممنوع قرار دیا۔ البتہ یہ ممانعت صرف انسانوں یا جانوروں میں ہے نباتات یا پودوں میں نہیں۔ قلمی پھل یا سبزیاں پیدا کرنا بظاہر تخلیق خدا میں تبدیلی ہے مگر بالاتفاق اس کی مکمل اجازت ہے۔

البتہ اگر کسی انسان میں ایسی جسمانی تبدیلی کی ضرورت ہے جو شرعی یا طبی نقطہ نظر سے یا بحیثیت انسان ایک نارمل زندگی گذارنے کیلئے ضروری ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً ختنہ کرنا، ناخن کاٹنا ایک جسمانی تبدیلی ہے مگر مسنون اعمال ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی کٹے ہونٹ کے ساتھ پیدا ہوا تو آپریشن کر کے اس کا علاج کر دینا بالکل جائز اور درست عمل ہے۔ اسی طرح کسی جسمانی عیب کی اصلاح کیلئے سرجری کرانا بھی اس سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن کے اندر فرمایا گیا کہ: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔۔ ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت کے ساتھ پیدا کیا۔ (سورۃ التین) کسی وجہ سے چہرہ یا جلد جل گئی تو اس کی پلاسٹک سرجری کر کے اس کو نارمل حالت پر واپس لانا بھی درست ہے۔ البتہ بلا خاص وجہ محض زیادہ خوبصورت نظر آنے کیلئے پلاسٹک سرجری سے اجتناب کرنا چاہئے۔ بعض احادیث میں بعض جمالیاتی تصرفات کی ممانعت کی گئی ہے مثلاً بالوں میں دوسرے بال لگوانا (وصل)، جسم کو گودنا یا گدوانا (وشم)، ابروؤں کو باریک کروانا (نمص) دانتوں کے درمیان فاصلہ کروانا (تفلیج) کی ممانعت آئی ہے۔ البتہ اگر کوئی جسمانی تصرف طبی ضرورت کیلئے کیا جائے مثلاً دانتوں کی صحت کیلئے، یا جلد کی صحت کیلئے مثلاً سکن ٹیگ کو ختم کرنا وغیرہ تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جسمانی ساخت میں ہر تبدیلی ممنوع نہیں ہے۔

شیطانی دھوکہ

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ (النساء۔120)

وہ (شیطان) ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہے گا، اور سبز باغ دکھاتا رہے گا، (مگر یاد رکھو!) شیطان کے جو وعدے ہیں وہ سراسر فریب کاریاں ہیں۔

شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور امیدوں کے بل پر چلتا ہے۔ وہ انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جب کسی غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو اس کے آگے سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لطف و لذت اور کامیابیوں کی امید، کسی کو دنیاوی کامیابی اور سربلندی کی توقع، کسی کو فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت، بس مر کر مٹی ہو جانا ہے، کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلو گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔

جہنم کا ٹھکانہ

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا۔ (النساء۔121)

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔

ایمان اور عمل صالح

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ (النساء۔122)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ہم جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہو گا۔

اخروی کامیابی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے: ایک ایمان اور دوسرا نیک اعمال۔

آیت کے دوسرے حصے میں یہ حقیقت بتائی گئی کہ شیطانی وعدے تو سراسر دھوکا اور فریب ہیں لیکن اس کے مقابلے میں اللہ کے وعدے جو اس نے اہل ایمان سے کئے ہیں سچے اور برحق ہیں اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ سچوں کی بات کو کم مانتا ہے اور جھوٹوں کے پیچھے زیادہ چلتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ شیطانی چیزوں کا چلن عام ہے اور ربانی کاموں کو اختیار کرنے والے ہر دور میں اور ہر جگہ کم ہی رہے ہیں اور کم ہی ہیں۔

برے کاموں کا انجام

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ (النساء۔123)

(اخروی نجات) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو شخص برائی کرے گا خود ہی اس کی سزا پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا۔

آیت میں اہل کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی خطاب فرمایا ہے کہ وہ بھی یہود و نصاریٰ کی سی غلط فہمیوں، خوش فہمیوں اور عمل سے خالی آرزؤں اور تمناؤں سے اپنا دامن بچا کر رکھیں۔

یہ آیت ایک لحہ فکریہ ہے کہ محض دعوؤں اور تمناؤں میں نہ لگیں، بلکہ عمل کی فکر کریں کیونکہ کامیابی صرف اس سے نہیں کہ تم فلاں نبی یا فلاں کتاب کے نام لینے والے ہو، بلکہ اصل فلاح اس میں ہے کہ اس پر صحیح ایمان اور اس کے مطابق اعمال صالح کے پابند رہو۔ لیکن افسوس مسلمان اس تنبیہ کے باوجود انہی خام خیالیوں میں مبتلا ہو گئے جن میں سابقہ امتیں گرفتار ہوئیں تھیں۔ اور آج بے عملی اور بدعملی مسلمانوں کا شعار بنی ہوئی ہے۔ اہل کتاب اپنے متعلق بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خوش فہمیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ آخرت کی کامیابی محض امیدوں پر اور آرزؤں سے نہیں ملے گی اس کے لئے تو ایمان اور عمل صالح کی پونجی ضروری ہے۔ اگر اس کے برعکس نامہ اعمال میں برائیاں ہوں گی تو اسے ہر صورت میں اس کی سزا بھگتنی ہوگی، وہاں کوئی ایسا دوست یا مددگار نہیں ہوگا جو برائی کی سزا سے بچا سکے۔

مرد اور عورت دونوں کا اجر برابر

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔ (النساء۔124)

اور جو کوئی اچھے کام کرے گا چاہے مرد ہے یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال کی قبولیت کا ایک ہی معیار ہے اور وہ مرد و عورت کیلئے برابر ہے۔

کامیابی کا معیار اور نمونہ

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭوَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا۔ (النساء۔125)

اُس شخص سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور نیکو کار بھی ہو اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا۔

یعنی اس شخص سے بہتر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا جس میں دو باتیں پائی جائیں:

1۔ ایک اسلم وجھہ للہ یعنی اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دے۔ ریاکاری یا دنیا سازی کے لئے نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے عمل کرے۔

2۔ دوسرے وھو محسن یعنی وہ عمل بھی درست طریقہ پر کرے۔ امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ درست طریقہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل خود ساختہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں ایک اخلاص اور دوسرے سنت رسولؐ کے مطابق ہو۔ ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط اخلاص کا تعلق انسان کے باطن یعنی قلب سے ہے اور دوسری شرط یعنی موافقت سنت کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے، جب یہ دونوں شرطیں کسی شخص نے پوری کر لیں تو اس کا ظاہر و باطن درست ہو گیا اور جب ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوئی تو عمل فاسد ہو گیا، اخلاص نہ رہنے کی وجہ سے وہ عمل اللہ کے ہاں نامقبول ہو گیا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے بار بار حسن عمل یعنی اتباع سنت کی تاکید فرمائی۔ سورۃ ملک میں ہے: لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ یہاں پر احسن عملاً فرمایا اکثر عملاً نہیں فرمایا، یعنی کثرت عمل کا ذکر نہیں، بلکہ اچھا عمل کرنے کا ذکر ہے، اور اچھا عمل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں کامیابی کا ایک معیار اور اس کا ایک نمونہ بیان کیا جا رہا ہے۔ معیار یہ ہے کہ اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے محسن بن جائے اور ملت ابراہیمیؑ کی پیروی کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا۔ خلیل کے معنی ہیں کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اس طرح راسخ ہو جائے کہ کسی اور کے لئے اس میں جگہ نہ رہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے مجھے بھی اپنا خلیل بنایا ہے جس طرح اس نے ابراہیمؑ کو خلیل بنایا۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد)

کائنات کی مالک ہستی

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطًا۔ (النساء۔126)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے۔

سولھواں رکوع: وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَآءِ۔۔۔ (النساء۔127)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

یتیم خواتین اور بچوں کے بعض احکامات، تمہاری بھلائیاں اللہ کے علم میں ہیں، ازدواجی زندگی سے متعلق چند قرانی ہدایات، میاں بیوی میں صلح و خیر کا اصول (والصّلح خیر)، صلح کی بنیاد پر مسائل کا حل اور معاملات کی سیٹلمنٹ، ازدواجی حقوق میں عدل و انصاف، بعض دفعہ علیحدگی اور طلاق میں بھی خیر اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ کائنات کے خزانوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، سب کی نگہبانی کیلئے اللہ ہی کافی ہے، دین کا کام تمہارا محتاج نہیں، اللہ یہ خدمت کسی اور سے بھی لے سکتا ہے، دنیا و آخرت کا اجر۔

یتیم خواتین اور بچوں کے بعض احکامات

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَآءِؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا۔۔ (النساء۔127)

یہ لوگ آپ سے یتیم لڑکیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرمادیں کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور جو حکم تم کو (پہلے سے) کتابِ مجید میں سنایا جارہا ہے (وہ بھی) ان یتیم عورتوں ہی کے بارے میں ہے جنہیں تم وہ (حقوق) نہیں دیتے جو ان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور چاہتے ہو کہ (ان کا مال قبضے میں لینے کی خاطر) ان کے ساتھ

خود نکاح کر لو اور نیز بے بس بچوں کے بارے میں (بھی حکم) ہے کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہا کرو، اور تم جو بھلائی بھی کرو گے تو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اسی سورۃ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دور کوعوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی تھی مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کے ذکر سے پہلے یتیموں کے حقوق کا اعادہ کیا گیا۔

اس آیت (النساء۔127) میں مال کے لالچ میں یتیم بچیوں کو شادی سے روکنے کی مذمت بیان کی جا رہی ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پرورش میں کوئی مالدار یتیم بچی ہو اب یہ شخص مال کے لالچ میں چاہتا ہو کہ اس یتیم سے میں خود ہی نکاح کر لوں۔ اس بنا پر اس کو دوسری جگہ شادی کرنے سے روکتا ہے ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔ (بحوالہ بخاری شریف)

تمہاری بھلائیاں اللہ کے علم میں ہیں

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا۔ (النساء۔127)

تم جو نیک کام کرو، بے شبہ اللہ اسے پوری طرح جاننے والا ہے۔

ازدواجی زندگی سے متعلق چند قرآنی ہدایات

میاں بیوی میں صلح و خیر کا اصول

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ: صلح بہتر ہے

صلح کی بنیاد پر معاملات کی سیٹلمنٹ

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (النساء۔128)

جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے حقوق ادا نہ کرنے یا بے پرواہی کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے نفس تنگ دلی کے طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا۔

سورۃ نساء کی ابتدائی آیات میں حقوق الزوجین کے ضمن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی مگر اس کے ساتھ عدل یعنی مساویانہ برتاؤ کو شرط قرار دیا گیا۔ اگر کوئی آدمی اس معاملے میں عدل نہ کر سکے تو اس کو ایک ہی بیوی رکھنے کی تاکید کی گئی۔

اب تعدد ازواج کی صورت میں اگر کسی شخص کی ایک بیوی دائم المرض ہے، عمر رسیدہ ہے یا بوجوہ ازدواجی تعلقات کے قابل نہیں رہی تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلق میں بھی یکساں برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا یہ عدل کے خلاف ہو گا؟ کیا وہ بوڑھی یا بیمار بیوی کو طلاق دے کر بے سہارا کر دے صرف اس بنیاد پر کہ وہ عدل نہیں کر سکتا؟ کیا ایسا کرنا عدل ہو گا یا عدل کے خلاف ہو گا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں میاں بیوی آپس میں جن شرائط پر رضامند ہو جائیں وہ جائز ہے۔ (ابن کثیرؒ)

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ: صلح بہتر ہے کا ایک معنی تو یہ بیان کیا گیا کہ میاں بیوی ناچاقی کی صورت میں کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر آپس میں سیٹلمنٹ کر لیں اور آپس میں مل کر رہیں تا کہ ناموافقت کی صورت میں بھی طلاق کی نوبت نہ آئے۔ یہ صورت طلاق دینے اور لینے سے بہتر ہے۔ چونکہ صلح انتشار سے بہتر ہے اس لئے یہاں فرمادیا کہ صلح خیر ہے۔

حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق۔ تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

حدیث: ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ عورتوں کے درمیان مساوات رکھتے تھے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرماتے تھے الٰہی یہ وہ تقسیم ہے جو میرے بس میں تھی اب جو چیز میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی میلان اس میں تو مجھے ملامت نہ کرنا۔ (ابو داؤد)

آیت کے آخری حصہ میں مردوں کو فرمایا گیا: وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ یعنی تمہارا احسان اور تقویٰ اختیار کرنا یعنی عورت کی طرف سے ناراضگی سے درگذر کرنا اور باوجود ناپسندیدگی کے بیوی کو پورا حق دینا یہ بہترین فعل ہے جسے اللہ بخوبی جانتا ہے اور جس پر وہ تمہیں بہت اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ اگر صلح کی تمام کوششیں رائیگاں چلی جائیں اور طلاق کی نوبت آ ہی جائے اور دونوں الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ایک کو دوسرے سے بے نیاز کر دے گا۔ ہو سکتا ہے بیوی کو پہلے سے اچھا شوہر مل جائے، اسی طرح ممکن ہے کہ شوہر کو پہلے سے بہتر بیوی مل جائے۔ اللہ کا فضل بہت وسیع ہے، وہ بڑے احسان والا ہے، ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے، اس کے تمام افعال، ساری تقدیریں حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔

ازدواجی حقوق میں عدل وانصاف

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭوَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔129)

اور تم کتنا ہی کیوں نہ چاہو عورتوں کے درمیان مکمل انصاف نہیں کر سکتے ہو لہٰذا بالکل ایک طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو۔ اور اگر اصلاح کر لو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو دلی تعلق اور محبت میں وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محبت، فعل قلب ہے جس پر کسی کو اختیار نہیں۔ خواہش کے باوجود انصاف نہ کرنے سے مطلب یہی قلبی میلان ہے اگر یہ قلبی محبت ظاہری حقوق کی مساوات میں مانع نہ بنے تو عند اللہ قابل مؤاخذہ نہیں۔ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا نہایت عمدہ نمونہ پیش فرمایا۔ لیکن عام طور پر لوگ اس قلبی محبت کی وجہ سے دوسری بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔ اپنی محبوب بیوی کی طرف مکمل میلان رکھ کر دوسری بیویوں کے حقوق ادا نہیں کرتے اور انہیں معلقہ اور بے آسرا بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں، نہ انہیں طلاق دیتے ہیں نہ حقوق زوجیت ادا کرتے ہیں۔ یہ انتہائی ظلم ہے جس سے اس آیت میں روکا گیا ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے بھی فرمایا: جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف ہی مائل ہو (یعنی دوسری کو نظر انداز کئے رکھے) تو قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا آدھا حصہ ساقط یعنی فالج زدہ ہو گا۔ (ترمذی)

بعض دفعہ طلاق اور جدائی میں بھی خیر اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕوَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔130)

اور اگر میاں بیوی (میں موافقت نہ ہو سکے اور) ایک دوسرے سے جدا ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو دوسرے سے بے نیاز کر دے گا اور اللہ وسعت کرنے والا حکمت والا ہے۔

یہ آخری آپشن ہے کہ کوشش کے باوجود اگر میاں بیوی میں مصالحت کی کوئی صورت نہ بنے تو پھر طلاق کے ذریعے علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ ممکن ہے علیحدگی کے بعد مرد کو مطلوبہ صفات والی بیوی اور عورت کو مطلوبہ صفات والا مرد مل جائے۔

اسلام میں اگرچہ طلاق کو سخت ناپسند کیا گیا ہے، طلاق حلال تو ہے لیکن یہ ایسا حلال ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اس کے باوجود اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اس لئے کہ بعض دفعہ حالات ایسے موڑ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور فریقین کی بہتری اسی میں ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ مذکورہ حدیث (ابغض الحلال الی اللہ الطّلاق) صحت اسناد کے اعتبار سے اگرچہ ضعف ہے تاہم قرآن وسنت کی نصوص سے یہ واضح ہے کہ طلاق (یا خلع، فسخ نکاح) کا حق بطور آخری آپشن ہی استعمال کرنا چاہیے جب نباہ کی کوئی صورت کسی طرح بھی نہ بن سکے۔

کائنات کے خزانوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕوَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕوَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا۔ (النساء۔131)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان وزمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز اور قابل حمد وثناء ہے۔

سب کی نگہبانی کیلئے اللہ ہی کافی ہے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (النساء۔132)

اور وہ سب کی نگرانی اور کفالت کے لئے کافی ہے۔

دین کا کام تمہارا محتاج نہیں

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا۔ (النساء۔133)

لوگو! اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور (تمہاری جگہ) اور لوگوں کو پیدا کر دے۔ اور خدا اس بات پر قادر ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ وکاملہ کا اظہار ہے جب کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔ (سورۃ محمد:38) اگر تم پھرو گے تو وہ تمہاری جگہ اوروں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہونگے۔

دنیا و آخرت کا اجر

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا۔ (النساء۔134)

جو کوئی دنیا کا انعام چاہتا ہے تو اللہ کے پاس دنیا و آخرت (دونوں) کا انعام ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

یہ قرآنی اسلوب ہے کہ شرعی احکام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ چند واعظانہ جملے ضرور ارشاد فرماتا ہے اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اس رکوع میں چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہل ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں۔

1۔ ایک یہ کہ تم کبھی غلط فہمی میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم کسی عورت یا یتیم کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لوگے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا، ہرگز نہیں، تمہاری، ان کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالک زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

2۔ دوسرے یہ کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی

کروگے تو پچھلی تمام امتوں نے نافرمانیاں کرکے رب کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اس مالک کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمہاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کروگے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کردے گا اور تمہارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

3۔ تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چندروزہ فائدوں ہی پر راضی ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا یہ کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ لہٰذا اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصہ میں آئیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا۔ (النساء۔134)

اللہ سمیع و بصیر ہے۔ یعنی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی لاپرواہ بادشاہ کی طرح کام کرے اور اپنی عطاء و بخشش میں بھلے اور برے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پوری باخبری کے ساتھ اپنی اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور ہر ایک کی نیت پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کرکے ان بخششوں کی امید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداری ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

اس آیت کا درس یہی ہے کہ جیسے کوئی شخص دین کا کام صرف دنیاوی فائدے کیلئے کرے تو کتنی نادانی کی بات ہے۔ جب اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں کا ثواب عطا فرمانے پر قادر ہے تو پھر اس سے ایک ہی چیز کیوں طلب کی جائے؟ انسان دونوں ہی کا طالب کیوں نہ بنے۔

سترہواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔۔ (النساء۔135)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

عدل وانصاف کے علمبردار بنو، عدل وانصاف کی گواہی، گواہی میں ہیر پھیر نہ کرو، ایمان کی تکمیل مکمل اطاعت میں مضمر ہے، ایمان لانے کے دو مطلب، ایمان کوئی مذاق نہیں کہ جب چاہا مان لیا، جب چاہا انکار کر دیا، صحبت بد سے بچو۔

عدل وانصاف کی گواہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (النساء۔135)

اے ایمان والو! عدل انصاف پر قائم رہو خدا کے واسطے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ وہ (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) چاہے امیر ہو چاہے فقیر ہو بہر حال اللہ ان دونوں کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔ اگر تم گواہی میں کج بیانی یا ہیر پھیر کرو گے یا (گواہی سے) بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

اس آیت میں یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا بھی ہے۔ تمہیں اس بات پر کوششوں اور صلاحیتوں کو صرف کرنا چاہیے تاکہ عدل وانصاف کا بول بالا ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

اس آیت میں عدل وانصاف کی تاکید اور اس کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے ان کا اہتمام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عدل وانصاف قائم کرنے اور حق کے مطابق گواہی دینے کی تاکید فرما رہا ہے چاہے اس کی وجہ سے انہیں یا ان کے والدین اور رشتہ داروں کو نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ اسی طرح خواہشات نفس، عصبیت یا بغض تمہیں انصاف کرنے سے نہ روک دے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ (المائدہ:8)۔ شہادت یعنی گواہی میں ہیر پھیر نہ کرو۔ اسی طرح گواہی کو مت چھپاؤ۔ قیام عدل میں تم ایک دوسرے کے معاون اور دست بازو بنو۔ صرف اللہ کی رضا تمہارے پیش نظر ہو، کیونکہ اس صورت میں تم تحریف، تبدیل اور کتمان سے گریز کرو گے اور تمہارا فیصلہ عدل کی میزان میں پورا اترے گا۔ عدل وانصاف کی زد اگر تم پر یا تمہارے والدین پر یا دیگر قریبی رشتے داروں پر بھی پڑے تب بھی تم پرواہ مت کرو اور اپنی اور ان کی رعایت کے مقابلے میں عدل کے

تقاضوں کو اہمیت دو۔ عدل و انصاف میں امیر غریب کا فرق بھی مت کرو۔ فیصلے میں خواہش نفس، عصبیت اور دشمنی آڑے نہیں آنی چاہئے۔ بلکہ ان کو نظر انداز کر کے بے لاگ عدل کرو۔ عدل و انصاف کا یہ اہتمام جس معاشرے میں ہو گا، وہاں امن و سکون اور اللہ کی طرف سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو گا۔

ایمان کی تکمیل مکمل اطاعت میں مضمر ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ (النساء۔136)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسولؐ پر اتاری ہے اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل فرمائی گئی ہیں، ایمان لاؤ! جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے اور قیامت کے دن سے انکار کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

ایمان والوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ایمان میں پورے پورے داخل ہو جائیں۔

ایمان لانے کے دو مطلب

ایمان لانے والوں سے کہنا کہ ایمان لاؤ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن در اصل یہاں لفظ ایمان دو الگ معانی میں استعمال ہوا ہے۔

ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔

ایمان لانے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اسے سچے دل سے مانے۔ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنی پسند کو، اپنے رویے اور چلن کو، اپنی سعی و جہد کے مصرف کو، اپنے کردار کو بالکل اس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب ان تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے بھی سچے مومن بنیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۃ الفاتحہ میں ہدایت یافتہ لوگوں کو دعا سکھلائی گئی: اھدنا الصراط المستقیم۔ اس سے مراد ہدایت پر ثابت قدمی کی دعا ہے۔ ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کرنے کا حکم دینا ایسے ہی ہے جیسے اس آیت

میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ہے۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہمیشگی کرنا جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

دوسری جگہ اللہ رب العزت نے اپنے ایمان دار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ یہ دعا کریں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ یعنی اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما تو بہت بڑا دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔ (آل عمران:8)

ایمان کوئی مذاق نہیں کہ جب چاہا مان لیا جب چاہا انکار کر دیا

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا۔ (النساء۔137)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر (ایمان کا) انکار کر دیا پھر ایمان لائے پھر انکار کر دیا پھر انکار میں بڑھتے رہے تو اللہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں راہ ہدایت دکھائے گا۔

اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب چاہا مسلمان ہو گئے اور جب چاہا اسلام چھوڑ دیا۔ جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب فائدہ دوسری طرف نظر آیا تو بلا تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کا دین و مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا، یہ محض مفاد پرستوں کا ٹولہ ہوتا ہے۔ جہاں چار ٹکے کا فائدہ نظر آیا اس طرف چلے گئے۔ ہر زمانہ کے منافقین کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرہ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے دوسری طرف حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر یہ دشمنان اسلام سے جا ملتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ "پھر اپنے انکار میں بڑھتے چلے گئے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اسلام دشمنی میں اس قدر آگے چلا جائے کہ محض اسلام سے انکار پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے، اور اپنی زندگی کا مقصد اسلام دشمنی بنا لے، ایسے شخص کا اخروی وبال اس شخص سے زیادہ ہے جو محض منکر ہو۔

صحبت بد سے بچو

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔(النساء۔140)

اور اللہ نے تم پر قرآن میں حکم اتارا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں ورنہ تمہارا شمار بھی انہیں میں ہو گا۔

اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ یعنی اگر تم ایسی مجلسوں میں جہاں آیات الٰہی یعنی دین کا مذاق اڑایا جاتا ہو بیٹھو گے اور اس پر نکیر نہیں کرو گے تو پھر تم بھی گناہ میں ان کے برابر کے شریک ہو گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسی مجلسوں اور اجتماعات میں شریک ہونا، جن میں اللہ اور رسول ؐ کے احکام کا قولاً یا عملاً مذاق اڑایا جاتا ہو جیسے آجکل کے امراء، فیشن ایبل اور ایلیٹ کلاس حلقوں میں بالعموم ایسا ہوتا ہے تو ایسی گستاخانہ گفتگو میں شریک رہنا سخت گناہ ہے۔ امام ابو بکر حصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس مجلس میں کوئی گناہ ہو رہا ہو تو مسلمان پر نہی عن المنکر کے ضابطہ سے یہ لازم ہے کہ اگر اس کو منع کرنے کی قدرت نہیں ہے تو کم از کم اس گناہ میں شریک نہ ہو جس کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ اس مجلس سے اٹھ جائے۔

پانچویں پارے کا آخری رکوع: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔۔۔ (النساء۔142)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

منافقین کی بداعمالیاں اور ان کا انجام، منافق کی نماز، ایمان میں تذبذب اور کنفیوژن، ہدایت سے محرومی کا مطلب، توبہ، اصلاح، دین پر استقامت، اخلاص، اگر ایمان اور شکر پیدا کرو تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

منافقین کی بداعمالیاں اور انجام

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (النساء۔142)

یہ منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انہیں (اپنے ہی) دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ (محض) لوگوں کو دکھانے کیلئے کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کی یہ علامت سمجھی جاتی تھی کہ وہ باجماعت نماز میں حاضر ہوتا تھا۔ دور نبویؐ میں کسی شخص کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بناپر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانہ میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جاسکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہل ایمان سے ممیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق وشوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف منافقین کے کہ وہ اذان کی آواز سن کر ان کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اٹھتے تھے، ان کے آنے کا انداز صاف عکاسی کرتا تھا کہ وہ مجبوراً آرہے ہیں، جماعت ختم ہوتے ہی فوراً مسجد سے نکلنے کی فکر میں رہتے جیسے قیدیوں کو رہائی ملی ہے، اور ان کی تمام حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اللہ کے ذکر سے کوئی شوق اور رغبت نہیں ہے۔ اس وجہ سے ایسی سستی والی نماز کو احادیث میں منافقوں کی نماز بھی کہا گیا۔

منافق کی نماز

نماز اسلام کا اہم ترین رکن اور فرض ہے اور اس میں کاہلی اور سستی کا مظاہرہ کرنا نفاق کی علامت ہے کیونکہ منافق کا دل ایمان، خشیت الٰہی اور خلوص سے محروم ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عشاء اور فجر کی نماز بطور خاص منافقین پر بہت بھاری ہوتی تھیں۔

حدیث: حدیث کے اندر آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق پر عشاء اور فجر کی نماز سب سے زیادہ بھاری ہے۔

منافق اللہ کا ذکر برائے نام کرتا ہے۔ اسی طرح نماز جلدی اور مختصر پڑھتا ہے۔ جب نماز اخلاص، خشیت الٰہی اور خشوع سے خالی ہو تو یہ منافق جیسی نماز کہلائے گی۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان (طلوع کے قریب) ہو جاتا ہے تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگیں مار لیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

ایمان میں تذبذب اور کنفیوژن

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ (النساء۔143)

وہ درمیان میں تذبذب کا شکار ہیں، نہ پورے ان کی طرف اور نہ صحیح طور پر ان کی طرف۔ جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے تو کلیسا میرے آگے

ہدایت سے محرومی کا مطلب

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ (النساء۔143)

جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔

یعنی جس نے قرآن و سنّت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر اللہ نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے اللہ نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملہ کو رزق کی مثال سے سمجھیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے۔ مگر اللہ ہر شخص کو رزق اس راستہ سے دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستہ سے طلب کرے اور اسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے اس کو خدا کے اذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس

کے نصیب میں رزق حلال لکھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا۔ رہا یہ سوال کہ کون کن راستے پر ہو گا؟ تو اس کا انحصار سراسر آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچائی کا طالب ہے، اور خالص نیت سے اللہ کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، تو اللہ اسی کا اذن اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے پیدا فرما دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے بھی اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا، اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔ (النساء۔143)

توبہ، اصلاح، دین پر استقامت، اخلاص

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔146)

البتہ جو توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، تو ایسے لوگ مومنوں کے زمرے میں ہوں گے اور خدا عنقریب مومنوں کو بڑا ثواب دے گا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔ (النساء۔147)

اگر ایمان و شکر پیدا کرو تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

شکر کے اصل معنی اعتراف نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو، بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔ انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔

1۔ اولاً آدمی احسان کو اسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کے احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے۔

2۔ ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو اور اس کے ساتھ محبت و اخلاص کا تعلق رکھے۔

3۔ ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

آیت میں لفظ شاکر استعمال ہوا ہے جس کا موزوں ترجمہ قدردان ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنی اعتراف خدمت یا قدردانی کے ہوں گے، اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعتراف نعمت یا احسان مندی کے معنی میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجالائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے، کسی کی خدمات صلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ شکر گزاری کا مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق برائیوں سے اجتناب اور عمل صالح کا اہتمام کرنا۔ یہ گویا اللہ کی نعمتوں کا عملی شکر ہے اور ایمان سے مراد اللہ کی توحید و ربوبیت پر اور نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان ہے۔ جو اللہ کا شکر کرے گا، اللہ کی قدر کرے گا، سچے دل سے ایمان لائے گا، وہ وہ اللہ سے بہترین جزاء پائے گا۔

پارہ – 6

قرآن مجید کا چھٹا پارہ سورہ النساء کی آیات 148 تا 176 اور سورۃ المائدہ کی پہلی 82 آیات پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ۔۔۔ (النساء۔148)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع کا **پہلا حصہ** پانچویں پارے کے آخر میں گذر چکا ہے جس میں منافقین کی بد اعمالیاں، منافق کی نماز، ایمان میں تذبذب اور کنفیوژن، توبہ، اصلاح، دین پر استقامت، اخلاص، ایمان و شکر کا ذکر کیا گیا تھا: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔

اس رکوع کے **دوسرے حصے** یعنی چھٹے پارے کا آغاز **اصلاح معاشرہ کے اصول** سے شروع ہوتا ہے، **شکایت** کی اہمیت، مظلوم کی پکار کی اہمیت، تطہیر معاشرہ کا اسلامی اصول: تزکیہ نفس و تزکیہ معاشرہ یعنی انفرادی و اجتماعی اصلاح، پر اعتماد ماحول کیلئے فرد اور نظم دونوں کی اصلاح ضروری ہے، اللہ کے وسیع علم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تمہارا ہر عمل اللہ کی نظر میں ہے، بھلائی کا اظہار کرو یا پوشیدہ رکھو، یا کسی کی غلطی معاف کرو سب اللہ کے علم میں ہے، مسلمانوں کو اعلیٰ ترین اخلاق اپنانے کی تعلیم، برائیوں سے درگزر کرنے والا، متحمل مزاج، حلیم، بردبار اور وسیع الظرف ہونا چاہیئے۔ منافقین کو منفی پروپیگنڈے سے روکا گیا اور جزوی ایمان (نومن ببعض ونکفر ببعض) کی مذمت بیان کی گئی۔ تمام رسولوں کا ادب و احترام اور ان پر ایمان ضروری ہے، مسلمان رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے یعنی ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے۔ رکوع کے آخر میں اللہ کے دو اسماء حسنیٰ غفور اور رحیم کا ذکر ہے۔

شکایت کی اہمیت

مظلوم کی پکار کی اہمیّت

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَـهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا۔

(النساء۔148)

اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ برا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو اور اللہ بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔

مظلوم کو فریاد کا حق ہے۔

ان آیات میں اصلاح معاشرہ کا قرآنی اصول مربیانہ انداز اپناتے ہوئے بیان کیا گیا۔

پہلی آیت اور دوسری آیت میں دنیا سے ظلم وستم کے مٹانے کے سلسلے میں اصولی ہدایات دی گئیں ہیں۔ یہ ہدایات ترغیب وترہیب کے انداز میں دراصل اسلام کا ایک قانون ہے جس میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ جس شخص پر کوئی ظلم کرے تو مظلوم کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت، یا عدالتی چارہ جوئی کی اجازت ہے، جو عین عدل وانصاف کا تقاضا اور انسداد جرائم کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ایک قید بھی قرآن میں دوسری جگہ سورۃ نحل کی آیت میں مذکور ہے: وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین۔ یعنی اگر کوئی شخص تم پر ظلم کرے تو تم بھی اس سے ظلم کا بدلہ لے سکتے ہو، مگر شرط یہ ہے کہ جتنا ظلم وتعدی اس نے کیا ہے بدلہ میں اس سے زیادتی نہ ہونے پائے، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ظلم کے جواب میں ظلم کی اجازت نہیں بلکہ ظلم کا بدلہ انصاف سے ہی لیا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت ہے کہ بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے مگر صبر کرنا اور درگذر کر دینا بھی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صفات ہیں۔

کسی کے اندر برائی دیکھو تو اس برائی کا چرچا نہ کرو بلکہ تنہائی میں اس کو سمجھاؤ۔ البتہ ظالم کے ظلم کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جاسکتا ہے۔ جس سے ایک فائدہ یہ متوقع ہے کہ شائد وہ ظلم سے باز آجائے اور اس کی تلافی کرے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس سے محفوظ رہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوسرے کو بددعا دینا جائز نہیں، ہاں جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے اپنے ظالم کو بددعا دینا جائز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بددعا نہیں کرنی چاہیئے بلکہ یہ دعا کرنی چاہیئے: اللھم اعنّی علیہ واستخرج حقی منہ۔ یااللہ اس (ظالم) پر تو میری مدد کر اور اس سے میرا حق دلوا دے۔

اللہ ہر ظاہر وباطن نیکی کو جانتے ہیں

مسلمانوں کو اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار اپنانے کی تعلیم

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا۔

اگر تم کسی نیکی کو اعلانیہ کرو یا پوشیدہ کسی برائی سے درگزر کرو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور قدرت والا ہے۔ النساء۔149

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ دشمنان اسلام اور اسلاموفوبیا کا شکار لوگ سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اسلام کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے ربّ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا اعلانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں اللہ کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ، متحمل مزاج، بردبار اور وسیع الظرف بنو۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: صدقے اور خیرات سے کسی کا مال گھٹتا نہیں۔ عفو و درگزر کرنے اور معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ اور عزت بڑھاتا ہے اور جو شخص اللہ کے حکم سے تواضع، فروتنی اور عاجزی اختیار کرے اللہ اس کا مرتبہ اور توقیر مزید بڑھا دیتا ہے۔ (مسلم)

اس آیت میں اصل مقصد تو ظلم کے معاف کرنے سے متعلق ہے، مگر اس کے ساتھ علانیہ اور خفیہ نیکی کا بھی ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ عفو و درگزر ایک بڑی نیکی ہے جو اس کو اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو جائے گا۔

تمام رسولوں کا ادب واحترام اور ان پر ایمان ضروری ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ (النساء۔150)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی درمیانی راہ نکال لیں۔

اس آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا کہ تمام انبیاء اور رسولوں پر ایمان ضروری ہے۔ کسی ایک نبی کا انکار تمام انبیاء کے انکار کے برابر ہے۔ کسی ایک نبی کی توہین تمام انبیاء کی توہین کی طرح ہے۔ لا نفرق بين احد من رسله

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اذا سلّمتم عليّ فسلّمو على المرسلين فانا رسول من المرسلين۔ جب تم مجھ پر سلام بھیجو تو تمام رسولوں پر بھی سلام بھیجو کیونکہ میں بھی رسولوں میں سے ایک رسول ہوں۔

تمام انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (النساء۔152)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں، اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں (یعنی رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ سمجھیں)، اُن کو ہم ضرور اُن کے اجر عطا کریں گے، اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ ایمانداروں کا شیوہ بتایا گیا ہے کہ وہ سب انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ پہلے نبی آدمؑ سے لیکر آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ تک کسی بھی نبی کا انکار نہیں کرتے۔

دوسرا رکوع: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا۔۔۔ (النساء۔153)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع میں عقائد کی خرابی اور توہین انبیاء میں مبتلا لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھایا گیا، محسوس معجزات کا مطالبہ (ارنا اللہ جھرۃ)، بعض اہل کتاب کی بد اعمالیاں اور اللہ کی رحمت سے دوری کے اسباب، حکم سبت کی خلاف ورزی، عہد شکنی، احکامات الٰہی کی خلاف ورزی، آیات الٰہی کی تکذیب، قتل و توہین انبیاء، دلوں کا غلاف (قلوبنا غلف)، ہدایت قبول کرنے میں ہچکچاہٹ، حضرت عیسیٰؑ اور امّ عیسیٰؑ کے بارے میں اسلامی عقائد و تصورات کی وضاحت، مریمؑ کی عظمت و عفت کا بیان، ان پر تہمت کی تردید، عیسیٰؑ کا رفع آسمانی (بل رفع اللہ الیہ)، سود خوری، دوسروں کا مال ناحق کھانا

(واکلھم اموال الناس بالباطل) دنیا پرستی، حلال و حرام کا احترام، اہل کتاب کے اہل علم (الرّاسخون فی العلم) کی تعریف، ایمان دار لوگوں کی تعریف اور ان کیلئے اجر عظیم کا وعدہ۔

محسوس معجزات کا مطالبہ

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَ لُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا۔ (النساء۔153)

(اے محمدؐ) اہل کتاب تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر (ایک ہی دفعہ لکھی ہوئی) کتاب آسمان سے اتار لاؤ تو یہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز مانگ چکے ہیں (ان سے) کہتے تھے ہمیں خدا ظاہر (یعنی آنکھوں سے) دکھا دو سو ان کے گناہ کی وجہ سے ان کو بجلی نے آپکڑا۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا، حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے تو اس سے بھی ہم نے درگزر کیا اور ہم نے موسیٰ کو صریح دلیل عنایت فرمائی۔

بعض اہل کتاب نبی اکرم ﷺ سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب نازل نہ ہو۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گئے اور تختیوں پر لکھی ہوئی تورات لے کر آئے، اسی طرح آپ بھی آسمان پر جاکر لکھا ہوا قرآن مجید لے کر آئیں یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

احکامات الٰہی کی خلاف ورزی

حکم سبت کی خلاف ورزی، عہد شکنی، آیات الٰہی کی تکذیب، قتل و توہین انبیاء

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (النساء۔155)

آخر کار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں حالانکہ در حقیقت اِن کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اِن کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

بعض اہل کتاب کی ان بد اعمالیوں کا بیان ہو رہا ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے:

1۔ اولاً ان کی عہد شکنی تھی کہ جو وعدے انہوں نے اللہ سے کئے ان پر قائم نہ رہے۔

2۔ دوسرے اللہ کی آیتوں یعنی حجت و دلیل اور نبیوں کے معجزوں سے انکار۔

3- تیسرے بلاوجہ، ناحق انبیاء کرام کا قتل اور ان کی توہین۔

4۔ چوتھا ان کا یہ خیال اور قول کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں یعنی پردے میں ہیں، جیسے قریش مکہ نے کہا تھا: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ۔ (فصلت۔5) یعنی اے نبی تیری دعوت سے ہمارے دل پردے میں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل علم کے ظروف ہیں وہ علم و عرفان سے پہلے ہی پُر ہیں لہٰذا ہم مزید کوئی علم کی بات سننے کیلئے تیار ہی نہیں۔

اگلی دو آیات میں مزید دو گناہوں کا ذکر ہے:

5۔ مریم علیہ اسلام پر تہمت وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔156)

حضرت عیسیٰؑ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنادیا تھا کہ یہ غیر معمولی صفات کا حامل بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے چھوٹے بڑے ہزاروں افراد اس کے گھر پر ہجوم کر کے آگئے، تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گھوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ: اِنِّیْ عَبْدُ اللہِ، اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورۃ مریم رکوع 2)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، علماء و فقہاء

کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم (علیہا السلام) معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس در حقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد اللہ کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

6۔ عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ قتل کرنے کا دعویٰ۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔۔ (النساء۔157)

بظاہر یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو ان کی برائیوں پر انہیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں، ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تلمود میں لکھا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے وہاں کے مذہبی رہنماؤں سے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟ انہوں نے جواب دیا "یہاں زکریاؑ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا"۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ جب انہوں نے ہیرودیس (ریاست کے سربراہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے، اور پھر ایک جھوٹے الزام میں ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ بنی اسرائیل کی قتل انبیاءؑ کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زعم میں مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ان کے ان مندرجہ بالا گناہوں کے نتیجے میں فرمایا گیا کہ اب ان کے دل انکار و سرکشی اور کمی ایمان پر ہی رہیں گے۔

عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔

حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ النساء۔157

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

بلکہ اللہ تعالٰی نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ النساء۔158

یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش کامیاب نہیں ہوئی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھالینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔

یہ آیت نص صریح ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا تھا۔
متواتر احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ ان احادیث میں آسمان پر اٹھائے جانے کے علاوہ قیامت کے قریب ان کے نزول کا اور دیگر بہت سی باتوں کا بھی تذکرہ ہے۔

اہل کتاب کے ایماندار لوگوں کی تعریف

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (النساء۔162)

لیکن ان میں سے جو پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل گیا اور جو آپ سے پہلے نازل ہوا اور نمازوں کو قائم رکھنے والے ہیں اور زکوٰۃ کے ادا کرنے والے ہیں اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں یہ ہیں جنہیں ہم بہت بڑے اجر عطا فرمائیں گے۔ النساء۔162

یعنی پچھلی آیات کے اندر جتنے گناہ یا جرائم بیان کئے گئے ان سب گناہوں کے مرتکب سب اہل کتاب نہیں تھے بلکہ ان میں مخصوص لوگ تھے۔ عمومی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی کتب آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اس امر حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے، ان کی روش عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاء نے دی تھی اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے، اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

آیت میں جن حضرات کے لئے اجر کامل کا وعدہ ہے وہ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے ہے اور جہاں تک نفس نجات کا تعلق ہے وہ عقائد ضروریہ کی تصحیح پر موقوف ہے، بشرطیکہ خاتمہ بالایمان کی سعادت نصیب ہو۔

تیسرا رکوع: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ--- (النساء۔163)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

تمام انبیاء ایک ہی دین اور پیغام کے علمبردار، تعداد انبیاء: کل کتنے انبیاء اور رسول بھیجے گئے؟ شہرت اور ناموری کے بغیر نیک کام کرتے رہو، بعثت انبیاء اتمام حجت کیلئے تھی، تمام انسانیت کو خطاب (یا ایھا الناس قد جاء کم الرّسول بالحق)، دین میں غلو نہ کرو (لا تغلو فی دینکم)، دین کی معتدل تعلیمات، رواداری، تحمل کی اقدار کا فروغ، مبالغہ آرائی، انتہاپسندی سے اجتناب، دین و دنیا دونوں میں اعتدال، تشدد فی الدین کی وجوہات، امت مسلمہ میں غلو اور اس کے اسباب، اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب نہ کرو (ولا تقولو علی اللہ الّا الحق)، عیسیٰؑ محض اللہ کے رسول تھے، عیسیٰؑ کے کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہونے کا مطلب، درس توحید کا اعادہ (انما اللہ الٰہ واحد)، کارسازی کیلئے اللہ کافی ہے (وکفیٰ باللہ وکیلا)۔

تمام انبیاءؑ ایک ہی دین اور پیغام کے علمبردار،

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ (النساء۔163)

اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔ (النساء۔163)

حضرت نوحؑ کے بعد جو انبیاء ہوئے ہیں انہیں بالاجمال ذکر کر کے ان میں سے جو اولوالعزم اور جلیل القدر انبیاء ہیں ان کا بطور خاص بھی ذکر کر دیا گیا، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سب انبیاء ہیں۔ انبیاء کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی ہے، کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ براہ راست اپنے رسولوں سے

بات کرتے ہیں، غرض جس طریقہ سے بھی وحی آجائے اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، لہٰذا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ توراۃ کی طرح لکھی ہوئی کتاب نازل ہوگی تو مانیں گے ورنہ نہیں، یہ لکھی لکھائی کتاب کے نزول کا مطالبہ ایک عجیب مطالبہ ہے۔

اس آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد ﷺ کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبع علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

الْأَنْبِيَاء اِخوَةٌ لعلّاتٍ اُمَّهٰتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنهم وَاحِدٌ۔۔

تمام انبیاء آپس میں علّاتی بھائیوں کی طرح ہیں اگرچہ انکی مائیں مختلف ہیں مگر دین سب کا ایک ہی ہے۔ (بخاری و مسلم)

Hadith: The Prophets are like paternal brothers; their mothers are different, but their religion is one. (Bukhari, Muslim)

تعدادانبیاء: کل کتنے انبیاءؑ اور رسولؑ بھیجے گئے؟

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۔۔۔ (النساء۔164)

اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات ہم تم سے پیشتر بیان کر چکے ہیں اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات تم سے بیان نہیں کئے۔ النساء۔164

جن نبیوں اور رسولوں کے اسمائے گرامی اور ان کے واقعات قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں ان کی تعداد 24 یا 25 ہے۔

جن انبیاء ورسل کے نام اور واقعات قرآن میں بیان نہیں کئے گئے، ان کی تعداد کتنی ہے؟ ایک حدیث میں ایک لاکھ 24 ہزار اور ایک حدیث میں 8 ہزار تعداد بتلائی گئی ہے۔

حدیث: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے ہیں جن میں سے تین سو تیرہ اصحاب شریعت رسول تھے۔ (قرطبی)

آپ سے پہلے کتنے نبی آئے؟ان کی صحیح تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بالآخر یہ سلسلہ نبوت حضرت محمد ﷺ پر ختم فرمادیا گیا۔

شہرت اور ناموری کے بغیر نیک کام کرتے رہو

اس آیت میں یہ سبق دیا گیا کہ ایک مسلمان کو مصنوعی شہرت کے پیچھے نہیں پڑھنا چاہیئے۔ہمیں یہ بات یاد رکھنی کامیابی کیلیئے ضروری نہیں کہ انسان کا نام ہو اور تاریخ میں اس کے تذکرے ہوں۔بہت سے انبیائے کرام چاہیئے کہ ایسے بھی گذرے ہیں جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا حالانکہ وہ دنیا و آخرت میں اعلیٰ درجے کے کامیاب ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:ورسلاً لم نقصصهم عليک۔اور بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے واقعات ہم نے آپ کو نہیں سنائے۔(النساء۔164) لہٰذا اپنے تذکرے اور نام کی پرواہ کئے بغیر کام کرتے رہیں۔

قرآن مجید میں دوسرے مقام پر جھوٹی شہرت اور جھوٹی تعریف کی مذمت بھی بیان کی گئی۔فرمایا گیا:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِیْمٌ۔ (آل عمران۔188)

وہ لوگ جو اپنے مصنوعی اعمال پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے ان پر بھی ان کی تعریف و ستائش کی جائے۔آپ انہیں ہرگز عذاب سے نجات پانے والا نہ سمجھیں،ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(آل عمران۔188)

اس آیت میں ایسے لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو اپنے کارناموں پر خوش ہی نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان کے کھاتے میں وہ کارنامے بھی درج یا ظاہر کئے جائیں جو انہوں نے نہیں کئے ہوتے۔یہ بیماری جس طرح عہد رسالت کے بعض لوگوں میں تھی جن کیلیئے اس آیت کا نزول ہوا،اسی طرح آج بھی جھوٹی شہرت کے طلبگار،جاہ پسند قسم کے لوگوں اور پروپیگنڈے کے ذریعے سے بننے والے لیڈروں میں یہ بیماری عام ہے،چاہے وہ سیاسی رہنما ہوں یا مذہبی رہنما مثلاً وہ اپنی تعریف میں یہ سننا چاہتے ہیں کہ وہ قوم کے ساتھ بڑے مخلص ہیں،بڑے متقی ہیں،دیندار اور پارسا ہیں خادم دین ہیں،حامی شرع متین ہیں، مصلح و مزکی ہیں،حالانکہ حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں یا وہ اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پٹوانا چاہتے ہیں کہ فلاں سیاسی لیڈر بڑے ایثار پیشہ، مخلص اور دیانت دار رہنما ہیں اور انہوں نے قوم و ملت کی بڑی خدمت کی ہے۔حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔آج کے سوشل میڈیا کے دور میں یہ بیماری اور بھی بڑھ چکی ہے۔

اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام الشکور بھی ہے یعنی وہ قدردان ذات ہے۔ وہ اپنے بندوں کی قدر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندے کی قدردانی اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے بندے کے تھوڑے عمل پر بھی راضی ہو جاتے ہیں اور اس کی بخشش فرما دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی حوصلہ افزائی کیلئے اس کو ایک نیکی کرنے پر کم از کم دس نیکیوں کا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، یہی نہیں بلکہ نیک اعمال کرنے پر گناہ بھی معاف فرماتے ہیں۔ یقین رکھیئے! وہ قدردان ذات آپ کی محنت اور کام کو دیکھ رہی ہے، لہٰذا اسی سے اجر کی امید رکھیں دنیا والوں کی جھوٹی تعریف کے پیچھے نہ پڑھیں۔

بعثت انبیاءؑ اتمام حجت کیلئے تھی

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ (مائدہ۔165)

یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔

یعنی نبوت کا یہ سلسلہ ہم نے اس لئے قائم فرمایا کہ کسی کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمیں تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا۔ اگر ہم ان کو پیغمبر (کے بھیجنے سے) پہلے ہی ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پیشتر تیری آیات کی پیروی کر لیتے۔ تمام پیغمبروں کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا تھا، تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے اللہ نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام اللہ پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو ہدایت کاراستہ معلوم تھا مگر انہوں نے اللہ کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہ کیا یعنی دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا۔

تمام انسانیت کو خطاب

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭوَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭوَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (النساء۔170)

اے لوگو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے رسول حق لے کر آگیا ہے۔ لہذا اس پر ایمان لے آؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اور اگر انکار کرو گے تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ النساء۔170

حدیث قدسی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اے میرے بندو! اگر تمہارے اوّل و آخر تمام انسان اور جن اس ایک آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے متقی ہے تو اس سے میری بادشاہی میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اور اگر تمہارے اول و آخر، انس و جن اس آدمی کے دل کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے بڑا نافرمان ہے تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

اے میرے بندو! اگر تم سب ایک میدان میں جمع ہو جاؤ اور مجھ سے سوال کرو اور میں ہر انسان کو اس کے سوال کے مطابق عطا کروں تو اس سے میرے خزانے میں اتنی بھی کمی نہ ہو گی جتنی سوئی کے سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے سمندر کے پانی میں ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم)

دین میں غلو نہ کرو

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ۔۔۔ (النساء۔171)

! اے اہل کتاب: اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو۔

غلو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے گزر جانا۔ یہ آیت عیسیٰؑ کی شخصیت کے بارے میں افراط و تفریط سے متعلق ہے۔ کیونکہ بعض لوگ مسیح کی عقیدت و محبت میں حد سے گذر گئے جبکہ دوسرے لوگ مسیح کے انکار اور مخالفت میں حد سے گزر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل کتاب کو دین میں غلو سے منع فرمایا ہے۔

حدیث: نبی اکرم ﷺ نے بھی اس غلو کے پیش نظر اپنے بارے میں اپنی امت کو متنبہ فرمایا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: لاتطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ ابن مریم! فانما انا عبده، فقولوا; عبد

اللہ ورسولہ۔ تم مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو مرتبے میں بڑھایا، میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، پس تم مجھے اس کا بندہ اور رسول ہی کہنا۔ (بخاری)

اس سے معلوم ہوا کہ غلوفی الدّین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا۔ اسی لئے ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی امت کو اس وباء عظیم سے بچانے کے لئے مکمل طور پر متنبہ فرمایا۔

یہ آیت اگرچہ اہل کتاب کے بارے میں ہے تاہم اس آیت کا حکم عام ہے اور اس کا مدعا یہ ہے کہ دین میں حد سے تجاوز درست نہیں۔ دین میں اعتدال، رواداری اور تحمل جیسی اقدار کو اپنانے کی تاکید کرتے ہوئے افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے دین اسلام میں خودساختہ تاویلات کر کے دین کو عمل کیلئے مشکل اور پیچیدہ بنادیا۔ ایسے لوگ اللہ کے ہاں خود جوابدہ ہونگے۔ ہمیں بحیثیت مسلمان دین میں غلو، اور انتہا پسندی سے بچنا چاہیے۔ ہمارا دین جو توازن اور معتدل تعلیمات پر مبنی ہے اس پر عمل کرنا چاہئے۔

حدیث: حج کے موقع پر رسول اللہؐ نے رمی جمرات کے لئے حضرت عبداللہ بن عباس کو فرمایا کہ آپ کے لئے کنکریاں جمع کر لائیں، انہوں نے متوسط قسم کی کنکریاں پیش کر دیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: بمثلھن، بمثلھن یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہئے۔ پھر فرمایا: یعنی غلوفی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی امتیں غلوفی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں۔

غلوفی الدین کے حوالے سے یہ حدیث بڑی اہم ہے۔ اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوتے ہیں:

1۔ اول یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں، ان کی حد مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی، بڑے بڑے پتھر اٹھا کر پھینکنا غلوفی الدین میں داخل ہے۔

2۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی ایک شرعی حد مقرر ہے جو رسول کریم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے متعین فرمادی ہے، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

3۔ تیسرے یہ واضح ہو گیا کہ غلوفی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حد مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

دین ودنیا میں اعتدال

رسول کریم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے دین ودنیا کی حدود متعین فرمادی ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم دیا۔ فرائض کی پابندی اور حرام سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ آپؐ نے نکاح اور فیملی لائف کو اپنی سنت قرار

دیا اور اس کی ترغیب دی، تربیت اولاد کے فوائد اور درجات بتلائے۔ اہل و عیال کے ساتھ حسن معاشرت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو فرض قرار دیا۔ اپنی اور ان کی ضروریات کے لئے کس معاش کو فریضہ بعد الفریضہ فرمایا۔ تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور مزدوری کی لوگوں کو تاکید فرمائی، دعوت دین اور اقامت دین کو فریضہ نبوت قرار دے کر امّت کو اس فریضہ کی ادائیگی کا حکم دیا۔ باقی مذاہب نے دین کی عادلانہ، متوازن اور متوسط تعلیمات کو بھلا کر غلو فی الدین میں مبتلا ہو گئے۔ افسوس کہ امت مسلمہ بھی اس غلو اور دین میں افراط و تفریط سے محفوظ نہ رہ سکی جس میں دوسری امتیں مبتلا ہوئیں۔ حدیث مبارکہ کے اندر آتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح تم پچھلی امتوں کی پیروی کرو گے یعنی ان کے قدم بہ قدم چلو گے۔

امت مسلمہ میں غلو فی الدین کی دو اہم وجوہات

رسول کریم ﷺ کی اعتدال کی تعلیمات اور تاکیدات کے باوجود آج امت مسلمہ اسی غلو فی الدین اور تشدّد فی الدین کا شکار ہے، جس کی دو بڑی وجوہات ہیں:

1۔ پہلی وجہ: غلو فی الدین کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ نظریہ بنالیا ہے کہ علماء اور آئمہ دین کوئی چیز نہیں، کتاب اللہ ہمارے لئے کافی ہے، جیسے وہ اللہ کی کتاب کو سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں، هم رجال ونحن رجال۔ یعنی وہ بھی انسان ہیں ہم بھی انسان ہیں۔ حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کو براہ راست تمام انسانوں تک پہنچا دیتا، رسول کو معلم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بات صرف کتاب اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی بھی علم فن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا، ڈاکٹری، یا طب یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا، انجینئرَی کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینئرَ نہیں بنا، ڈرائیونگ کی محض تھیوری پڑھ کر بغیر انسٹرکٹر کے کوئی ڈرائیور نہیں بنا۔ کھانے کی محض کتاب پڑھ کر کوئی شیف نہیں بنا بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم و تعلم اور معلم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، مگر افسوس کہ قرآن و سنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لئے کسی معلم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، چناچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کو کافی سمجھ بیٹھے، آئمہ دین، فقہاء و مجتہدین کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

2۔ دوسری وجہ: دوسری طرف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس مرض میں مبتلا ہو گئی کہ اندھا دھند جس کو چاہا اپنا مقتداء اور پیشوا بنالیا، پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی، نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتداء اور پیشواء بنا رہے ہیں یہ

علم و عمل اور اصلاح و تقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اترتا ہے یا نہیں؟ اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے خلاف تو نہیں؟

ان دو بڑی وجوہات کی وجہ سے امّت مسلمہ میں غلو فی الدین اور تشدّد فی الدین کی بیماری پیدا ہوئی۔

اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طریقہ کار یہ بتلایا کہ قرآن و حدیث کو معیار بناؤ، رجال اللہ کو کتاب اللہ سے پہچانو، یعنی قرآن و سنت کی تعلیمات کے ذریعہ پہلے ان لوگوں کو پہچانو جو کتاب و سنت کا علم رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کتاب و سنت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے پھر ان کے ساتھ مل کر دعوت دین اور اقامت دین کا کام کرو۔ فرقہ واریت سے پرہیز کرو، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ اپناؤ۔ دین میں غلو سے بچنے کا یہی نسخہ کیمیاء ہے۔

(اس موضوع پر مزید تشریح کیلئے دیکھئے اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، تذکیر بالقرآن پارہ 4، سورۃ آل عمران آیت 103)

اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب نہ کرو

وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ۔۔۔ (النساء۔171)

اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔

عیسیٰؑ محض اللہ کے رسول تھے

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَ لْقٰـهَآ اِلٰى مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۡ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۡ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ۔ (النساء۔171)

بے شک عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہے سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور اپنے عقیدہ تثلیث کی اصلاح کر لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

عیسیٰؑ کے کلمۃ اللہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

وَكَلِمَتُهٗ: عیسیٰ علیہ اسلام اللہ کا کلمہ تھے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کار فرما ہوتے ہیں، ایک عامل نطفہ ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمہ کن فرمانا جس کے بعد وہ بچہ وجود میں آ جاتا ہے...... حضرت عیسیٰؑ کے حق میں چونکہ پہلا عامل منفی ہے

یعنی موجود ہی نہیں، اس لئے دوسرے عامل کی طرف نسبت کر کے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مادی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف اللہ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے ہیں۔

بعض نے فرمایا کہ کلمة الله، بشارة الله کے معنی میں ہے اور مراد اس سے حضرت عیسٰیؑ ہیں، اللہ جل شانہ، نے فرشتوں کے ذریعے حضرت مریمؑ کو حضرت عیسٰی کی جو بشارت دی تھی اس میں کلمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: اذ قالت الملكة يا مريم ان الله يبشرك بكلمة۔۔

عیسٰیؑ کے روح اللہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟

وَرُوْحٌ مِّنْهُ: بعض نے فرمایا عرف کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شئے کی طہارت اور پاکیزگی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو مبالغہ کے لئے اس پر روح کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش میں چونکہ کسی باپ کے نطفہ کا دخل نہیں تھا اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور کلمہ کن کا نتیجہ تھے، اس لئے اپنی طہارت و نظافت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو روح اللہ کہا گیا اور اللہ کی طرف نسبت ان کی تعظیم و تشریف کے لئے ہے، جس طرح مساجد کی تعظیم کے لئے ان کی نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے مساجد اللہ، یا کعبہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے کعبۃ اللہ یا بیت اللہ کہا جاتا ہے، یا کسی اطاعت شعار بندہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے عبد اللہ کہا جاتا ہے، چناچہ سورۃ بنی اسرائیل میں حضور اکرم ﷺ کے لئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے اسرٰی بعبده۔۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ عیسٰیؑ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مردہ دلوں میں روحانی حیات ڈال کر پھر زندہ کر دیں، چونکہ وہ روحانی حیات کا سبب تھے جس طرح روح جسمانی حیات کا سبب ہوا کرتی ہے، اس لئے اس اعتبار سے ان کو روح کہا گیا، جیسا کہ خود قرآن کریم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ وكذلك اوحينا اليك روحا من امرنا، کیونکہ قرآن کریم بھی روحانی حیات بخشتا ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ روح نفخ (پھونک) کے معنی میں ہے، حضرت جبرئیلؑ نے حضرت مریم کے گریبان میں اللہ کے حکم سے پھونک دیا تھا اور حضرت عیسٰیؑ بطور معجزہ کے صرف نفخ سے پیدا ہو گئے تھے اس لئے آپ کو روح اللہ کہا گیا، قرآن کریم کی دوسری آیت: فنفخنا فيه من روحنا۔۔۔ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہر حال روح اللہ کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ حضرت عیسٰیؑ اللہ کا ایک جز ہیں۔

درس توحید کا اعادہ

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (النساء۔171)

بے شک اللہ اکیلا معبود ہے وہ اس سے پاک ہے اس کی اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز کافی ہے۔

چوتھا رکوع: لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔۔۔ (النساء۔172)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

عیسیٰؑ اللہ کے بندے تھے اور خود انہیں اللہ کی بندگی سے انکار بھی نہیں تھا، انبیاء، فرشتے، نیک لوگ اللہ کی بندگی پر فخر محسوس کرتے ہیں، ایمان و عمل صالح والوں کیلئے پورا اجر اور اللہ کا فضل، نبی اکرمؐ عالم گیر دعوت کے داعی تھے (یا ایھا الناس قد جاء کم برھان من ربکم)، برھان اور نور، قرآن نور مبین ہے، وراثت کے ضمنی مسائل، عصبہ اور کلالہ کی وضاحت، کلالہ (لاوارث شخص) کی وراثت کے مسائل، سورۃ النساء کا اختتام۔

مسیحؑ کو اللہ کی بندگی سے انکار نہیں

مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو، اور نہ مقرب فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ:

یعنی مسیح کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں اور نہ ہی اللہ کے مقرب فرشتوں کو عار ہے اس لئے کہ اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے، ایک بہت بڑا اعزاز اور ٹائٹل ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مقرب ترین فرشتے بھی اللہ کی بندگی سے انکار نہیں کرتے نہ ہی یہ ان کی شان کے لائق ہے۔ بلکہ جو جتنا مرتبے میں قریب ہوتا ہے، وہ اسی قدر اللہ کی عبادت میں زیادہ پابند ہوتا ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو لوگ پوجتے تھے، اسی طرح فرشتوں کی بھی پوجا اور عبادت کرتے تھے۔ تو اس آیت میں عیسیٰؑ کو اللہ کی عبادت سے نہ رکنے والا بتا کر فرشتوں کی بھی یہی حالت بیان کر دی، جس سے ثابت ہو گیا کہ جن کی تم

عبادت کرتے ہو وہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں پھر ان کی عبادت کیسی؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بعض لوگوں نے فرشتوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا تھا، اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ تو سب کے سب اللہ کے بندے ہیں اور اس سے انہیں قطعاً کوئی انکار نہیں ہے۔ تم انہیں اللہ یا اس کی خدائی میں شریک کس بنیاد پر بناتے ہو۔

ایمان و عمل صالح والوں کیلئے پورا اجر

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَ لِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ (النساء۔173)

توجو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے وہ ان کو ان کا پورا بدلا دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی عنایت کرے گا اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے اُن کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔ النساء۔173

برہان اور نور مبین

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ (النساء۔174)

لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری جانب واضح نور بھیج دیا ہے۔ النساء۔174

اس آیت میں دو اصطلاحات استعمال کی گئیں ہیں: ایک برہان اور دوسرا نور مبین۔

برہان سے کیا مراد ہے؟

برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ (روح المعانی)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ کی ذات اقدس کو لفظ برہان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ آپ کی ذات مبارک اور آپ کے اخلاق کریمانہ، آپ کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپ کی نبوت اور آپ کی رسالت کے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی احتیاج باقی نہیں رہتی تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپؐ کی ذات اور آپؐ کی سیرت ایک مجسم دلیل ہے۔

نور سے کیا مراد ہے؟

اور نور سے مراد قرآن مجید ہے جیسا کہ سورۃ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے: قد جآء کم من اللہ نور و کتب مبین۔ (5:51) یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے۔ اس آیت میں جس کو نور کہا گیا ہے آگے اسی کو کتاب مبین بھی کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغائر چاہتا ہے لہٰذا نور اور کتاب ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عنوان کا تغائر بھی کافی ہوتا ہے اگرچہ مصداق اور معنی ایک ہی ہے۔

اور اگر نور سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہو، اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو یہ بھی صحیح ہے (روح المعانی) لیکن اس سے حضورؐ کا ایسا نور محض ہونا ثابت نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِىْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ (النساء۔175)

پس جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اس (کے دین کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہے ان کو وہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھا رستہ (صراط مستقیم) دکھائے گا۔ (النساء۔175)

وراثت کے ضمنی مسائل

عصبہ اور کلالہ کی وضاحت

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ۔ (النساء۔176)

اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سورتوں میں سب سے آخری سورت سورۃ برأت اتری ہے اور آیتوں میں سب سے آخری آیت: يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ۔۔۔ (النساء،176) اتری ہے۔

شان نزول: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں بیماری کے سبب بیہوش پڑا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے، آپؐ نے وضو کیا اور وہی پانی مجھ پر ڈالا، جس سے مجھے افاقہ ہوا اور میں نے کہا: حضورؐ! وارثوں کے لحاظ سے میں کلالہ ہوں (یعنی نہ میری اولاد ہے نہ میرے والدین زندہ ہیں) میری میراث کیسے تقسیم ہو گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت فرائض نازل فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

کلالہ (لاوارث) کی وراثت کے مسائل

سورۃ مائدہ کا اختتام

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (النساء۔176)

اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ سورۃ النساء کا اختتام ہے جس میں اس نصیحت کا اعادہ کیا گیا ہے کہ تمام امور کا مرجع اللہ رب العالمین ہی کی طرف ہے یعنی تمام معاملات بالآخر اللہ کے حضور پیش کئے جائیں گے لہٰذا تمام حقوق واجبات اور تمام مالی اور غیر مالی امور میں تقویٰ اور خوف خدا کو پیش نظر رکھا جائے، دینی احکامات وہدایات کی پیروی کی جائے۔ آیت میں فرمایا گیا: اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے کہ تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے یعنی تم اللہ کے احکام کی تابعداری کرو ورنہ گمراہی میں پڑ جاؤ گے اور بھٹکتے پھرو گے۔

سورۃ المائدہ

سورۃ المائدہ مدنی سورت ہے اور اس میں 120 آیات ہیں۔

سورۃ مائدہ کا موضوع اور تعارف

سورۃ مائدہ مدنی سورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخری کی سورت ہے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے اس کو قرآن کی آخری سورت بھی کہا ہے۔ روایات کے مطابق یہ سورت حجۃ الوداع کے سفر کے دوران نازل ہوئی۔ حجۃ الوداع ہجرت کے دسویں سال میں ہوا، اور اس سے واپسی کے بعد نبی کریم ﷺ کی دنیوی حیات تقریباً اسی (80) دن رہی۔ ابن حبان نے بحر محیط میں فرمایا کہ سورۃ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حدیبیہ میں اور بعض فتح مکہ کے سفر میں اور بعض حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت نزول قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے خواہ بالکل آخری سورت نہ بھی ہو۔

حدیث: روح المعانی میں بحوالہ ابو عبید حضرت حمزہ بن حبیب اور عطیہ بن قیس کی یہ روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: المائدۃ من اٰخر القراٰن تنزیلا فاحلو احلالہا واحترموا حرامھا۔ یعنی سورۃ مائدہ ان سورتوں میں سے ہے جو نزول قرآن کے آخری دور میں نازل کی گئی ہیں، لہٰذا اس میں جو چیز حلال کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حلال اور جو چیز حرام کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حرام سمجھو۔

اس سورت میں سورہ النساء کی طرح حقوق العباد کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ حلال و حرام، باہمی معاملات، اسلامی تہذیب کی خصوصیات، شعائر اللہ کا احترام، حج کے بعض احکام، طہارت، وضو، غسل، تیمم کے احکامات، کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل و انصاف سے نہ ہٹائے (ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلو)۔ ملٹی فیتھ سوسائٹی کے تناظر میں مسلم کمیونٹی کو خاص ہدایات دی گئیں مثلاً اہل کتاب سے تعلقات میں نرمی، ایک ساتھ کھانے پینے کی اجازت: وطعام الذین اوتو الکتاب حل لکم و طعامکم حل لھم، اہل کتاب سے نکاح، غلط عقائد و نظریات کا تجزیہ، عقائد کی خرابیاں، غلط نظریات کا تنقیدی جائزہ اور انکی اصلاح کی کوشش، دعوت دین، ماضی میں مذہبی غلطیوں پر تنبیہ، حلال و حرام کی پابندی، معاملات، عہد و حلف، معاہدوں کی پابندی، دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کی مذہبی رسومات، علامات کی توہین کی ممانعت، ہر قوم کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ ہر انسانی جان کا احترام، مسلمانوں کو ان کی خاص عبادات، حج، نماز، طہارت کے احکامات کے سلسلے میں ہدایات، اسلام میں جرم و سزاء کا تصور، بغاوت اور دوسرے شدید جرائم کی سزائیں، دوستی اور دلی محبت (موالات) کے

اصول، تمام آسمانی کتابیں اللہ کی نازل کردہ اور اپنے دور کا حق تھیں مگر اس وقت قابل اتباع آسمانی ہدایت قرآن و حدیث ہے۔

معاہدات اور معاملات کے بارے میں یہ سورۃ اور بالخصوص اس کی ابتدائی آیت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔

سورۃ مائدہ کی پہلی آیت میں بھی ان تمام معاملات اور معاہدات کی پابندی اور ان کے پورا کرنے کی ہدایت آئی ہے۔

اسی لئے سورۃ مائدہ کا دوسرا نام سورۃ عقود بھی ہے۔(بحر محیط)

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جب عمرو بن حزمؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا اور ایک فرمان لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ تو اس فرمان کے سرنامہ پر آپ ﷺ نے یہ آیت تحریر فرمائی تھی: یاایّھا الذّین اٰمنوا اوفوا بالعقود۔۔ اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو۔ (مائدہ۔1)

پارے کا پانچواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔۔۔ (مائدہ۔1)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

سورہ مائدہ کا تعارف، عہد اور حلف کی پاسداری، کنٹریکٹ اور معاہدوں کی پابندی (اوفوبالعقود)، انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کرو، شرعی حدود و قیود کی پابندی، اسلام کا فلسفہ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی پابندی، جانوروں کی حلت و حرمت کے اصول، شرعی ذبیحہ کے اصول، شعائر اللہ کی تعظیم (لاتحلو شعائر اللہ)، اسلام میں مذہبی رواداری اور دوسرے مذاہب کی مذہبی علامات کا احترام، مذہبی برداشت، توہین مذاہب کی ممانعت، اصلاح معاشرہ کا اہم اصول: اچھے کاموں میں سب کے ساتھ تعاون جبکہ گناہ اور سرکشی میں عدم تعاون (وتعاونو علی البرّ والتقوٰی)، ناجائز مال کی اقسام: وان تستقسمو بالازلام۔ جواء، لاٹری، گیم آف چانس، شطرنج کی ممانعت، فال نکالنے کے بجائے استخارہ کا حکم، تکمیل دین والی آیت: الیوم اکملت لکم دینکم۔۔ حلال و حرام کی مزید وضاحت، ساری پاکیزہ چیزیں حلال ہیں (احل لکم الطیبات)، اہل کتاب کے ذبیحہ اور نکاح کی اجازت (وطعام الذین اوتو الکتاب حل لکم و طعامکم حل لھم)، غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے کے احکامات۔

عہد اور حلف کی پاسداری

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔

اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو۔(مائدہ۔1)

عقود عقد کی جمع ہے جس کا اطلاق پختہ عہدوپیمان پر ہوتا ہے۔ یہاں اس سے احکام الٰہی (فرائض، حلال حرام کی پابندی) بھی مراد ہیں اور وہ عہدوپیماں اور معاہدے بھی شامل ہیں جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔ دونوں کا ایفا ضروری ہے۔ یعنی ان حدودوقیود کی پابندی کرو جو اس سورۃ میں تم پر عائد کی جارہی ہیں، اور جو بالعموم اللہ کے دین و شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔

ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا! آپ مجھے خاص نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: جب تو قرآن میں لفظ آیت

یاایھاالذین آمنو۔ اے ایمان والو۔۔۔ سن لے تو فوراً کان لگا کر دل سے متوجہ ہو جا، کیونکہ اس کے بعد کسی نہ کسی بھلائی کا حکم ہوگا یا کسی نہ کسی برائی سے ممانعت ہوگی۔ (ابن ابی حاتم)

حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ عہد کو پورا کرنے میں اللہ کے حلال کو حلال جاننا، اس کے حرام کو حرام جاننا، اس کے فرائض کی پابندی کرنا، اس کی حدبندی کی نگہداشت کرنا بھی ہے، کسی بات کا خلاف نہ کرو، حد کو نہ توڑو، کسی حرام کام کو نہ کرو۔ یہ آیت پڑھو: وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔۔۔ (رعد۔25)۔ (بحوالہ ابن کثیر)

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ کہ معاہدات کی تمام اقسام اس آیت میں داخل ہیں۔ پھر اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں کہ ایک وہ معاہدہ ہے جو انسان کا اللہ رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان، اطاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد۔ دوسرا وہ معاہدہ ہے جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف لے کر کوئی چیز (ذمہ داری) اپنے ذمہ لازم کرلے، تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکمتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حلال اور حرام جانور

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ۔۔۔ (مائدہ۔1)

تمہارے لئے چرنے والے جانور حلال کئے گئے ہیں سوائے ان کے جن کا ذکر تم پر آگے کیا جائے گا۔۔۔ (مائدہ۔1)

اسلام کا فلسفہ حلال وحرام

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام وحلال کی جو قیود شریعت کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں ان کی اصل بنیاد ان اشیاء کے طبی فوائد یا نقصانات نہیں ہوتے، بلکہ ان کے اخلاقی فوائد و نقصانات ہوتے ہیں۔ جہاں تک طبی فوائد و نقصانات کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادی اشیاء میں سے کونسی چیزیں اس کے جسم کیلئے صحت مند ہیں اور کونسی مضر صحت۔ شریعت ان امور میں اس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہوتا تو سب سے پہلے مہلک زہر سنکھیا کو حرام کیا ہوتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہی ہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ جن چیزوں کو شریعت نے حرام کیا ہے انہیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا برا اثر پڑتا ہے، یا وہ طہارت کے خلاف ہیں، یا ان کا تعلق کسی فاسد عقیدہ سے ہے۔ برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان برائیوں میں سے کوئی برائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے ہم کو ان اشیاء کی حرمت کی وجہ کیوں نہیں بتائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی حرمت کی وجوہات کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات کہ خون یا سور یا کسی درندے کا گوشت کھانے سے ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں، اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حرام وحلال کے حدود کی پابندی کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے۔ جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب، اللہ کی کتاب ہے اور رسول، اللہ کا رسول ہے، اور اللہ علیم و حکیم ہے، وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے گا، خواہ ان کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کو لاکھ وجوہات بھی بتا دی جائیں تو وہ پھر بھی متذبذب ہی رہے گا۔

حلال وحرام کی وضاحت

اَنعام (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ اور بہیمہ کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی اکرمؐ نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔

حدیث: عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ: نهى رسول الله ﷺ عن كل ذي ناب من السباع و كل ذي مخلب من الطير۔ رسول اللہؐ نے ہر کچلی والے درندے اور ہر پنجہ (سے شکار کرنے) والے پرندے سے منع فرمایا۔ (مسلم)

سنت میں بیان کردہ اصول کی رو سے جو جانور ذوناب (کچلیوں والے جانور) جن کو عموماً درندے کہا جاتا ہے جیسے بھیڑیا، کتا وغیرہ اور جو پرندے ذومخلب یعنی وہ پرندے جو پنجے سے شکار کرتے ہیں یا مردار خور ہوتے ہیں جیسے شکاری پرندے مثلاً عقاب، باز وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ انکی مزید تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ حلال و حرام کی کچھ تفصیل سورۃ البقرہ آیت 173 میں بھی گذر چکی ہے (انما حرم علیکم المیتہ والدم ولحم الخنزیر۔۔)

اسلام میں مذہبی رواداری اور دوسرے مذاہب کا احترام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (مائدہ۔2)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم جانوروں کا شکار کر سکتے ہو اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

سورۃ مائدہ کی پہلی آیت میں عہد و حلف کے پورا کرنے کی تاکید تھی۔ ان معاہدات میں سے ایک معاہدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حلال و حرام کی پابندی کی جائے۔ اس دوسری آیت میں اس معاہدہ کی دو اہم دفعات کا بیان ہے۔ ایک شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بےحرمتی سے بچنے کی ہدایت، دوسرے اپنے اور غیر دوست اور دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کی ممانعت۔

شعائر سے کیا مراد ہے؟

شعائر شعیرۃ کی جمع ہے، اس کا مطلب علامت یا نشانی ہے۔ ہر وہ چیز جو کسی مذہب، عقیدہ، فکر یا کسی کمیونٹی کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعار کہلاتی ہے کیونکہ وہ اس کے لیے مذہبی علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ مذہبی لباس، مذہبی

عبادت گاہیں کسی بھی مذہب کا شعار ہوتی ہیں۔ چرچ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ سینا گوگ یہودیت کا شعار ہے۔ چوٹی، زنار اور مندر ہندومت کے شعائر ہیں۔ پگڑی، کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ یہ سب مذاہب اپنے شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسلام کسی بھی مذہب یا اس کے شعائر کی توہین سے منع کرتا ہے(ولا تسبّو الذین یدعون من دون اللہ۔۔)۔

اسی طرح کسی بھی ملک کے سرکاری جھنڈے، پارلیمنٹ، سرکاری دفاتر، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور آفیشیل لوگوز حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے ماتحت لوگوں سے بلکہ جہاں تک ان کا بس چلے سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مذہب یا ملک کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس مذہب یا ملک کے خلاف دشمنی رکھتا ہے۔ اور ایسا کوئی فعل اس مذہب، ملک یا کلچر کے خلاف بغاوت کا ہم معنی ہے۔

یادرکھنا چاہیے کہ اسلام میں شعائر کے احترام کا یہ حکم اس زمانہ میں دیا گیا تھا جب تقریباً پورے عرب پر اسلامی قبضہ ہو گیا تھا۔ اور مشرکین مکہ کو رسول کریم ﷺ نے بغیر کسی انتقام کے آزاد فرما دیا تھا۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے سب کام کرتے رہے یہاں تک کہ اپنے جاہلانہ طرز پر حج وعمرہ کی رسوم بھی ادا کرتے رہے۔ اس وقت بعض صحابہ کرام کے دلوں میں واقعہ حدیبیہ کا انتقام لینے کا خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں جائز اور حق طریقہ پر عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، ہم ان کو ناجائز اور غلط طریق کے عمرہ وحج کو کیوں آزاد چھوڑیں، ان پر حملہ کریں، ان کے جانور چھین لیں اور ان کو ختم کردیں، اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمہارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ اللہ کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انہیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے یہ جانور لیے جارہے ہوں ان پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

شعائر کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا کیونکہ اس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ اور انتقام کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

اسلام کا یہ حکم بذات خود مذہبی برداشت اور مذہبی رواداری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

شعائر اللہ سے مراد حرمات اللہ ہیں یعنی وہ چیزیں جن کی تعظیم وحرمت اللہ نے مقرر فرمائی ہے۔ اس آیت میں چند مخصوص شعائر جن کا تعلق مناسک حج سے ہے ان کا ذکر ہے۔ بعض نے اسے عام رکھا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی نسبت

دین کی طرف ہے اس کا احترام کیا جائے۔ اسلامی شعائر سے بالعموم وہ تمام نشانیاں مراد ہیں جو دین اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً کعبۃ اللہ، مسجد حرام، مسجد نبوی وروضہ اقدسؐ، مسجد اقصیٰ، حجر اسود، منبر و محراب، عام مساجد، مصحف قرآن، کتب حدیث وغیرہ۔

اچھے کاموں میں باہمی تعاون،

گناہ اور سرکشی میں عدم تعاون

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ۔ (مائدہ۔2)

نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم زیادتی میں مدد نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو نیکی اور اچھائی کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کی تاکید فرمارہے ہیں۔

بر کہتے ہیں نیکیاں کرنے کو اور تقویٰ کہتے ہیں برائیوں کے چھوڑنے کو۔ اور انہیں منع فرماتا ہے گناہوں اور ناجائز کاموں پر کسی کی مدد کرنے کو۔ ابن جریر فرماتے ہیں جس کام کے کرنے کا اللہ کا حکم ہو اور انسان اسے نہ کرے، یہ اثم ہے اور دین میں جو حدیں اللہ نے مقرر کر دی ہیں جو فرائض اپنے یا دوسروں کے بارے میں مقرر فرمائے ہیں، ان سے آگے نکل جانا عدوان ہے۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: انصر اخاک ظالماً او مظلوماً۔ کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم ہو تو سوال ہوا کہ یا رسول اللہؐ! مظلوم ہونے کی صورت میں مدد کرنا ٹھیک ہے لیکن ظالم ہونے کی صورت میں کیسے مدد کریں؟ فرمایا اسے ظلم نہ کرنے دو، ظلم سے روک لو، یہی اس وقت کی اس کی مدد ہے۔ (بخاری و مسلم)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الدال علی الخیر کفاعلہ ۔ جو شخص کسی بھلی بات کی دوسرے کو ہدایت کرے وہ اس بھلائی کے کرنے والے جیسا ہی ہے۔ (مسند بزار) امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے کہ جو شخص ہدایت کی طرف لوگوں کو بلائے، اسے ان تمام کے برابر ثواب ملے گا جو قیامت تک آئیں گے اور اس کی تابعداری کریں گے اور ان کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہیں کی جائے گی اور جو شخص کسی کو برائی یا گناہ کی طرف راغب کرے تو قیامت تک جتنے لوگ اس گناہ یا برائی کو کریں گے، ان سب کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور ان کے گناہ میں کوئی کمی بھی نہیں کی جائے گی۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی ظالم کے ساتھ جائے تا کہ اس کی اعانت و امداد کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ ظالم ہے وہ یقیناً ملت اسلام سے خارج تصوّر ہو گا۔ (طبرانی)

اسی حدیث کی بنیاد پر سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی حکومت میں کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے کیونکہ یہ ایک طرح سے ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہؒ کو دو دفعہ قاضی کے منصب کی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید ان کو ادراک تھا کہ ان کا نام استعمال کر کے ان سے غلط فیصلے کروائے جائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ: فلن اکون ظهيراً للمجرمين۔ یعنی میں کسی طرح بھی ظالموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے قلم، دوات کو درست کیا ہے۔ پھر ان سب کو بلا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰىۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ: یہ ہے قرآن و سنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی، انصاف، ہمدردی اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بنا کر کھڑا کر دیا ہے اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو سپاہی بنا دیا ہے۔ آج بھی جب کسی ملک میں جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری دفاع کے محکمے قائم کر کے قوم کے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ تربیت دی جاتی ہے تا کہ مشکل وقت میں وہ اپنا اور دوسروں کا دفاع کر سکے۔ اسلام نے اسی اصول کی بنیاد پر تمام لوگوں کو خیر کا داعی اور شر کو روکنے والا اسکاؤٹ بنا دیا ہے۔ اگر معاشرے کا ہر فرد خیر کو پھیلانے والا بن جائے اور مثبت انداز میں شر کو روکنے والا بن جائے تو اصلاح معاشرہ کی یہ تحریک پورے معاشرے کو درست سمت کی طرف لے جا سکتی ہے ورنہ بیچاری پولیس کہاں کہاں تک جرائم کی روک تھام کر سکتی ہے اگر ساری قوم حلال و حرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت چوری، ڈاکہ، قتل و غارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جا رہی ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان جرائم کو روکنے میں پبلک اپنی ذمہ داریاں اور فرائض پورے نہیں کر رہی۔ عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسداد جرائم صرف حکومت کا کام ہے۔ وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کی رو سے انسداد جرائم کے لئے سچی شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو از روئے قرآن سخت گناہ ہے۔

دنیاوی امور میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے۔ یہ تعاون صرف دینی امور میں ہی نہیں دنیاوی امور میں بھی ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضرورت زندگی کو تنہا حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کا محتاج ہے۔ ان کے باہمی تعاون وتناصر سے ہی سارا دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو پیدائش سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل میں ایک انسان دوسرے انسان کا محتاج ہے بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

حلال اور حرام کے احکامات کی مزید تفصیل

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُ بِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰ لِكُمْ فِسْقٌ۔۔۔ (مائدہ۔3)

تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں۔ مگر جس کو تم (مرنے سے پہلے) ذبح کر لو اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے اور یہ بھی کہ پاسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔۔۔۔(مائدہ۔3)

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ استثناء تمام مذکورہ جانوروں کے لیے ہے یعنی منحقه، موقوذة، متردية، نطيحة اور درندوں کا کھایا ہوا، اگر تم انہیں اس حال میں پالو کہ ان میں روح زندگی یعنی زندگی کے آثار موجود ہوں اور پھر تم انہیں شرعی طریقے سے ذبح کر لو تو تمہارے لیے ان کا کھانا حلال ہو گا۔

زندگی کی علامت یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت کچھ نہ کچھ اضطراب وحرکت موجود ہو۔ اگر ذبح کرتے وقت کسی قسم کے آثار زندگی موجود نہ ہوں تو سمجھ لو یہ مردہ ہے۔

ذبح کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ اور تکبیر پڑھ کر تیز دھار آلے سے اس طرح ذبح کیا جائے کہ رگیں کٹ جائیں۔ اگر ذبح کرنے والا مسلمان ہے اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ، تکبیر پڑھنا بھول بھی جائے تو بھی ذبح شدہ جانور حلال ہے۔ ذبح کے علاوہ نحر بھی مشروع ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے جانور کے لبے پر تیز دھار آلہ مارا جاتا ہے جس

سے نرخرہ اور خون کی خاص رگیں کٹ جاتی ہے اور سارا خون بہہ جاتا ہے۔ اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے۔ بندوق کے شکار کا یہ حکم ہے کہ اگر زخمی جانور کو مرنے سے پہلے باقاعدہ ذبح کر لیا گیا تو وہ حلال ہے۔

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: مشرکین اپنے بتوں کے قریب پتھر یا کوئی چیز نصب کر کے ایک خاص جگہ بناتے تھے جسے نصب تھان یا آستانہ کہتے تھے۔ اسی پر وہ بتوں کے نام نذر کیے گئے جانوروں کو ذبح کرتے تھے اور ان کا خون بتوں پر چھڑکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آستانوں، مقبروں پر جہاں لوگ طلب حاجات کے لیے جاتے ہیں اور وہاں مدفون افراد کی خوشنودی کے لیے یا ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں وہ بھی وماذبح علی النصب میں داخل ہیں۔

لیکن اگر جانور قربان کرنے والے کی نیت اللہ کی رضا ہو اور میت کو یا اپنے مرحومین کو ایصال ثواب مقصود ہو اور جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ مدارس، رفاعی اداروں، یتیم خانوں یا لنگر خانوں میں لوگ صدقہ یا قربانی کے جانور ذبح کرتے ہیں۔ جس میں وہاں ذبح کرنے کا مقصد غرباء و مساکین میں گوشت تقسیم کرنا ہوتا ہے نہ کہ غیر اللہ کی خوشنودی۔

البتہ حالت اضطرار میں مذکورہ بالا تمام محرمات کے کھانے کی اجازت ہے بشرطیکہ مقصد اللہ کی نافرمانی اور حد تجاوز کرنا نہ ہو، صرف جان بچانا مطلوب ہو۔

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ: استقسام کے معنی طلب قسمت ہیں یعنی تیروں سے قسمت طلب کرنا۔ اس کو انگریزی میں گیم آف چانس کہا جاتا ہے۔ اس کے دو معنی کیے گئے ہیں ایک تیروں کے ذریعے تقسیم کرنا دوسرے تیروں کے ذریعہ قسمت معلوم کرنا مثلاً فال نکالنا وغیرہ۔ پہلے معنی کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جوئے وغیرہ میں ذبح شدہ جانور کی تقسیم کے لیے یہ تیر ہوتے تھے جس میں کسی کو کچھ مل جاتا، کوئی محروم رہ جاتا۔ دوسرے معنی کی رو سے کہا گیا ہے کہ ازلام سے تیر مراد ہیں جن سے وہ کسی کام کا آغاز کرتے وقت فال لیا کرتے تھے۔ انہوں نے تین قسم کے تیر بنا رکھتے تھے۔ ایک افعل (کر) دوسرے میں لا تفعل (نہ کر) اور تیسرے میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ افعل والا تیر نکل آتا تو وہ کام کر لیا جاتا، لا تفعل والا نکلتا تو نہ کرتے اور تیسرا تیر نکل آتا تو پھر دوبارہ فال نکالتے۔ یہ بھی گویا کہانت، لایعنی کام اور اٹکل پچوں بات تھی، استمداد بغیر اللہ کی ایک شکل تھی، اس لیے اسے بھی ممنوع کیا گیا۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ علم نجوم یا جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام

کے حکم میں ہیں۔ استقسام بالازلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے، یہ بھی بنص قرآن حرام ہے جس کو قرآن کریم نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیر، مجاہد اور شعبی نے فرمایا کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ازلام کے حکم میں ہیں (مظہری)۔

استخارہ کا حکم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تیروں سے قسمت معلوم کرنا حرام ہے، ایسا کام کا کرنا فسق، گمراہی، جہالت اور شرک ہے۔ اس کے بجائے اہل ایمان کو حکم ہوا کہ جب تمہیں اپنے کسی کام میں تردد ہو تو تم اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرلو، اس کی عبادت کرکے اس سے بھلائی طلب کرو۔ مسند احمد، بخاری اور سنن میں مروی ہے حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ جس طرح قرآن کی سورتیں سکھاتے تھے، اسی طرح ہمارے کاموں میں استخارہ کی تعلیم بھی فرماتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سے کسی کو کوئی اہم کام آپڑے تو اسے چاہئے کہ دو رکعت نفل نماز نفل پڑھ کر یہ دعا پڑھے:

اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدرولا اقدروتعلم ولا اعلم و انت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر--- خیرلی فی دینی ودنیای ومعاشی وعاقبتہ امری فقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ وان کنت تعلم انہ شرلی فی دینی ودنیای ومعاشی وعاقبتہ امری فاصرفہ عنی و اقدرلی الخیرحیث کان ثم رضنی بہ۔ (مسند احمد)

یعنی اے اللہ میں تجھ سے تیرے علم کے ذریعہ بھلائی طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے وسیلے سے تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں اور تجھ سے تیرے بڑے فضل کا طالب ہوں، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے اور میں محض مجبور ہوں، تو تمام علم والا ہے اور میں مطلق بے علم ہوں، تو ہی تمام غیب کو بخوبی جاننے والا ہے، اے میرے اللہ اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لئے دین دنیا میں آغاز و انجام کے اعتبار سے بہتر ہی بہتر ہے تو اسے میرے لئے مقدر کردے اور اسے میرے لئے آسان بھی کردے اور اس میں مجھے ہر طرح کی برکتیں عطا فرما اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لئے دین کی دنیا زندگی اور انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے اور میرے لئے خیر و برکت جہاں کہیں ہو مقرر کردے پھر مجھے اسی سے راضی و ضامند کردے۔ دعا کے یہ الفاظ مسند احمد میں ہیں۔

اس دعا استخارہ میں ھذا الامر جہاں ہے وہاں اپنے کام کا نام لے مثلاً نکاح ہو تو ھذا النکاح، سفر میں ہو تو ھذا السفر، بزنس میں ہو تو ھذا التجارۃ وغیرہ۔

تکمیلِ دین

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَ تْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (مائدہ۔3)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔

آیت کی خاص شان نزول: یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے دن یعنی یوم عرفہ میں رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول کی خاص شان یہ ہے کہ **عرفہ** کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سیّد الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ **جمعہ** کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام نزول **میدان عرفات** ہے ۔ میدان عرفات میں بھی **جبل رحمت** کے نیچے نازل ہوئی جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت **عصر** کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے اور خصوصاً یوم جمعہ میں یہ وقت **قبولیت دعا کی گھڑی** ہے بلکہ عرفہ کے روز بالخصوص دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔ پھر حج کا عظیم الشان اجتماع، جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ شریک ہیں۔ رحمۃ للعالمین صحابہ کرامؓ کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے موجود ہیں اور حج کے رکن اعظم یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔ ان **فضائل و برکات** اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول کریم ﷺ پر نازل ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً **قرآن کی آخری آیت** ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں۔ جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے، کیونکہ 10 ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور 11 ہجری کی بارہویں ربیع الاول کو آنحضرتؐ کی رحلت ہو گئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملت اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے زمانہ سے جو **دین حق** اور نعمت الٰہیہ کا نزول شروع ہوا تھا اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولاد آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی امت کو عطا کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم الشان نعمت کی تکمیل کی خوشی میں مسلمان عید مناتے ہیں یعنی **عید الاضحیٰ**۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ اور آپ کی امت یعنی امّت مسلمہ کو تین خصوصی انعام عطا فرمانے کی بشارت دی ہے۔ایک تکمیل دین، دوسرے اتمام نعمت، تیسرے دین اسلام کا اس امت کے لئے انتخاب۔

اس آیت نے یہ بتلادیا کہ امت مسلمہ کے لئے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے۔اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور جہت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نبی آئے گا نہ نیا دین آئے گا اور نہ ہی دین اسلام میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس آیت کو سن کر خوش ہو رہے تھے کہ دین مکمل ہو گیا مگر حضرت عمر فاروق ؓ پر گریہ طاری تھا۔رسول اللہ ﷺ نے اس رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب آپؐ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے کیونکہ تکمیل دین کے ساتھ فریضہ نبوت کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی۔(تفسیر ابن کثیر و بحر محیط)

ساری پاکیزہ چیزیں حلال ہیں

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔۔۔ (مائدہ۔4)

لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان کے لئے کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں۔(ان سے) کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں۔(مائدہ۔4)

ہر چیز حلال ہے سوائے اس کے جس کو حرام قرار دیا گیا

اس آیت میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔مذہبی ذہن کے لوگ اکثر دنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیاء اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور ہر کام اور ہر چیز کو اس شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنوع تو نہیں۔یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انہیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل الٹ گیا۔قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے بجز اس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے بجز اس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی جائے۔یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔پہلے حلت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے

سواساری دنیااس کے لیے حرام تھی۔اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کرکے ساری دنیا اس کے لیے حلال ہوگئی۔

حلال کے ساتھ پاک وطیب کی قید بھی لگائی گئی۔اب رہا یہ سوال کہ اشیاء کے پاک یا طیب ہونے کا تعین کس طرح ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت محسوس کرے، یا جنہیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

اہل کتاب کا کھانا حلال ہے

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّـكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ۔

(مائدہ۔5)

آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لیے۔۔۔(مائدہ۔5)

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ: آج تمہارے لئے حلال ہوئیں سب صاف ستھری چیزیں۔آج سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئی ہیں یعنی حجۃ الوداع 10 ھ کا یوم عرفہ۔مطلب یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے لئے دین مکمل کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تم پر مکمل ہوگئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ چیزیں جو پہلے بھی تمہارے لئے حلال تھیں، دائمی طور پر حلال رکھی گئیں اور ان کے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوا کیونکہ سلسلہ وحی ختم ہونے والا ہے۔

حلال و حرام کے بیان کے بعد بطور خلاصہ فرمایا کہ تمام پاکیزہ چیزیں حلال ہیں۔لغت میں طیبات صاف ستھری چیزوں کو کہا جاتا ہے۔اس لئے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں بالخصوص گوشت جو انسان کے بدن کا اہم جزو بنتا ہے اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں داخل نہ ہو جو اس کیلئے جسمانی یا روحانی طور پر مضر ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے درندوں یا جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ جو مل جائے کھا جائے۔انسان کو خوراک کے حوالے سے کچھ حدود و قیود کا پابند کیا گیا ہے کیونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّـكُمْ‌ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ: پھر اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے کھانے بشمول ان کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کی حلت بیان فرمائی۔ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اہل کتاب کا کھانا ہمارے لئے حلال ہے۔ (ابن کثیرؒ)

اہل کتاب سے کون مراد ہیں؟

اہل کتاب سے مراد وہ مذاہب ہیں جو آسمانی ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں اور آسمانی کتابوں تورات، انجیل کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا انھیں کی تحریفات اور فاسد عقائد کی بھی نشاندھی فرمائی مثلاًیحرفون الکلم عن مواضعہ۔ دوسرے مقام پر فرمایا: لقد کفر الذین قالو ان اللہ ثالث ثلاثہ۔ اہل کتاب کے ان حقائق وصفات کے باوجود جب قرآن مجید نے ان کو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ بھی اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں چاہے وہ اپنے مذہب پر کلی یا جزوی طور پر عمل پیرا ہوں یا رسمی طور پر ہی اپنے مذہب سے جڑے ہوں۔ امام ابو بکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے کی اجازت

اس آیت میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی اجازت ہے جس میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے ان کا اور ان کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ، کوئی اجنبیت یا چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ کھاسکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو وہ ہمارے لئے جائز نہیں مثلاً اگر دستر خوان پر شراب یا سور یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان اشیاء کے کھانے میں شریک نہیں ہوسکتے۔ اہل کتاب کے سوا دوسرے عام غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ ہم ان کے ساتھ اکھٹے بیٹھ کر کھا پی سکتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ صرف اہل کتاب کا جائز ہے باقی غیر مسلموں کا ذبیحہ ہمارے لئے جائز نہیں البتہ ان کی طرف سے پیش کردہ حلال چیزوں کو استعمال کرنے میں یا ان کو اپنے پاس کھانے کی دعوت پر بلانے میں کوئی حرج نہیں۔

دوسرے مذاہب کے ساتھ معاشرتی تعلقات میں لچک

یہاں اسلام کی رواداری کا ایک نمونہ سامنے آتا ہے۔اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ میں لچک بتائی جارہی ہے۔اسلام غیر مسلموں کو صرف مذہبی آزادی دے کر معاشرے کے اندر الگ تھلگ نہیں کر دیتا بلکہ وہ انہیں اجتماعی شرکت اور محبت کا احساس بھی دیتا ہے اور انہیں اسلامی معاشرے میں ضم ہونے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے ۔اسلام غیر مسلموں کا کھانا اہل اسلام کے لئے حلال قرار دیتا ہے۔اہل اسلام کے لئے یہ بھی جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اپنا کھانا غیر مسلموں کو پیش کرسکتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں' ایک دوسرے کے مہمان بن سکیں اور باہم مل کر کھاپی سکیں تاکہ معاشرے کے اندر امن ومحبت اور رواداری کی فضا وجود میں آئے۔یہ ایک ایسی رواداری ہے جو اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے ہاں شاذونادر ہی ملتی ہوگی۔معلوم ہوا کہ یہ صرف اسلام ہی ہے جو ایک عالمی معاشرہ قائم کرنے کے اقدامات کرتا ہے۔

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (مائدہ۔5)

اور (اسی طرح) پاک دامن ایماندار عورتیں اور ان لوگوں میں سے پاک دامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (تمہارے لئے حلال ہیں) جب کہ تم انہیں ان کے مَہر ادا کر دو، (مگر شرط) یہ کہ تم (انہیں) قیدِ نکاح میں لانے والے (عفت شعار) بنو نہ کہ (محض ہوس رانی کی خاطر) اِعلانیہ بدکاری کرنے والے اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والے، اور جو شخص (اَحکامِ الٰہی پر) ایمان (لانے) سے انکار کرے تو اس کا سارا عمل برباد ہوگیا اور وہ آخرت میں (بھی) نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس آیت میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔اس حکم کی تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔فقہاء حنفیہ کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا درست ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔سعید بن المسیبؓ اور حسن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے لہٰذا اسلامی ملک یا غیر اسلامی ملک میں

فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد اچھے کردار کی حامل عورتیں ہیں۔ آیت کے لفظ وَالْمُحْصَنٰتُ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے بعد اسی آیت کے آخر میں یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اس اجازت سے فائدہ اٹھائے وہ اپنے ایمان واخلاق سے ہوشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد اور اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا اخلاق ومعاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

ذبیحہ اور نکاح کی اجازت میں صرف اہل کتاب کی تخصیص کیوں؟

قرآن نے اہل کتاب کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک وہی ہے جو اسلام کا طریقہ ہے۔ اگر اس کے خلاف ان کے عوام میں کوئی چیز پائی جاتی ہے تو وہ بعد کی پیداوار ہے ان کا اصل مذہب نہیں۔

چھٹا رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ--- (مائدہ۔6)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

کھانے کی پاکیزگی کے بعد جسم کی پاکیزگی کے احکامات، اسلامی طہارت یعنی وضو، غسل، تیمّم کے احکامات، ان کا مسنون طریقہ، اللہ تمہارے اوپر تنگی اور مشکل نہیں چاہتے (مایرید اللہ لیجعل علیکم من حرج)، اللہ ہمارے لئے پاکیزگی، اتمام نعمت، شکر گذاری چاہتے ہیں، (یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم ولعلکم تشکرون)، اللہ کی نعمتوں کی قدر کرو، اللہ کے ساتھ عہد ومیثاق (ومیثاقہ الذی واثقکم بہ)، سمع واطاعت کا درس (سمعنا واطعنا)، شہادت حق یعنی حق وانصاف کی گواہی، کسی کی دشمنی میں عدل کی راہ سے نہ ہٹو (ولا یجرمنّکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلو)، عدل وانصاف کو قائم کرو (اعدلو ھو اقرب للتقوٰی)، سچی گواہی کی تاکید، ووٹ بھی ایک گواہی ہے، جھوٹی گواہی میں کونسی چیزیں داخل ہیں، جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹی سندیں، جھوٹی سفارش، ایمان و عمل صالح پر اجر عظیم کا وعدہ، اللہ پر توکل اور بھروسہ (وعلیٰ اللہ فلیتوکّل المومنون)۔

کھانے کی پاکیزگی کے بعد جسم کی پاکیزگی اور طہارت کا بیان

دین اسلام عبادات اور معاملات دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلامی طہارت: وضو، غسل، تیمّم کے احکامات

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ؕ وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا ؕ وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْهُ ؕ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔(مائدہ۔6)

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ دھو لو اور ہاتھ کہنیوں تک اور اپنے سروں پر مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لو اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا لو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا کوئی تم میں سے جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں کے پاس گئے ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرتے ہوئے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو، اللہ تم پر تنگی کرنا نہیں چاہتا لیکن تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے اور تاکہ اپنا احسان تم پر پورا کرے تاکہ تم شکر کرو۔

وضو اور تیمّم کے احکامات

شان نزول: بخاری میں اس آیت کی شان نزول کے بارے میں آتا ہے کہ ایک سفر میں بیداء کے مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا جس کی وجہ سے وہاں پر رکنا پڑا رہنا پڑا۔ صبح کی نماز کے لئے لوگوں کے پاس پانی نہ تھا اور تلاش ہوئی تو پانی دستیاب بھی نہیں ہوا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے آیت سن کر کہا اے آل ابی بکر! تمہاری وجہ سے اللہ نے لوگوں کے لئے برکتیں نازل فرمائی ہیں یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے۔(تم لوگوں کے لئے سراپا برکت ہو)۔(بخاری)

نبی اکرم ﷺ نے اس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ دھونے کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور کان چونکہ سر کا ایک حصہ ہیں اس لیے سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصوں کا مسح بھی شامل ہے۔ نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہئیں تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو وہ خود پہلے پاک ہو جائیں۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: لا یقبل اللہ صلوۃ بغیر طھور ولا صدقتہ من غلول۔
اللہ تعالیٰ بغیر طہارت کے نماز کو اور چوری کے مال میں سے صدقہ کو قبول نہیں فرماتے۔(ترمذی)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مفتاح الجنۃ الصلوٰۃ و مفتاح الصلوٰۃ الطہور۔
جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہارت ہے۔ (مسند احمد)

حدیث: فتح مکہ والے دن آپؐ نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا اور اسی ایک وضو سے کئی نمازیں ادا کیں، یہ دیکھ کر حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آج آپ نے وہ کام کیا جو آج سے پہلے نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں میں نے بھول کر ایسا نہیں کیا بلکہ جان بوجھ کر قصداً یہ کیا ہے۔ (مسلم)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الطُّهُورُ شَطْرُ الإِيمَانِ، والحَمْدُ للهِ تَمْلأُ المِيزانَ، وسُبْحَانَ اللهِ والحَمْدُ للهِ تَمْلآنِ – أَو تَمْلأُ – مَا بَيْنَ السَّمَاءِ والأَرْضِ، وَالصَّلاةُ نُورٌ، والصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ، وَالقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَو عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَو مُوبِقُهَا.
طہارت (وضو، غسل) آدھا ایمان ہے، اور (الحمد للہ) پورے میزان کو بھر دیتا ہے، اور (سبحان اللہ و الحمد للہ) آسمان اور زمین کے درمیان موجود سارے خلا کو بھر دیتا ہے، اور نماز نور ہے، اور صدقہ دلیل ہے، اور صبر روشنی ہے، اور قرآن آپ کے حق میں یا آپ کے خلاف حجت ہے، اور تمام لوگ صبح کے وقت اپنے گھروں سے نکلتے ہیں، پس اپنے نفس کو بیچتے ہیں یا تو (اعمالِ صالحہ کے ذریعے) اسے جہنم سے آزاد کرا لیتے ہیں، یا پھر (برے اعمال اختیار کر کے) اسے (جہنم کا عذاب مول لیکر) برباد کر ڈالتے ہیں۔ (مسلم)

وضو اور غسل کے احکامات

وضو کا طریقہ:

وضو کے اعضاء کو کم از کم ایک دفعہ اور زیادہ سے زیادہ تین دفعہ دھونا چاہئے۔

تین دفعہ سے زیادہ دھونا پانی کا اسراف ہے اور گناہ ہے۔

وضو کے اعضاء کے دھونے کی ترتیب:

وُضو کیلئے نیّت کرنا سنّت ہے،

دونوں ہاتھ دھونا۔

مِسواک (سنّت ہے)،

کُلی کرنا،

ناک جھاڑنا،

سارا چہرہ دھونا،

داڑھی کا خلال (اگر ضرورت ہو)،

بازو کہنیوں سمیت دھونا،

چوتھائی سر کا مسح،

دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا۔

دعاوضوسنّت ہے

خلاصہ کلام:

قرآن میں وضو، غسل اور تیمم کا اتنے اہتمام سے ذکر اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اسلام میں نماز کی کتنی اہمیت ہے۔ غسل، وضو کیلیئے پانی نہ ملے تو تیمّم کر لو۔ اسی طرح صلوٰۃ الخوف، صلوٰۃ المریض کے احکامات بذات خود اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام میں نماز کی کتنی اہمیت ہے۔ اسلام مشکل اوقات بھی نماز کو جان بوجھ کر چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ دن میں پانچ بار بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب سے ہمکلام ہو۔ نماز نور اور روشنی ہے، نماز بندہ مومن کی معراج ہے، جسم کی طہارت ہے، دل اور روح کا سکون ہے، آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہے، اللہ کی رضا ہے، قبر کی ظلمت میں چراغ ہے، قیامت کے دن سرکار دوعالمؐ کی شفا ہے۔

نماز کی اہمیت پر مولانا رومیؒ کی حکایت: چراغ ابلیس

اللہ کی نعمتوں کی قدر کرو

سمع واطاعت کا جذبہ

وَاذْكُرُوْ انِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙاِذْقُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۙوَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (مائدہ۔7)

اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد وپیمان کو نہ بھولو جو اُس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی" اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔

شہادت حق: ہمیشہ حق کی گواہی دو

اس آیت میں امت مسلمہ کیلیئے ایک عہد الٰہی کا ذکر ہے۔ اس کو عام الفاظ میں شہادت حق یا سچی گواہی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ بات ہے کہ یہ امت پوری انسانیت کے لئے عدل وانصاف کی نگران ہو گی۔ ایسا انصاف کہ اس کے ترازو کا کوئی پلڑا دوستی اور دشمنی کی وجہ سے جھک نہ جائے، اس پر رشتہ داری اور خواہشات نفسانیہ کے اثرات بھی نہ ہوں اور نہ وہ کسی مصلحت سے متاثر ہو۔ یہ عدل صرف ذات باری کی رضا کے لئے ہو اور اس میں انصاف کرنے والا موثرات دنیا

میں سے کسی موثر سے اثر نہ لے اور یہ انصاف اس شعور کے تحت ہو کہ اللہ رقیب اور نگہبان ہے اور خفیہ ترین گوشوں سے باخبر ہے۔

اس حق کی گواہی کی مزید وضاحت اگلی آیت کے اندر بیان کی جارہی ہے:

کسی کی دشمنی میں عدل کی راہ سے نہ ہٹو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ انصاف کرو کہ یہی بات تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ سورۃ المائدۃ۔8

حق اور سچ کی گواہی

جس طرح اسلام نے انسانی مساوات کا درس دیا ہے اسی طرح انسانوں کے درمیان ہر معاملے میں انصاف کرنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ اور اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ خواہ کسی معاملے میں تمھیں نقصان اٹھانا پڑے لیکن ہمیشہ سچی گواہی، انصاف اور راستی کو ہی اختیار کرو۔ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل وانصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہیے اور نہ کسی دشمنی وعداوت سے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلو تہی نہ کی جائے۔ تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ قرآن کریم نے تاکید فرمائی ہے کہ لوگ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ برتیں۔ولا تکتموا الشھادۃ۔۔۔ یعنی گواہی کو ہرگز نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ قرآن کریم نے جہاں سچی گواہی دینے کو لازم وواجب قرار دیا، وہیں یہ بھی ارشاد فرمایا: ولا یضار کاتب ولا شھید۔ یعنی معاملہ کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

آج کی عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدمات کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ سچے گواہ شاذ و نادر کہیں ملتے ہیں۔ سمجھ دار شریف آدمی جہاں کوئی واقعہ دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آجائے۔ پولیس ادھر ادھر کے گواہوں سے خانہ پری کرتی ہے اور نتیجہ اس کا وہی ہو سکتا ہے جو رات ودن مشاہدہ میں آرہا ہے کہ زیادہ تر مقدمات میں حق وانصاف پر فیصلہ نہیں ہو سکتا اور عدالتیں بھی مجبور ہیں کیونکہ جیسی شہادتیں ان کے پاس پہنچتی ہیں انہیں کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی کہ گواہی کو نہ چھپایا جائے اور گواہوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ کسی بھی سوشل جسٹس سسٹم میں یہ دونوں چیزیں انتہائی ضروری ہیں۔

سچی گواہی میں کون کون سی چیزیں داخل ہیں؟

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچی گواہی صرف عدالتوں میں دی جاتی ہے مگر قرآن وسنت کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ بے شمار مواقع پر سچی گواہی دینا ضروری ہوتی ہے مثلاً کسی بیمار کو میڈیکل سرٹیفکیٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں یہ بھی ایک شہادت ہے لہٰذا اگر اس میں حقیقت کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہو گیا۔ امتحانات کے نمبر، سند و سرٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں۔ اسی طرح امتحانات میں طلباء کے پرچوں پر مارکنگ بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان بوجھ کر یا لاپرواہی سے نمبروں میں کمی بیشی کر دی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے اور حرام اور سخت گناہ ہے۔ کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلباء کو ڈگری یا سرٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سرٹیفکیٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہو جاتے ہیں۔

ووٹ بھی ایک گواہی ہے

اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت اور گواہی ہے۔ جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس بات کی گواہی دی جاتی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت وامانت کے اعتبار سے عوام کا نمائندہ بننے کا اہل ہے۔ اب غور کیجئے کہ اتنے اہم معاملے کو آج کل محض ہار جیت کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ناپائدار دوستوں اور ذلیل وعدوں کے بھروسہ پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نا اہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر سخت گناہگار بن رہے ہیں۔

الیکشن میں ووٹ دینے کی ازروئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے کہ فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ ارشاد ہے: ومن يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها۔۔۔ یعنی جو شخص اچھی اور سچی سفارش کرے گا، تو جس کے حق میں سفارش کی ہے اس کے نیک عمل کا حصہ اس کو بھی ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے، یعنی کسی نا اہل اور برے شخص کو کامیاب بنانے کی سعی کرتا ہے اس کو اس کے برے اعمال کا حصہ ملے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ منتخب شخص دوران مدت جتنے غلط اور ناجائز کام کرے گا، کرپشن کرے گا، ان سب کا وبال ووٹ دینے والے کو بھی پہنچے گا۔ ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بناتا ہے۔ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے

جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح نیک صالح، اہل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب ہے اسی طرح نااہل یا بے دین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔ اس لئے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ جس کو ووٹ دے رہا ہے کیا وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، دیانت دار ہے یا نہیں تاکہ محض غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے ان کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔

ایمان وعمل صالح پر اجر عظیم کا وعدہ

وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ (مائدہ۔9)

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انہیں بڑا اجر ملے گا۔

ایمان ونیک اعمال پر اجر عظیم اور انکار وتکذیب پر عذاب کی وعید۔

اللہ پر توکل اور بھروسہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (مائدہ۔11)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب ایک قوم نے تمہاری طرف (بری نیت کے ساتھ) ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ صاحبان ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اس آیت کی شان نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ مثلاً اس اعرابی کا واقعہ کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر سے واپسی پر ایک درخت کے سائے میں آرام فرما تھے، تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی اس اعرابی نے تلوار پکڑ کر آپؐ پر سونت لی اور کہنے لگا۔ اے محمدؐ! آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ نے بلا تامل فرمایا: اللہ (یعنی اللہ بچائے گا) یہ کہنا تھا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ بعض کہتے ہیں کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نبی کریمؐ اور آپؐ کے اصحاب کے خلاف دھوکا اور فریب سے نقصان پہنچانے کی سازش تیار کی تھی، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بچایا۔

ممکن ہے یہ سارے ہی واقعات اس کا سبب نزول ہوں کیونکہ بعض دفعہ ایک آیت کے نزول کے کئی اسباب وعوامل ہو سکتے ہیں۔(بحوالہ تفسیر ابن کثیر وفتح القدیر)

اللہ کے ساتھ عہد ومیثاق

سورۃ مائدہ کی ساتویں آیت جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد ومیثاق لینے اور ان کے ماننے اور تسلیم کر لینے کا ذکر فرمایا: واذکروا نعمة اللّٰه علیکم ومیثاقه۔۔ یہ میثاق اللہ اور رسول کی اطاعت اور احکام شرعیہ کے اتباع کا میثاق ہے۔ جس کا اصطلاحی عنوان کلمہ لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اور ہر کلمہ گو مسلمان اس میثاق کا پابند ہے۔ دین اسلام اپنی اساس کے اعتبار سے ایک ہی دین ہے جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر مکمل ہوا۔ عہد الٰہی یعنی اللہ کا اپنے بندوں کے ساتھ عہد ومثاق بھی ایک ہی ہے کہ وہ ایمان لائیں، اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھیں صرف اسی کی عبادت کریں، اس کی بندگیوں کے ساتھ اور بندگیاں شامل نہ کریں۔ یہ ایک ایسا میثاق ہے جو انسان کی سمت درست کر دیتا ہے، صحیح نظریات کو متعین کر دیتا ہے، صحیح عبادات، صحیح معاملات کو متعین کر دیتا ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیادوں کی نشاندی کرتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں اس میثاق کے اہم نکات یعنی خاص خاص احکام شرعیہ کا بیان فرمایا ہے جس میں دوست دشمن سب کے لئے عدل وانصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ میثاق خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی لئے اس کو اذکرو نعمۃ اللہ سے شروع کیا گیا ہے۔ آیت مذکورہ کو پھر اسی جملہ: اذکروا نعمت اللّٰه علیکم۔۔ سے شروع کرکے یہ بتلانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اس عہد ومیثاق کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا و آخرت میں سربلندی عطا فرمائی اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد فرمائی اور ان کی کسی سازش اور چال (بشمول حضورؐ کے قتل کی ناپاک سازش) کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آیت میں اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ۔ میں اسی طرف اشارہ ہے یعنی جب ایک قوم نے تمہاری طرف (بری نیت کے ساتھ) ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا۔ (مائدہ۔11)۔ اس آیت میں خاص طور پر اس کا ذکر ہے کہ دشمنوں نے بارہا رسول کریم ﷺ اور مسلمانوں کے مٹا دینے اور قتل وغارت کر دینے کے منصوبے بنائے اور تیاریاں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو خائب وخاسر کر دیا۔

اس آیت میں ایک اشارہ تو یہ ہے کہ یہ انعام خداوندی صرف رسول کریم ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نصرت وامداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو وصفوں کو اختیار کرے گا اس کو بھی ایسی ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت وحمایت ہوگی۔

شاعر نے خوب کہا ہے:

؎ فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کو سابقہ آیات کے ساتھ جوڑا جائے جن میں بدترین دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف کے احکام دئے گئے ہیں تو اس آیت میں اہل اسلام کو یہ بتایا گیا کہ اگر تم تقویٰ کو شعار بنالو اور اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرنے والے رہو تو یہ رواداری اور حسن سلوک تمہارے لئے قطعاً مضر نہیں ہوگا اور دشمنوں کو مخالفت کی جرأت کے بجائے تمہارے قریب لانے اور باہمی خیر سگالی کا سبب بنے گا۔

اس آیت میں یہ بھی سبق ہے کہ تقویٰ اور خوف خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً وباطناً مجبور کر سکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوف خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آج کل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے، وہاں بھی آخر آیت میں واتقوا اللّٰہ فرمایا گیا تھا۔ اور یہاں پھر اس کا اعادہ کیا گیا۔

ساتواں رکوع: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔۔۔ (مائدہ۔12)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

بنی اسرائیل سے میثاق، عہد الٰہی کے اہم نکات: اقامت نماز، ادائے زکوٰۃ، اللہ کو قرض حسنہ، تمام رسولوں پر ایمان اور ان کی تعظیم، میثاق الٰہی کو توڑنے کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دوری، الفاظ کا ہیر پھیر (یحرفون الکلم عن مواضعہ)، اس سب کے باوجود مخالفین و معاندین سے رویہ: فاعف عنھم واصفح، نصاریٰ سے عہد، قرآن کے دو مزید نام: کتاب نور وہدایت، اللہ قرآن کے ذریعے ہدایت اور صراط مستقیم عطا فرماتا ہے: یخرجھم من الظلمٰت الی النّور، چند عقائد باطلہ کا بیان، غلط عقائد و نظریات کی نشاندہی اور اصلاح کی کوشش، رسول اللہؐ کی چند صفات: بشیر ونذیر، فترت وحی کے بعد آخری رسول، اللہ ہر چیز پر قادر ہے: انّ اللہ علیٰ کل شی قدیر۔

بنی اسرائیل سے میثاق

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔ (مائدہ۔12)

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ ناظم مقرر کیے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کی پابندی کروگے اور زکوٰۃ دیتے رہوگے اور میرے سب رسولوں پر ایمان لاؤگے اور ان کی مدد کروگے اور

اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہوگے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور تمہیں باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پھر جو کوئی تم میں سے اس کے بعد انکار کی روش اختیار کرے تو اس نے سیدھے راستے کو گم کر دیا۔ (مائدہ۔12)

نقیب کے معنی نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلہ سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انہیں بے دینی وبداخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ بائبل کی کتاب گنتی میں بارہ سرداروں کا ذکر موجود ہے، مگر قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگران کار کی قرار دیتا ہے۔

جس وقت انصار مدینہ رسول کریم ﷺ کو مدینہ کے لئے دعوت دینے کے لیے حاضر ہوئے اور آپؐ نے ان سے بذریعہ بیعت معاہدہ لیا تو اس معاہدہ میں بھی انصار کے بارہ سرداروں نے ذمہ داری لے کر آنحضرتؐ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی ان میں تین سردار قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے تھے۔ (ابن کثیر)

آیت کے اگلے حصّے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو وہ عہد اور میثاق پورا کرنے کی تاکید کی جو اس نے حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے لیا اور انہیں قیام عدل اور شہادت حق کا حکم دیا اور صراط مستقیم پر چلنے کی تاکید کی تھی۔ انہیں وہ انعامات یاد کرائے جو ان پر ظاہراً و باطناً ہوئے اور بالخصوص یہ بات کہ انہیں راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی تو اب اس مقام پر اس عہد کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اور جس میں وہ ناکام رہے۔ یہ گویا بالواسطہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ تم بھی کہیں بنو اسرائیل کی طرح عہد و میثاق کو پامال کرنا شروع نہ کر دینا۔

آیت میں میثاق کی اہم دفعات بیان کرنے کے بعد بھی یہ بتلادیا کہ اگر تم نے میثاق کی پابندی کی تو اس کی جزاء یہ ہوگی کہ تمہارے پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے اور دائمی راحت وعافیت کی بے مثال جنت میں رکھا جائے گا اور آخر میں یہ بھی بتلادیا کہ ان تمام واضح بیانات وارشادات کے بعد بھی اگر کسی نے کفر و سرکشی اختیار کی تو وہ ایک صاف سیدھی راہ چھوڑ کر اپنے ہاتھوں تباہی کے گڑھے میں جاگرا۔

عہد الٰہی کو توڑنے کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دوری

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (مائدہ۔13)

پھر یہ اُن کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اُس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں، اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً: یعنی ہم نے ان کی بدعہدی اور میثاق کی خلاف ورزی کی سزا کے طور پر ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ اب ان میں کسی چیز کی گنجائش نہ رہی کیونکہ انہوں نے عہد الٰہی کو جان بوجھ کر توڑ دیا تھا، انہوں نے اپنے انبیاء کو ناحق قتل کیا، انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل اور سزائے موت دلوانے کی سازش کی، انہوں نے اپنی کتاب توراۃ میں تحریف کی، انہوں نے اپنی شریعتوں کو بھلا دیا اور کسی بھی شریعت کو قابل عمل نہ سمجھا۔ انہوں نے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بابت نہایت ہی مکارانہ ' معاندانہ اور غیر شریفانہ موقف اختیار کیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ خیانت کی اور حضورؐ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اس لئے وہ اللہ کی ہدایت سے نکل گئے، ان کے دل سخت ہو گئے اور وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ وہ ہدایت قبول کر سکیں۔

اللہ کی رحمت سے دوری کی یہ سزا صرف بنی اسرائیل کے گناہگاروں کے ساتھ خاص نہیں۔ جو بھی ان گناہوں اور جرائم کا ارتکاب کرے گا وہ اللہ کی رحمت محروم ہو گا، اس کا دل سخت ہو جائے گا اور ہدایت قبول نہیں کرے گا۔

اسی رحمت سے دوری اور دلوں کی سختی کو قرآن کریم نے سورۃ مطففین میں ران (زنگ) کے لفظ سے تعبیر فرمایا: كلا بل ران على قلوبهم ماكانوا يكسبون۔ یعنی قرآنی آیات بینات اور کھلی ہوئی نشانیوں سے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے زنگ لگ گیا ہے۔

حدیث: رسول کریم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے، پھر اگر اس نے توبہ کر لی تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے پرواہ نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک نقطہ سیاہ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کا دل ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔

اس وقت اس کے دل کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ: لا يعرف معروفا ولا ينكر منكرا۔ یعنی اب نہ وہ کسی نیکی کو نیکی سمجھتا ہے نہ برائی کو برائی بلکہ معاملہ برعکس ہونے لگتا ہے کہ عیب کو ہنر، بدی کو نیکی، گناہ کو ثواب سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنی طغیانی اور سرکشی میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کے گناہ کی نقد سزا ہے جو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے: ان من جزاء الحسنة الحسنة بعدها وان من جزاء السئية السيئة

بعدھا۔ یعنی نیکی کی ایک نقد جزاء یہ ہے کہ اس کے بعد اس کو دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے۔ اسی طرح گناہ کی نقد سزا یہ ہے کہ ایک گناہ کے بعد اس کا دل دوسرے گناہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ ایک نیکی دوسری نیکی کو دعوت دیتی ہے اور ایک بدی دوسری بدی کو اور گناہ کو ساتھ لے آتی ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: آیت کے آخری جملہ میں رسول کریم ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ ان کو معاف کریں اور ان کی بدعملی سے درگزر کریں۔ ان سے منافرت نہ رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سخت دلی اور بے حسی کے باوجود رواداری اور حسن خلق کا معاملہ ایسا نسخہ کیمیاء ہے کہ اس کے ذریعہ ان بے حسوں میں بھی حس پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ان میں احساس پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال اپنے اخلاق و معاملات کو درست رکھنا تو ضروری ہے۔

امّت مسلمہ کو تنبیہ

بنی اسرائیل پر جو گزری اس کی پوری داستان اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو سنائی کہ کس طرح وہ اپنے گناہوں اور جرائم کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔ اس تاریخ کے اندر امت مسلمہ کیلئے سبق اور تنبیہ ہے۔ اگر امت مسلمہ بھی یہی کام شروع کر دے جو بنی اسرائیل کی قوم نے کئے تھے یعنی اللہ کے عہد کو توڑ دے، اللہ کی کتاب قرآن مجید کو پس پشت ڈال دے، اپنے نبیؐ کی تعلیمات اور سنتوں کو بھلا دے، دین میں تحریفات شروع کر دے، فریضہ دعوت و تبلیغ اور فریضہ اقامت دین سے اعراض کرے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دے، شریعت اسلام کو بھلا دے اور اسے قابل عمل نہ سمجھے، صراط مستقیم کو چھوڑ کر ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چل پڑے، تو اس امت کا حال بھی وہی ہو گا جو پچھلی امتوں کا ہوا تھا کہ عروج کی طرف جانے کے بجائے ذلت و مسکنت ان کا مقدر بن گئی۔ اللہ کی رحمت کی مستحق بننے کے بجائے اللہ کے غضب کی حقدار بن گئیں۔

نصاریٰ سے عہد

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۔۔ (مائدہ۔14)

اِسی طرح ہم نے اُن لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ اُنہوں نے فراموش کر دیا۔۔۔

نصاریٰ نصرت یعنی مدد سے ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوال: من انصاری الی اللہ۔ اللہ کے دین میں کون میرا مددگار ہے؟ کے جواب میں ان کے چند مخلص پیروکاروں نے جواب دیا تھا: نحن انصار اللہ۔ کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اہل کتاب ہیں۔ بنی اسرائیل کی طرح ان سے بھی اللہ تعالی نے عہد لیا

تھا لیکن انہوں نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی، اس کے نتیجے میں ان کے دل بھی اثر پزیری سے خالی ہوگئے اور ان میں اچھی صفات کی جگہ بری صفات پیدا ہو گئیں۔ عہد الٰہی کو توڑنے کی وجہ سے ان میں ضد، عناد اور تفرقہ بازی پیدا ہو گئی۔ یہ عہد الٰہی سے انحراف اور بے عملی کی سزا ہے۔ بد قسمتی سے یہی خرابیاں امت مسلمہ کے اندر بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ امت بھی کئی فرقوں میں بٹ گئی ہے، جن کے درمیان شدید اختلافات اور نفرت وعناد کی دیواریں حائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ امت کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

قرآن کے دو مزید نام: کتاب نور وہدایت

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ المائدہ۔15

آیت کے اندر فرمایا گیا کہ اللہ ربّ العالمین نے اپنے پیارے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کو ہدایت اور نور حق کے ساتھ تمام انسانیت کی طرف بھیج دیا ہے۔ انہیں معجزے اور روشن دلیلیں عطا فرمائی ہیں۔ آسمانی کتابوں کے اندر جو علمی بد دیانتیاں کی گئی تھیں اور آیات الٰہی کی جو غلط تاویلات کی گئیں تھیں ان کی تصحیح کیلئے ان کو مبعوث کیا گیا۔ اللہ ربّ العالمین نے اپنے نبیؐ پر ایسی کتاب اتاری ہے جو انسانیت کو سلامتی کا راستہ دکھاتی ہے اور لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتی ہے اور راہ مستقیم کی رہبر ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے اللہ کے انعاموں کو حاصل کرلینا اور اس کی سزاؤں سے بچ جانا بالکل آسان ہوگیا ہے یہ ضلالت کو مٹا دینے والی اور ہدایت کو واضح کردینے والی ہے۔

نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ: نور اور کتاب مبین دونوں سے مراد قرآن کریم ہے جس کی واضح دلیل قرآن کریم کی اگلی آیت ہے جس میں کہا جارہا ہے کہ: يَـهْدِىْ بِهِ اللّـٰهُ۔۔۔ اس (یعنی قرآن مجید) کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے۔ اگر نور اور کتاب دو الگ الگ چیزیں ہوتیں تو الفاظ يَّهدِيهِمَا اللّٰہَ ہوتے، یعنی اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ذریعے سے ہدایت فرماتا ہے۔ قرآن کریم کی اس خاص آیت سے واضح ہوگیا کہ نور اور کتاب مبین دونوں سے مراد ایک یہ چیز یعنی قرآن کریم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نور سے حضورؐ اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔

قرآن کے ذریعے ہدایت

يَـهْدِىْ بِهِ اللّـٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٝ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُـمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَـهْدِيْـهِـمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (مائدہ۔16)

اس (قرآن مجید) کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ انہیں جو اس کی خوشنودی کے تابع ہوں سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنی توفیق سے اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف راہبری کرتا ہے۔مائدہ-16

چند عقائد باطلہ کا بیان

رسول اللہ ﷺ کی چند صفات: بشير و نذير

فترت وحی کے بعد آخری رسولؐ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡفَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (مائدہ-19)

اے اہل کتاب! ہمارا یہ رسول (نبی آخر الزمانؐ) ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا نہیں آیا۔سو دیکھو! اب وہ بشیر اور نذیر آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(مائدہ-19)

آیت کا مقصود یہ ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں اس وقت تشریف لاتے ہیں جبکہ رسولوں کی تعلیم مٹ چکی تھی۔ان کی راہیں بے نشان ہو چکی تھیں۔دنیا درس توحید کو بھلا چکی تھی۔مخلوق پرستی عام ہو چکی تھی۔اللہ کا دین بدل چکا تھا۔کفر کی تاریکی نور دین پر چھا چکی تھی۔دنیا کا چپہ چپہ سرکشی اور طغیانی سے بھر گیا تھا۔عدل وانصاف بلکہ انسانیت بھی فنا ہو چکی تھی۔ہر طرف جہالت و قساوت کا دور دورہ تھا۔بجز چند نفوس کے اللہ کا نام لیوا زمین پر موجود نہیں تھا۔ان حالات میں حضورؐ کو مبعوث کیا گیا۔آپؐ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث فرمائے گئے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو تقریباً پانچ سو سال کا فاصلہ ہے یہ زمانہ فترت وحی کہلاتا ہے۔اہل کتاب کو کہا جا رہا ہے کہ اس فترت کے بعد ہم نے اپنا آخری رسول بھیج دیا ہے اب تم یہ بھی نہ کہہ سکو گے کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر و نذیر پیغمبر ہی نہیں آیا۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: انا اولى الناس بعيسى ابن مريم ، ليس بيني و بينه نبيا-- میں حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) سے بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ اولیٰ یعنی قریب ہوں، اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں۔(بخاری)

آٹھواں رکوع: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ---- (مائدہ-20)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کرو(اذکرو نعمت اللہ علیکم)، سلسلہ انبیاء:انسانیت پر اللہ کا انعام واحسان، اختیار واقتدار: اللہ کی طرف سے انعام بھی اور آزمائش بھی، موسیٰؑ کی قوم اور ارض مقدس، قوم کا بیت مقدس جانے سے انکار، بنی اسرائیل کے ایماندار اور خدا ترس لوگوں کا تذکرہ، سچے ایماندار ہو تو اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھو(وعلی اللہ فتوکّلوا ان کنتم مومنین)، قوم موسیٰ کا مایوس کن جواب:اذھب انت وربک فقاتلا، انّا ھٰھنا قاعدون، موسیٰؑ کا اپنی قوم سے اظہار افسوس اور اظہار براءت، صحرا سیناء میں چالیس سال دربدری۔ نافرمانوں کی حالت پر افسوس نہ کرو بلکہ اپنی دعوتی کوشش اور تبلیغی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کردو: فلا تاس علی القوم الفاسقین۔

اللہ کے احسانات کو یاد کرو

سلسلہ انبیاء: انسانیت پر اللہ کا انعام واحسان

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (مائدہ۔20)

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اُس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی اُس نے تم میں نبی پیدا کیے، تم کو فرماں روا بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔

یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی عظمت کی طرف اور ان کے شاندار ماضی کی طرف جو حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے کسی زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے۔ اور دوسری طرف حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے اور انہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں، لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ : بیشتر انبیاء بنی اسرائیل میں سے مبعوث ہوئے جن کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم کردیا گیا اور آخری پیغمبر بنو اسماعیل سے آئے۔

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا: اس آیت کے مطابق پوری قوم بنی اسرائیل کو قرآن کریم نے ملوک قرار دیا یعنی پوری قوم اختیار واقتدار میں شریک تھی۔ اور یہی چیز جدید جمہوریت کی بھی روح ہے۔ اس آیت میں اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت در حقیقت عوامی حکومت ہوتی ہے۔ عوام ہی کو اپنا امیر و امام منتخب کرنے کا حق ہوتا ہے اور عوام ہی اپنی اجتماعی رائے سے اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے صورۃً اگرچہ فرد واحد حکمران ہوتا ہے مگر در حقیقت وہ حکومت عوام ہی کی ہوتی ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد نبیوں کو اللہ تعالیٰ نے ملوکیت (اقتدار) سے نوازا، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبوت کی طرح حکومت یا اقتدار بھی ایک نعمت خداداد ہے جسے مطلقاً برا نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگر اقتدار مطلقاً بری چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو حکمران بنا تا نہ اس کا ذکر انعام کے طور پر فرماتا۔ اصل بات یہ ہے کہ نظام سلطنت میں اصل چیز عدل و انصاف ہے۔ اور اگر ملک اسلامی ہو تو اصل چیز نظام دین یا اقامت دین ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب قول ہے کہ الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم۔ کوئی ملک یا نظام حکومت کفر پر تو قائم رہ سکتا ہے مگر ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا۔

اصل بادشاہت قناعت ہے

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اس کا جسم صحیح سالم ہو، اس کا نفس امن و امان میں ہو، دن بھر کفایت کرے، اس کیلئے اتنا مال بھی ہو تو اس کیلئے گویا کل دنیا سمٹ کر آ گئی۔

حدیث: ایک اور حدیث کے اندر آتا ہے: الغنیٰ غنی النفس۔ اصل دولت مندی دل کا غنی ہونا ہے۔

موسیٰ کی قوم اور ارض مقدّس

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِىْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ۔ (مائدہ۔21)

اے میری قوم اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کر دی اور اور اپنی پشت کے بل رو گردانی نہ کرو ورنہ اُلٹا خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ارض مقدس سے یہاں مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ اس میں فاتحانہ انداز میں داخل ہو جاؤ۔

قوم کا بیت المقدس جانے سے انکار

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ۔ (مائدہ۔22)

انہوں نے جواب دیا کہ اے موسیٰ وہاں تو زور آور (جابر) لوگ ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں ہم تو ہرگز وہاں نہ جائیں گے ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں پھر تو ہم (بخوشی) چلے جائیں گے۔

موسیٰؑ کی قوم یعنی بنو اسرائیل عمالقہ کی بہادری کی شہرت سے مرعوب ہو گئے تھے اور پہلے مرحلے پر ہی ہمت ہار بیٹھے اور بیت المقدس جانے سے انکار کر دیا۔

بنی اسرائیل کے ایماندار اور خدا ترس لوگوں کا تذکرہ

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (مائدہ۔23)

(بنی اسرائیل میں سے) جو لوگ خدا ترس تھے ان میں سے دو افراد نے جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہا کہ تم ان کے پاس دروازے میں تو پہنچ جاؤ۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی یقیناً تم غالب آ جاؤ گے، اور تم اگر مومن ہو تو تمہیں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ (مائدہ۔23)

اس قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشت فاران سے بنی اسرائیل کے 12 سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انہوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں۔۔۔ ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں اور ان کو شکست دے سکیں۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہو گا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار، یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔

قوم موسیٰ علیہ السلام میں صرف یہی دو شخص صحیح معنوں میں ایماندار نکلے، جنہیں نصرت الٰہی پر یقین تھا انہوں نے قوم کو سمجھایا کہ تم ہمت تو کرو، پھر دیکھو کس طرح اللہ تمہیں غلبہ عطا فرماتا ہے۔ لیکن باقی قوم کے لوگوں نے بزدلی، سوء ادبی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ کہا اے موسیٰ ہم کبھی وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں، سو تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ (مائدہ۔24)

اس کے برعکس جب جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو انہوں نے قلت تعداد اور قلت وسائل کے باوجود دشمن سے مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے پختہ عزم کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ 'یا رسول اللہ! ہم آپ کو اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح قوم موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا (کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ تو اور تیرا رب جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھیں گے)۔ (بخاری)

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم پر اظہار افسوس اور اظہار براءت

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۔ (مائدہ۔25،26)

موسیٰ نے کہا اے میرے رب میرے اختیار میں تو سوائے میری جان اور میرے بھائی کے اور کوئی نہیں سو ہمارے درمیان اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی ڈال دے۔ فرمایا تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس حرام کی گئی ہے اس ملک میں سرگرداں پھرتے رہیں گے۔ اس لئے تم ان فاسقوں کے بارے میں غمگین نہ ہونا۔ (مائدہ۔25،26)

پہلی آیت میں نافرمان قوم کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کا اپنی بے بسی کا اظہار بھی ہے اور برات کا اعلان بھی۔

صحراء سیناء میں دربدری

يَتِيْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ: یہ میدان تیہ کہلاتا ہے جس میں چالیس سال یہ قوم اپنی نافرمانی، سستی اور کاہلی کی وجہ سے صحراء میں ذلیل و خوار ہوتی رہی۔ اس میدان میں اس کے باوجود ان پر من و سلویٰ کا نزول ہوا جس سے اکتا کر انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ روز روز ایک ہی کھانا کھا کر ہمارا جی بھر گیا ہے۔ اپنے رب سے دعا کر کہ وہ مختلف قسم کی سبزیاں اور دالیں ہمارے لئے پیدا فرمائے۔ یہیں ان پر بادلوں کا سایہ بھی ہوا، پتھر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی مارنے سے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشمے جاری ہوئے اور اس طرح کے دیگر انعامات ہوتے رہے۔ بنی اسرائیل کو دشت فاران سے شرقی اردن تک پہنچتے پہنچتے پورے 38 برس لگ گئے۔ شرق اردن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح قرآن کے فیصلے: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً۔۔ کے مطابق وہ چالیس سال تک صحراء سیناء میں سرگرداں پھرتے رہے۔ پھر اللہ نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ

حضرت یوشع بن نون کے عہد خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کر سکیں۔ اس فتح کے بعد وہ بیت المقدس کے اندر داخل ہوئے۔

فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کے بعد ابلاغ کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونا

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ: پیغمبر جب دیکھتا ہے دعوت و تبلیغ کے باوجود میری قوم سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے جس میں اس کے لئے دین و دنیا کی سعادتیں اور بھلائیاں ہیں تو فطری طور پر اس کو سخت افسوس اور دلی صدمہ ہوتا ہے۔ یہی نبی کا بھی حال ہوتا تھا، جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ فرمایا لیکن آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ جب تو نے فریضہ تبلیغ ادا کر دیا اور پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچا دیا اور اپنی قوم کو ایک عظیم الشان کامیابی کے نقطہ آغاز پر لا کھڑا کیا۔ لیکن اب وہ اپنی کم ہمتی اور نادانی کے سبب تیری بات ماننے کو تیار نہیں تو تو اپنے فرض سے سبک دوش ہو گیا اور اب تجھے ان کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے موقع پر غمگینی تو ایک فطری چیز ہے۔ لیکن مراد اس تسلی سے یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے بعد اب تم عند اللہ بری الذمہ ہو۔

نواں رکوع: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ۔۔۔ (مائدہ۔27)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

آدمؑ کے بیٹوں کی قربانی، ایک کی قربانی قبول دوسرے کی قربانی رد(فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر)، اللہ کے راستے میں اچھی چیز قربان کرو، اعمال کے پیچھے اخلاص کی اہمیت(انما یتقبل اللہ من المتقین)، حسد و بغض کی ممانعت، برائی کا جواب برائی نہیں، نفس کی سرکشی، گناہگار ہمیشہ خسارے میں ہوتا ہے(فاصبح من الخاسرین)، جانوروں سے سبق، اسلام میں انسانی جان کی اہمیت، نسل انسانی کی بقاء کا دائمی اصول، ایک قتل پوری انسانیت کے قتل کے برابر، ایک انسانی جان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے برابر(ومن احیاھا فکانّما احیا النّاس جمیعا)، باغیوں اور متحارب گروہوں کی سرکوبی، جو ہتھیار پھینک دیں بغاوت چھوڑ دیں تو ان کیلئے رعایت ہے، توبہ اور اصلاح کا موقعہ: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔(مائدہ۔34)

آدمؑ کے بیٹوں کی قربانی

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (مائدہ۔27)

اور ذرا انہیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دو، جب ان دونوں نے قربانی کی ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی، اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا، اس نے جواب دیا اللہ پرہیز گاروں ہی سے قبول کرتا ہے۔ المائدہ۔27

ان آیات میں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ مجمل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن اس واقعہ کی تفصیلات کے بجائے اس سے حاصل ہونے والے اخلاقی سبق پر زور دیتا ہے۔ قرآن تو ان دو بھائیوں کے نام بھی نہیں بتاتا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ کس زمانے میں یہ واقعہ ہوا۔ قرآن یہ بھی نہیں بتاتا کہ وہ آدم کی پہلی نسل سے تھے کہ بعد والی نسل سے کیونکہ ابن آدم کی اصطلاح کا اطلاق قیامت تک آنے والے ہر انسان پر بھی ہوتا ہے۔ البتہ جمہور مفسرین کی آراء کی روشنی میں اس سے مراد آدمؑ کے دو صلبی بیٹے ہیں اور یہ گناہ جو آدم کے بیٹے سے سرزد ہوا یہ روئے زمین پر پہلا جرم اور پہلا قتل تھا۔ اس قصے کی جزئیات جو لوگوں میں مشہور ہوگئی ہیں وہ اہل کتاب کی روایات سے لی گئیں ہیں لہٰذا ان کی حیثیت قصہ گوئی سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرکے اس سے سبق لینا چاہئے۔

حسد و بغض کی ممانعت

آدمؑ کے دو بیٹوں کے قصے میں حسد و بغض سرکشی اور تکبر کا بدانجام بیان ہورہا ہے کہ کس طرح حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں میں کشمکش ہوگئی اور ایک نے اخلاص، نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کی اور اپنا ٹھکانا جنت میں بنالیا اور دوسرے نے اسے ظلم و زیادتی کا راستہ اپنایا اور دونوں جہان میں برباد ہوا۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: یہاں آدم کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کی باہمی گفتگو میں ایک ایسا جملہ آگیا جو ایک اہم اصول کی حیثیت رکھتا ہے، کہ اعمال و عبادات کی قبولیت تقویٰ اور خوف خدا پر موقوف ہے، جس میں تقویٰ نہیں اس کا عمل مقبول نہیں، اسی وجہ سے علمائے سلف نے فرمایا ہے کہ یہ آیت عبادت گزاروں اور عمل کرنے والوں کے لئے بڑا تازیانہ ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت عامر بن عبد اللہ اپنی وفات کے وقت رو رہے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو عمر بھر اعمال صالحہ اور عبادات میں مشغول رہے، پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا تم یہ کہتے ہو، اور میرے کانوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گونج رہا ہے: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری کوئی عبادت قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا تو یہ وہ نعمت ہے کہ ساری زمین سونا بن کر اپنے قبضہ میں آجائے تو بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھوں۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ اگر یہ بات یقینی طور پر طے ہو جائے کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہو گئی تو میرے لئے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے، اور جو عمل مقبول ہو جائے وہ چھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے۔ (ابن کثیر)

برائی کا جواب برائی نہیں

لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَاۡ بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (مائدہ۔28)

اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

انسان کا سرکش نفس برائی پر ابھارتا ہے۔(انّ النفس لامّارة بالسّوء)

گناہگار ہمیشہ خسارے میں ہوتا ہے

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (مائدہ۔30)

پس اسے اس کے (سرکش) نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر ابھارا۔ پس اس نے اسے قتل کر ڈالا جس سے نقصان پانے والوں میں سے ہو گیا۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: لَا تَقْتُلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا کَانَ عَلٰی اِبْنِ آدَمَ کفل من دمہا، لانہ کان اول من سن القتل۔ جو قتل بھی ظلماً ہوتا ہے (قاتل کے ساتھ) اس کے خون ناحق کا بوجھ آدم کے اس پہلے بیٹے پر ہوتا ہے کیونکہ یہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا کام کیا۔ (بخاری)

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قابیل کو ہابیل کے قتل ناحق کی سزا دنیا میں ہی فوری طور پر دے دی گئی تھی۔ حدیث میں آتا ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ظلم وزیادتی اور قطع رحمی یہ دونوں گناہ اس بات کے

زیادہ لائق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے کرنے والوں کو دنیا میں ہی جلد سزا دے دے، تاہم آخرت کی سزا مجرم کیلئے اس کے علاوہ ہوگی جو اسے وہاں بھگتنی ہوگی۔ (ابن کثیر)

جانوروں سے سبق

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِىْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ۔ (مائدہ۔31)

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تا کہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے، (یہ دیکھ کر اس نے کہا: ہائے افسوس! کیا میں اس کوّے کی مانند بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا، سو وہ پشیمان ہونے والوں میں سے ہو گیا۔ (مائدہ۔31)

اسلام میں انسانی جان کی اہمیّت

نسل انسانی کی بقاء کا دائمی اصول

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ۔ (مائدہ۔32)

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" مگر اُن کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی بقاء کا انحصار اس بات پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے انسان کی زندگی کے بقاء و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے اور ہمدردی نوع کے جذبہ سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ

صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افراد انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔ سب سے پہلے اسلام نے انسانی جان ومال کا احترام سکھایا اور ایک جان کے قتل کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک انسان کا قتل گویا پوری انسانیت پر حملہ اور ایک جان کو بچانا ساری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے۔

آدمؑ کے بیٹے کے قتل ناحق کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کی قدر وقیمت کو واضح کرنے کے لئے بنواسرائیل پر یہ حکم نازل فرمایا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ہاں انسانی خون کی کتنی اہمیت اور تکریم ہے اور یہ اصول صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے نہیں تھا، اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی یہ اصول ہمیشہ کے لئے ہے۔ سلیمان بن ربعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن (بصری) سے پوچھا یہ آیت ہمارے لئے بھی ہے جس طرح بنواسرائیل کے لئے تھی، انہوں نے فرمایا، ہاں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بنواسرائیل کے خون اللہ کے ہاں ہمارے خونوں سے زیادہ قابل احترام نہیں تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس آیت میں تنبیہ اور ملامت بھی ہے کہ انبیاء دلائل لے کر آتے رہے لیکن مخاطبین یعنی بنواسرائیل کا رویہ ہمیشہ حد سے تجاوز کرنے والا ہی رہا اس میں گویا نبی کو تسلی دی جارہی ہے کہ یہ آپؐ اور آپ کے صحابہ کرام کو نقصان پہنچانے کی جو سازش کرتے رہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آپ بہرحال اللہ پر بھروسہ رکھیں جو خیر الماکرین ہے۔ تمام سازشوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

حدیث: ایک مرتبہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ حضورؐ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیں کہ میری زندگی آرام وسکون کے ساتھ گزرے۔ آپؐ نے فرمایا کیا کسی کو مارنا (یا نقصان پہنچانا) تمہیں پسند ہے یا کسی کو بچالینا تمہیں محبوب ہے؟ جواب دیا: کسی کی زندگی بچالینا مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: علیک بنفسک۔ اپنی اصلاح کی فکر میں لگے رہو (یعنی اپنے حصے کے خیر کا کام کرتے رہو)۔ (مسند احمد)

دسواں رکوع: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ--- (مائدہ۔27)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ کا وسیلہ اور اس کی راہ میں جدوجہد، وسیلہ سے کیا مراد ہے؟ اللہ کا قرب اور اس کے وسیلہ کے ذرائع: تقویٰ، رجوع الی اللہ، اوامر ونواہی کی پابندی، تقویٰ قرب الٰہی کی بنیاد ہے، دعا وسیلہ: اذان کے بعد کی دعا، حضورؐ کیلئے مقام محمود کی

دعا، دنیا بھر کی دولت بھی آخرت میں کام نہ آسکے گی (لیفتدو بہ۔۔۔ماتقبل منھم)، احکام جرم وسزا، سزا اور جزاء تقاضہ عدل ہے، سزاء کے نفاذ کی شرائط، توبہ اور اصلاح (فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح۔۔۔انّ اللہ غفور الرّحیم)، عموماً لوگ سزا والی آیات تو پڑھتے ہیں مگر ان کے بعد توبہ اور اصلاح والی آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، آسمانوں وزمین کے خزانوں کی مالک ہستی، دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری آپ پر نہیں، رشوت خور منصفوں اور ججوں کو تنبیہ، جان بوجھ کر جھوٹے مقدمات سننے والے (سمّٰعون للکذب)، سحت یعنی رشوت سے کیا مراد ہے؟ پچھلی قوموں کی تباہی کی ایک وجہ رشوت خوری اور کرپشن، غیر مسلموں کے درمیان فیصلہ کرتے بھی انصاف کرو۔

اللہ کا قرب اور اس کی راہ میں جدوجہد

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (مائدہ۔27)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو، شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے۔

ابن جریرؒ نے حضرت قتادہؒ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے: تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ ۔۔یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب اور وسیلہ حاصل کرو، اس کی فرمانبرداری اور رضامندی کے کام کر کے، اس لئے آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، بذریعہ ایمان اور عمل صالح کے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ یعنی اللہ سے اپنی حاجات طلب کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور پھر اپنی حاجات اللہ سے طلب کرتا ہے تو وہ اس وقت بندگی کے صحیح مقام پر ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ کی ربوبیت پر اسے پورا یقین ہوتا ہے اور ایسے حالات میں وہ اصلاح اور فلاح دونوں کے قریب تر ہوتا ہے اور یہی ایک انسان کا نصب العین ہے۔

وسیلہ سے کیا مراد ہے؟

وسیلہ کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی مقصود کے حصول یا اس کے قرب کا ذریعہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو کا مطلب ہو گا کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو، ایسے اعمال اختیار کرو جس سے تمہیں اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں 'وسیلہ جو قربت کے معنی میں ہے تقویٰ اور دیگر خصال خیر پر صادق آتا ہے جن کے ذریعے سے بندے اپنے رب کا قرب حاصل کرتے ہیں، اسی طرح جن باتوں سے روکا گیا

ہوان کا ترک بھی قرب الٰہی کا وسیلہ ہے۔وسیلہ جنت کی اس اعلیٰ اور بہترین منزل کا بھی نام ہے جو رسول اکرم ﷺ کی جگہ ہے۔

وسیلہ کے ذرائع:

تقویٰ، قرب الٰہی، رجوع الی اللہ، اوامر ونواہی کی پابندی

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وما يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔(بخاری)

تقویٰ قرب الٰہی کی بنیاد ہے

اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کا اہتمام کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ایک بندہ مومن ساری زندگی رجوع الی اللہ کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

ایک حدیث میں اس مقام محمود کو بھی وسیلہ کہا گیا ہے جو جنت میں نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمایا جائے گا۔اسی لئے آپؐ نے فرمایا: جو اذان کے بعد میرے لئے یہ دعاءِ وسیلہ کرے گا وہ میری شفاعت کا مستحق ہو گا۔

اذان کے بعد کی دعا

اذان ختم ہونے کے بعد درود شریف پڑھ کر یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، اٰتِ مُحَمَّدَ نِ الْوَسِيلَةَ وَ الْفَضِيلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُودَ نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ، اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ.

اے اللہ!اس پوری پکار کے رب اور قائم ہونے والی نماز کے رب! محمد ﷺ کو وسیلہ عطا فرما(جو جنت کا ایک درجہ ہے)،اور ان کو فضیلت عطا فرما، اور ان کو مقام محمود پر پہنچا جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔بے شک تو وعدہ خلافی نہیں فرماتا ہے۔(بخاری)

اس دعا کا اہتمام کرنے سے ان شاء اللہ آخرت میں رسول اللہؐ کی شفاعت کا مستحق ہو گا۔

دنیا بھر کی دولت بھی آخرت میں کام نہ آسکے گی

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَ لِيْمٌ۔ (مائدہ۔36)

خوب جان لو کہ جن لوگوں نے انکار و سرکشی کا رویہ اختیار کیا ہے اگر ان کے پاس دنیا بھر کی دولت ہو اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

احکام جرم وسزا

چوری کی سزا

سزا اور جزاء تقاضہ عدل ہے

توبہ اور اصلاح

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (مائدہ۔39)

جو شخص اپنے گناہ کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح کرلے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرلے گا۔یقیناً اللہ تعالیٰ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

آسمانوں زمین کے خزانوں کی مالک ہستی

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ ۗ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔(مائدہ۔40)

کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے، اور اللہ سب چیزوں پر قادر ہے۔المائدہ۔40

دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری آپ پر نہیں

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَ فْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔۔۔ (مائدہ۔41)

اے رسول! آپ ان لوگوں کے لئے غم نہ کیجئے جو کفر و انکار میں سبقت کر رہے ہیں، وہ لوگ جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں حالانکہ ان کے دل مومن نہیں ہیں۔۔۔

نبی کریم کو اہل کفر و شرک کے ایمان نہ لانے اور ہدایت کا راستہ نہ اپنانے پر جو غم، کڑھن اور افسوس ہوتا تھا اس پر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو زیادہ غم نہ کرنے کی ہدایت فرما رہے ہیں۔ اس اعتبار سے آپؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ دوسروں کے قول و فعل کے ذمہ دار نہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں عند اللہ آپ سے بازپرس نہیں ہوگی۔

مخالفین اسلام اور مخالفین رسولؐ کی ساری ذہانتیں اور سرگرمیاں اس کوشش میں صرف ہو رہی تھیں کہ جاہلیت کا کلچر برقرار رہے اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اس بگاڑ کو درست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر نبی اکرمؐ کے خلاف ہر قسم کی گھٹیا چالیں چل رہے تھے۔ جان بوجھ کر حق نگل رہے تھے۔ نہایت بے باکی و جسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اس پاک انسان کے کام کو شکست دینے کی کوشش کر رہے تھے جو کام بے غرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بنا پر عام انسانوں کی اور خود ان کی فلاح و بہبود کے لیے شب و روز محنت کر رہا تھا۔ ان کی ان حرکات کو دیکھ دیکھ کر نبی اکرمؐ کا دل کڑھتا تھا، اور یہ کڑھنا بالکل فطری امر تھا۔ جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ محض اپنی جہالت اور خود غرضی و تنگ نظری کی بنا پر اس کی خیر خواہانہ مساعی کو روکنے کے لیے گھٹیا درجہ کی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں تو فطرتاً اس کا دل دکھتا ہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان حرکات پر جو فطری رنج آپ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ منشاء دراصل یہ ہے کہ اس سے آپ دل شکستہ نہ ہوں، ہمت نہ ہاریں، صبر کے ساتھ بندگان خدا کی اصلاح کے لیے کام کیے چلے جائیں۔ رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انہوں نے اپنے اندر پرورش کیے ہیں ان کی بنا پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز ان کی اس روش میں خلاف توقع نہیں ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کی بھی مذمت بیان کی جا رہی ہے جو رائے، قیاس اور خواہشات نفسانی کو اللہ کے دین و شریعت پر مقدم رکھتے ہیں۔ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل کر انکار کی روش اپناتے ہیں۔ گویہ لوگ زبانی ایمان کے دعوے دار ہوں لیکن ان کا دل ایمان سے خالی ہے۔ منافقوں کی یہی حالت ہوتی ہے کہ زبان کے کھرے اور دل کے کھوٹے ہوتے ہیں اور یہی خصلت بعض اہل کتاب کی بھی ہے جو اسلام دشمنی میں متحرک رہتے ہیں۔ یہ جھوٹ کو مزے مزے سے سنتے ہیں اور دل کھول کر قبول کرتے ہیں۔ لیکن سچ سے بھاگتے ہیں بلکہ نفرت کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور بری خصلت یہ ہے کہ یہ آدھا سچ بیان کرتے ہیں۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ۔ یہ بات کو بدل ڈالتے ہیں مطلب کچھ ہو، لے کر کچھ اڑتے ہیں۔ اگر تم ان کی خواہش کے مطابق کہو تو مان لیتے ہیں اور اگر آپ کی بات ان کی طبیعت کے خلاف ہو تو دور رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت کی سزا بھی ان کا مقدر ہے: لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

(مائدہ۔41)

رشوت خور منصفوں اور ججوں کو تنبیہ

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَ كّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔۔۔ (مائدہ۔42)

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔۔۔

سَمَّاعُوْن کے ایک معنی ہیں دوسروں کی باتیں ماننے اور قبول کرنے کے لئے سننا۔ یہاں خاص طور پر ان منصفوں، مفتیوں اور ججوں کی طرف اشارہ ہے جو جھوٹی شہادتیں لے کر اور جھوٹی رودادیں سن کر ان لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انہیں رشوت پہنچ جاتی تھی یا جن کے ساتھ ان کے دنیاوی مفاد وابستہ ہوتے تھے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار ہیں۔ اچھے ڈاکٹر سے علاج کرواتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل ڈھونڈھ لاتے ہیں، کوئی مکان بنانا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکٹیکٹ اور انجنیئر کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور جبہ، دستار اور کرتہ دیکھا، کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن لیا، اس کو مقتداء، عالم، مفتی، رہبر بنا لیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس کے پاس دین کا علم بھی ہے کہ نہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل واعظوں اور دکاندار پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جا پڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ کہانیاں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر زد نہ پڑے، وہ خوش ہیں کہ ہم دین پر چل رہے ہیں۔ اور بڑی عبادت کر رہے ہیں، مگر حقیقت وہ ہوتی ہے جس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ۔ یعنی وہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل دنیا ہی میں برباد ہو چکی ہے اور وہ اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا عمل کیا ہے۔

اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ: سُحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ یعنی بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سحت سے مراد رشوت ہے۔ رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے بلکہ پورے ملک وملت کی بنیاد کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لئے شریعت اسلام میں اس کو سحت (رشوت) فرما کر شدید حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے امراء وحکام کو جو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام کر دیا گیا ہے (جصاص)۔

رشوت سے کیا مراد ہے؟

رشوت کی شرعی تعریف یہ ہے کہ جس کام کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض منصبی میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا اس کی ڈیوٹی ہے اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا رشوت ہے۔ مثلاً جج کا کام ہے کہ انصاف کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کرے کیونکہ اس کام کی وہ تنخواہ لیتا ہے لیکن اگر اس مقصد کیلئے لوگوں سے رقم لیکر فیصلہ کرتا ہے تو یہ رشوت خوری میں آتا ہے۔ اگر وہ رشوت لیکر ناانصافی پر مبنی فیصلہ کرتا ہے تو یہ دوہرا گناہ ہے۔ کسی محکمہ کے اہلکار سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے۔ بدقسمتی سے اس کو آجکل چائے پانی کا نام دے کر جائز سمجھ لیا گیا ہے۔ پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا جائز کام کرتا ہے حالانکہ وہ کام اس کے فرائض میں پہلے سے شامل تھا تو وہ رشوت لینے کا گناہگار ہے اور یہ مال اس کے لئے سُحت یعنی رشوت ہے اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے ناجائز یا غیر قانونی کام کیا، کسی کی حق تلفی کی، جھوٹا فیصلہ کیا تو یہ دوہرا جرم ہے۔ بعض مفسرین سحت سے مراد مذہبی رشوت یا من پسند فتوے کی اجرت بھی مراد لیتے ہیں۔

پچھلی قوموں کی تباہی کی وجہ: رشوت خوری، کرپشن

قرآن مجید میں پچھلی قوموں کی تباہی کا ذکر ہے۔ ان میں زیادہ قوموں کی تباہی کی وجہ صرف عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) میں کمی نہیں تھی بلکہ ان کی تباہی کی بڑی وجوہات میں معاملات کی کوتاہی شامل تھی یعنی رشوت خوری، انصاف نہ کرنا، معاشرتی ظلم وزیادتی، قتل ناحق، کم تولنا، ملاوٹ کرنا وغیرہ تھا۔

غیر مسلموں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے بھی انصاف کرو

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (مائدہ۔42)

اور اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، یقیناً عدل والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے۔

گیارہوں رکوع: اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ۔۔۔ (مائدہ۔44)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

تورات اپنے دور کا حق تھی اور ذریعہ نور وہدایت تھی، ہر آسمانی کتاب اپنے وقت میں قابل اتباع تھی، تمام انبیاء ایک ہی دین کے پیروکار تھے، تمام انسانوں کے خون برابر، مرد وعورت کا خون برابر (انّ النفس بالنفس)، سزا سے متعلق زمانہ جاہلیت کی روایات، اللہ کی آیات یعنی دین کو نہ بیچو (ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلا) حکمرانوں یا لوگوں کی خوشنودی کیلئے اپنی

مرضی کا دین نہ بناؤ، آسمانی ہدایت اور تعلیمات پر عمل کرو، لوگوں کی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو (ولا تتبع اھواء ھم)، اپنے فیصلوں میں کتاب الٰہی کو معیار بناؤ، (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاوئلک ھم الفاسقون)، اختلاف شرائع کی حکمت: انسانی مزاج اور طبائع کا اختلاف، زمانے کا اختلاف، آسمانی ہدایت کا فائنل ورژن: قرآن مجید، شریعت اسلام: دائمی اور مستقل شریعت، اسلامک کوڈ آف پریکٹس، دین پر عمل کیلئے انسانوں پر جبر نہیں (ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدہ) آزمائش اسی میں ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے ہدایت کے راستے یعنی صراط مستقیم پر چلیں، اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو (فاستبقوا الخیرات)، فیصلہ سازی میں ہمیشہ انصاف سے کام لو، جاہلانہ کلچر پر مبنی فیصلے نہ کرو (افحکم الجاہلیۃ یبغون)۔

تورات اپنے دور کا حق تھی اور ذریعہ نور وہدایت تھی

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (مائدہ۔44)

ہم نے تورات نازل فرمائی ہے جس میں ہدایت ونور ہے، یہودیوں میں اسی تورات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے انبیا (علیہم السلام) اور اہل اللہ اور علما فیصلے کرتے تھے کیونکہ انہیں اللہ کی اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا۔ اور وہ اس پر اقراری گواہ تھے اب تمہیں چاہیئے کہ لوگوں سے نہ ڈرو اور صرف میرا ڈر رکھو، میری آیتوں کو تھوڑے تھوڑے مول پر نہ بیچو، جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ (پورے اور پختہ) کافر ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ : یعنی ہم نے اپنی کتاب تورات بھیجی جس میں حق کی طرف رہنمائی اور ایک خاص نور تھا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ آج جو شریعت توراۃ کو منسوخ کیا جارہا ہے تو اس میں تورات کی کوئی تنقیص نہیں، بلکہ تغیر زمانہ کے سبب سے تغیر احکام کی ضرورت کے ماتحت ایسا کیا گیا، ورنہ تورات بھی ہماری ہی نازل کردہ کتاب ہے۔

النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا۔۔: اس آیت میں تمام انبیاءؑ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ دین اسلام کے پیروکار تھے اور اسی دین کے داعی تھے جس کی طرف محمد رسول اللہؐ دعوت دے رہے ہیں۔ یعنی تمام پیغمبروں کا

دین ایک ہی رہا ہے۔ اسلام جس کی بنیادی دعوت یہ تھی کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی دعوت توحید واخلاص پیش کی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے، سب کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔ (انبیاء۔25)۔ اسی کو قرآن میں الدّین بھی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت میں بھی فرمایا گیا: شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحا۔۔۔ (شوریٰ۔13) جس میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے لیے ہم نے وہی دین مقرر کیا ہے جو آپ سے قبل دیگر انبیا کے لیے کیا تھا۔

تمام انسانوں کے خون برابر

مرد اور عورت کا خون برابر ہے

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔۔۔ (مائدہ۔45)

اور ہم نے اس کتاب (تورات) میں ان پر فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔۔۔

اس آیت کے عموم سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ تمام انسانوں کے خون برابر ہیں۔ اسی طرح مرد و عورت کا خون بھی برابر ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مرد کو عورت کے بدلے سزا نہیں دیتے تھے جس پر یہ آیت: اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ (المائدہ:45) نازل ہوئی پس مجرم لوگ سب برابر ہیں۔ ایک اسلامی نظام حکومت میں مجرم چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت ہو، وہ مجرم ہے اور مستوجب سزا ہے۔

اسی طرح یہ بھی فقہی اصول ہے کہ اگر ایک جرم میں کئی افراد ملوث ہیں تو ان سب کو سزا ملے گی۔ حضرت عمر فاروق (رض) کے دور میں ایک قتل میں ملوث سات قاتلوں کو سزا ملی۔

اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مجرم نے جس طریقے سے کسی کو قتل کیا اسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل قاتل یا مجرم کو ضرور انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ:

قصاص لینے کا حق اگرچہ مقتول کے ورثاء کا ہے مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں بلکہ اس حق کو حاصل کرنے کے لئے عدالت یا حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔(بحوالہ قرطبی)

ہمیشہ سزا کا اختیار قانونی اور عدالتی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد صرف مجاز قانونی عدالت یا اتھارٹی کو ہوتا ہے ۔کسی فرد یا گروہ کو اپنے طور پر مجرم کو سزا دینے کا قطعاً اختیار نہیں۔

سزا سے متعلق زمانہ جاہلیت کی روایات:

زمانہ جاہلیت میں کوئی نظم اور قانون نہیں تھا اس لیے زورآور قبیلے کمزور قبیلوں پر جس طرح چاہتے ظلم کا ارتکاب کر لیتے۔ایک ظلم کی شکل یہ تھی کہ کسی طاقتور قبیلے کا کوئی فرد قتل ہو جاتا تو وہ صرف قاتل سے بدلہ لینے کے بجائے قاتل فرد کے قبیلے کے کئی افراد کو بلکہ بسا اوقات پورے قبیلے ہی کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرتے۔اسی طرح ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے۔اس کے علاوہ زمانہ جاہلیت کی روایات میں یہ بھی تھا کہ کسی غلام کے قاتل آزاد مرد کو یا عورت کے قاتل مرد کو سزا نہیں ملتی تھی۔ان آیات میں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جو قاتل یا مجرم ہو گا بدلے میں اسی کو سزا ملی گی۔سورۃ بقرہ آیت 178 میں اسلام کے فلسفہ جرم وسزاء بالخصوص فلسفہ قصاص کا مقصد بیان کر دیا گیا: وَ لَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ تاکہ تم (مزید خونریزی سے) بچو۔(البقرہ۔179)

ہر آسمانی کتاب اپنے وقت میں قابل اتباع تھی

تورات اپنے دور کا حق تھی

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

(مائدہ۔46)

اور ہم نے انبیاء کے نشان قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو پہلے سے موجود کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انہیں انجیل عطاء فرمائی جس میں نور اور ہدایت ہے اور اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی تھی دوسرا اس میں ہدایت و نصیحت تھی پارسا لوگوں کے لئے۔

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے تمام انبیاءؑ کا دین تھا، مسیح کا دین بھی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ توراۃ کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانہ میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی۔ قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ اللہ کی طرف سے جتنے انبیاء دنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاء کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو ہٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاء کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کر فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثہ کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدق تھی۔ چنانچہ اس آیت کے اندر فرمایا گیا:

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ: یعنی انبیائے سابقین کے فوراً بعد، متصل ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جو اپنے سے پہلے نازل شدہ کتاب تورات کی تصدیق کرنے والے تھے، نہ کہ اس کو جھٹلانے والے تھے، جو اس بات کی دلیل تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے سچے رسول ہیں اور اسی اللہ کے فرستادہ ہیں جس نے تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی، تو اس کے باوجود بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی بلکہ ان کی تکفیر اور تنقیص و اہانت تک بھی کی۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ۔۔: یعنی جس طرح تورات اپنے وقت میں لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ تھی اسی طرح انجیل کے نزول کے بعد اب یہی حیثیت انجیل کو حاصل ہوگئی اور پھر قرآن کریم کے نزول کے بعد تورات و انجیل اور دیگر کتب آسمانی پر عمل منسوخ ہوگیا اور ہدایت و نجات کا ذریعہ قرآن کریم رہ گیا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم فرمادیا، یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی فلاح اور کامیابی اسی قرآن سے وابستہ ہے۔ جو اس سے جڑ گیا سرخرو رہے گا جو کٹ گیا ناکامی و نامرادی اس کا مقدر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق ہر دور میں ایک ہی رہا ہے، متعدد نہیں۔ تورات اپنے دور کا حق تھی اور اپنے وقت میں منبع نور و ہدایت تھی۔ اس کے بعد انجیل اپنے دور کا حق تھی۔ انجیل کے نزول کے بعد تورات پر عمل کرنا جائز نہیں تھا۔ اور جب قرآن نازل ہوگیا تو انجیل منسوخ ہوگئی۔ انجیل پر عمل کرنا اب جائز نہیں رہا اور صرف قرآن

ہی واحد نظام عمل اور نجات کے لیے قابل عمل رہ گیا، اس پر ایمان لائے بغیر نجات ممکن نہیں۔ البتہ پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان ضروری مگر اب قابل عمل کتاب قرآن

اپنے فیصلے کتاب الٰہی کے مطابق کرو

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ۔47)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ اللہ کے نافرمان ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کریں ان کیلئے تین دفعہ تنبیہ فرمائی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (مائدہ۔44)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (مائدہ۔45)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ۔47)

جو لوگ آسمانی تعلیمات پر عمل نہ کریں اور اس کے مطابق اپنے فیصلے نہ کریں ایک یہ کہ وہ منکر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ بے انصاف ہیں، تیسرے یہ کہ وہ فاسق اور گناہگار ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان اللہ کے نازل کردہ احکامات کو نظر انداز کرتا ہے، وہ دراصل تین طرح سے گناہ کا مرتب ہوتا ہے۔

اوّلاً اس کا یہ عمل اللہ کے انکار کا ہم معنی ہے۔

ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب اللہ کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔

ثالثاً یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے حکم سے منحرف ہو کر اپنے فیصلے کئے تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ البتہ اس انکار، ظلم اور فسق کے درجات ومراتب میں فرق ہے۔ جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ منکر، ناانصاف اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو نفاق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور ظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ

ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملار کھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کا مصداق اہل کتاب کو قرار دیا ہے۔ مگر اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہؓ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں آئی تھیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ اہل کتاب میں جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی ان آیات کا مصداق ہے یعنی وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: نعم الاخرۃ لکم بنو اسرائیل اَن کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلّا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک۔ "کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے! ہر گز نہیں، اللہ کی قسم تم انہیں کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔

اس آیت کا سبق یہ ہے کہ یقین والوں کیلئے اللہ سے بہتر حکمران اور کار فرما کون ہو گا؟ اللہ سے زیادہ عدل و انصاف والے احکام کس کے ہوں گے؟ ایماندار اور یقین کامل والے بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ اس احکم الحاکمین اور الرحم الراحمین سے زیادہ اچھے، صاف، سہل اور عمدہ احکام و قواعد مسائل و ضوابط کسی کے بھی نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی مخلوق پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے جتنی ماں اپنی اولاد پر ہوتی ہے، وہ پورے اور پختہ علم والا کامل اور عظیم الشان قدرت والا اور عدل و انصاف والا ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اللہ کے فیصلے کے بغیر جو فتویٰ دے اس کا فتویٰ جاہلیت کا فتویٰ ہے۔

شریعت اسلام: دائمی اور مستقل شریعت

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (مائدہ۔48)

ہم نے تجھ پر سچی کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کے مضامین پر نگہبانی کرنے والی ہے سو تو ان میں اس کے موافق حکم کر جو اللہ نے اتارا ہے اور جو حق تیرے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت کر دیتا لیکن وہ تمہیں اپنے دیے ہوئے حکموں میں آزمانا چاہتا ہے لہذا نیکیوں میں ایک دوسرے

سے بڑھنے کی کوشش کرو تو سب کو اللہ کے پاس پہنچنا ہے پھر تمہیں اصل حقیقت بتادے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا تھا کہ "پچھلی کتابوں" میں سے جو کچھ اپنی اصلی اور صحیح صورت پر باقی ہے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے "پچھلی کتابوں" کے بجائے الکتاب کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں۔ ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے، اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعہ سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو ٹیکسٹ یا عبارات کا ہے جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں، مؤید ہیں، تردید کرنے والی نہیں، تصدیق کرنے والی ہیں۔ بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ اب اس کتاب کا آخری ایڈیشن اور فائنل ورژن قرآن مجید ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ۔: ہر آسمانی کتاب اپنے سے ماقبل کتاب کی مصدق رہی ہے جس طرح قرآن پچھلی تمام کتابوں کا مصدق ہے اور تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری کتابیں فی الواقع اللہ کی نازل کردہ ہیں۔ لیکن قرآن مصدق ہونے کے ساتھ ساتھ مُهَيْمِنْ (محافظ، امین، شاہد اور حاکم) بھی ہے۔ عربی میں لفظ مُهَيْمِنْ محافظت، نگرانی، شہادت کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: هيمن الطائر علىٰ فراخه، یعنی پرندے نے اپنے چوزے کو اپنے پروں میں لے کر محفوظ کر لیا۔ اسی سے لفظ ھمیان ہے جسے اردو میں ہمیانی یا تجوری اور انگریزی میں سیف لاکر کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کا مؤید ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہوگئی ہے قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جاسکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام ہے۔۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ۔۔: یہ دراصل امت کو تعلیم دی جارہی ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے ہٹ کر لوگوں کی خواہشات کے مطابق فیصلے کرنا گمراہی ہے، جس کی اجازت جب پیغمبر کو نہیں ہے تو کسی اور کو کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: اس سے مراد پچھلی شریعتیں ہیں جن کے بعض احکامات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ایک شریعت میں بعض چیزیں حرام تو دوسری میں حلال تھیں، بعض میں کسی مسئلے میں تشدید تھی اور دوسرے میں تخفیف، لیکن دین سب کا ایک یعنی توحید پر مبنی تھا۔اس لئے سب کی دعوت ایک ہی تھی۔اس مضمون کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **الانبیاء اخوۃ لعلات، امھاتھم شتّٰی ودینھم واحد**۔ تمام انبیاءؑ آپس میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں۔اگرچہ ان کی مائیں مختلف تھیں مگر دین سب کا ایک ہی تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا دین ایک ہی تھا اور شریعتیں مختلف تھیں۔لیکن شریعت اسلام کے بعد اب ساری پچھلی شریعتیں بھی منسوخ ہو گئیں ہیں۔اب شریعت اسلام کی صورت میں ایک مستقل اور دائمی شریعت عطا کر دی گئی۔

اختلاف شرائع میں حکمت یہ ہے کہ دنیا کے ہر دور اور ہر طبقہ کے انسانوں کے مزاج وطبائع مختلف ہوتی ہیں۔زمانہ کا اختلاف طبیعت انسانی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اگر سب کے لئے فروعی احکام ایک ہی کر دیئے جائیں تو انسان بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائے، اس لئے حکمت الٰہیہ کا یہ تقاضا یہ ہوا کہ ہر زمانہ اور ہر مزاج کے جذبات کی رعایت رکھ کر فروعی احکام میں مناسب تبدیلی کی جائے۔

اسلامی احکامات میں ناسخ و منسوخ کے پیچھے بھی یہی حکمت ہے۔ناسخ و منسوخ کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ حکم دینے والے کو پہلے حالات معلوم نہ تھے تو ایک حکم دیدیا پھر نئے حالات سامنے آئے تو اس کو منسوخ کر دیا، یا پہلے غفلت و غلطی سے کوئی حکم صادر کر دیا۔ناسخ و منسوخ کی مثال ایک ڈاکٹر کے نسخہ کی طرح ہے کہ جس میں دوائیں تدریجاً تبدیل کی جاتی ہیں کیونکہ ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کا استعمال کرنے کے بعد مریض پر یہ کیفیات طاری ہو جائیں گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی، جب وہ پچھلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پہلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے ایام میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا، اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔

اختلاف شرائع میں دوسری حکمت یہ تھی کہ ہر زمانے میں لوگوں کو اللہ کا بندہ بنایا جائے نہ کہ مراسم عبودیت کا۔کیونکہ درحقیقت عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت کا جو صرف نماز، روزہ، حج، زکوۃ یا ذکر و تلاوت پر منحصر

نہیں اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقاصد ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک اللہ کی عبادت و اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کار ثواب نہیں بلکہ الٹا گناہ کا موجب ہے۔ ایام عیدین میں روزہ رکھنا الٹا گناہ ہے۔ نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں میدان عرفات میں جمع ہو کر دعاو عبادت کرنا کار ثواب نہیں حالانکہ نویں ذی الحجہ میں یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال ہے کہ جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادات ہیں اور جب اور جس حد تک ان کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں۔ بے علم عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، جو عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں بلکہ بعض دفعہ مذہبی رسوم کو وہ عبادات سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں تو یہیں سے بدعات دین کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہی چیز پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب بنی۔ اللہ رب العالمین نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصود نہ بنالیں۔ بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جن عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: یعنی نزول قرآن کے بعد اب نجات تو اگرچہ اسی سے وابستہ ہے۔ لیکن اس راہ نجات کو اختیار کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جبر نہیں کیا ہے۔ ورنہ وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، لیکن اس طرح تمہاری آزمائش ممکن نہ ہوتی، جب کہ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک امت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان رکھا اس کے اندر دوسری بہت سی مصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا اور ان کا امتحان مقصود تھا۔ جو لوگ اصل دین اور اس کی روح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں وہ حق کو جس صورت میں بھی وہ آئے اور جس دور میں بھی آئے اور جو بھی اسے لیکر آئے، وہ اس کو پہچان لیں گے اور قبول کر لیں گے۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے جمود اور تعصب اختیار کر لیا ہے وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو اللہ کی طرف سے بھیجی جائے۔ ان دونوں قسم کے لوگوں میں فرق کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔ تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو پانا ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو دین کا حکم ہو اس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے

فروق پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (مائدہ۔48)

پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کرو۔ تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ہر وہ چیز بتادے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔

جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصب، ہٹ دھرمی سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلس مناظرہ میں ہو سکتا ہے نہ میدان جنگ میں۔ ان معاملات کا آخری اور حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ خود قیامت والے دن فرمائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔

فیصلہ سازی میں ہمیشہ انصاف سے کام لو

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ۔49)

اور ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے

اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں

اور ان سے ہوشیار رہیں کہ کہیں وہ آپ کو اللہ کے نازل کردہ کسی حکم سے بھٹکا نہ دیں

اور اگر وہ روگردانی کریں، تو جان لیجیے کہ اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ وہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دے۔ (مائدہ۔49)

قرآن کے مطابق چلو اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرو

جاہلانہ کلچر اور روایات پر مبنی فیصلے نہ کرو

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ (مائدہ۔50)

(اگر یہ اللہ کے احکام سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

جاہلیت کا لفظ اسلام سے پہلے کے کلچر پر بولا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف اللہ نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم یا قیاس و گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرز عمل جہاں جس دور میں بھی انسان اختیار کریں اسے بہر حال جاہلیت ہی کا طرز عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک جزوی علم ہے اور کسی معنی میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظام زندگی اس جزوی علم کے ساتھ ظنون و اوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کر کے بنا لیے گئے ہیں وہ بھی اسی طرح جاہلیت کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اس تعریف میں آتے ہیں۔

حدیث: حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے کا متلاشی ہو اور ناحق کسی کا خون بہانے کا طالب ہو۔ یہ حدیث بخاری میں بھی معمولی الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ آئی ہے۔ (بحوالہ ابن کثیر)

بارھواں رکوع: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى۔۔۔ (مائدہ۔51)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

دوستی اور محبت کے اصول، دشمنان اسلام سے دوستی اور موالات نہ رکھو، دین کی توہین اور مذاق اڑانے والوں کو دوست نہ بناؤ، ظالموں کو عموماً ہدایت نصیب نہیں ہوتی (انّ اللہ لا یھدی القوم الظالمین)، اخلاص کے بغیر کئے گئے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں (حبطت اعمالھم)، فتنہ ارتداد: جو دین سے پھرتا ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اللہ کے محبوب لوگوں کی صفات (یحبھم و یحبونہ)، اہل ایمان کی خاص صفت: ولا یخافون لومۃ لائم، اللہ کے دو صفاتی نام: واسع، علیم، تمہارا ولی اور رفیق خاص کون؟ (اللہ ولیکم اللہ ورسولہ۔۔)، اللہ کی جماعت یعنی اللہ والوں کی نشاندہی (فانّ حزب اللہ ھم الغالبون)۔

دوستی اور محبت کا معیار اور اصول

دشمنان اسلام سے دوستی اور موالات نہ رکھو

دین کی توہین اور مذاق اڑانے والوں کو دوست نہ بناؤ

بلاشبہ اسلام کی تعلیمات یہی ہیں کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے دوستی، تعلق رکھنے کی اصولی اجازت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف، ہمدردی وخیر خواہی، بھلائی، احسان اور رواداری کے معاملہ میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے مذہبی اصول وعقائد دوستی اور محبت پر قربان کر دیں۔ جب بھی مذہبی رواداری کی بات ہوگی تو وہ اسلامی عقائد پر سمجھوتہ کئے بغیر ہوگی، لکم دینکم ولی دین، لنا اعمالنا ولکم اعمالکم کے اصول پر ہوگی۔ اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنے نظریات وعقائد کی حفاظت میں بھی محتاط ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی خیر خواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلامی شعائر کی حفاظت کی بھی تلقین کرتا ہے۔ وہ عبادات اور اخلاق ومعاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب وکلچر کو برقرار بھی رکھنا چاہتا ہے۔ دوستی اور محبت کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ایک مسلمان دوستی کو بچانے کیلئے اپنا دین، اپنا مذہب، اپنی اقدار دوسروں کو تحفہ میں پیش کردے۔ ایسی گہری دوستی اور اخلاط ہو کہ اسلام کے امتیازی نشانات ہی گڈمڈ ہو جائیں۔ ایسی دوستی اور محبت کی اسلام میں اجازت نہیں۔ اگر کوئی دوست آپ کو آپ کا دین بدلنے یا اس پر عمل کرنے سے روک رہا ہے تو وہ آپ کا دوست نہیں۔ دوستی کی آڑ میں اس کے مقاصد کچھ اور ہیں۔

یہی نکتہ ان آیات کے اندر بیان کیا جارہا ہے۔

البتہ برے دوستوں سے بالکل قطع تعلقی اور رابطہ چھوڑ دینا بھی ٹھیک نہیں۔ دعوت دین کی نیت کے ساتھ علیک سلیک برقرار رکھی جائے۔ اور حکمت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔

دشمنان اسلام سے دلی دوستی، محبت کی ممانعت

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔ (مائدہ۔52)

تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ اُنہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے سو قریب ہے کہ اللہ جلدی فتح ظاہر فرمادے یا کوئی اور حکم اپنے ہاں سے ظاہر کرے پھر یہ اپنے دل کی چھپی ہوئی بات پر شرمندہ ہوں گے۔

ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جو دشمنان اسلام سے دلی محبت اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں سرگرم تھے۔ یہ بات اہم ہے کہ یہ ہدایات اس وقت دی گئیں جب عرب میں کفر اور اسلام کی کشمکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام ایک طاقت بن چکا تھا لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا ویسے ہی دشمنان اسلام کی فتح کا بھی تھا۔ اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے وہ امت مسلمہ میں رہتے ہوئے اس وقت کے دشمنان اسلام کے ساتھ بھی ربط وضبط رکھنا چاہتے تھے تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ اس پس منظر میں دوستی اور دشمنی کے حوالے سے یہ مخصوص ہدایات دی گئیں۔ دوستی اور دشمنی کے حوالے سے سورۃ مائدہ کی ان آیات کو قرآن مجید کی دوسری آیات کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

(اس موضوع پر مزید تشریح کیلئے دیکھئے تذکیر بالقرآن پارہ 28 سورۃ ممتحنہ، آیت 8)

اخلاص کے بغیر کئے گئے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ۔ (مائدہ۔53)

اور ایماندار لوگ (تعجب سے) کہیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام ونامراد ہو کر رہے۔

یعنی جو کچھ ان منافقین نے اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے، قوانین اسلام کی اطاعت کی، یہ سب کچھ اس بنا پر ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہیں تھا۔

فتنہ ارتداد: جو دین سے پھرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡيُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (مائدہ۔54)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق فتنہ ارتداد کا ذکر فرمایا، جس کا واقعہ نبی کریمؐ کی وفات کے فوراًبعد ہوا۔ اس فتنہ مرتد کے خاتمے کا شرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوا۔

فَسَوْفَ يَأْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ۔۔

مرتدین کے مقابلے میں جس قوم کو اللہ تعالیٰ چنے گا ان کی چار نمایاں صفات بیان کی جارہی ہیں:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡيُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ یعنی اللہ کے پسندیدہ لوگوں کی یہ چار صفات ہیں:

1۔ اللہ سے محبت کرنا اور اس کا محبوب ہونا۔

2۔ اہل ایمان کے لئے نرم اور دشمنان اسلام پر سخت ہونا۔

3۔ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنا۔

4۔ اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ: یہ اہل ایمان کی چوتھی صفت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں داری میں انہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ ہوگی۔ یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اس دین کی رو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انہیں کوئی باک اور کسی ملامت کا خوف نہ ہوگا۔ کسی کی مخالفت، کسی کی طعن و تشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروانہ کریں گے۔ اگر کسی معاملے میں عام رائے اسلام کی مخالفت پر مبنی ہو اور اسلام کے

طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر میں اجنبی بنا لینے کے ہوں تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچے دل سے حق جانتے ہیں۔

اس لحاظ سے یہ بڑی اہم صفت ہے۔ معاشرے میں جن برائیوں کا چلن عام ہو جائے ان کے خلاف نیکی پر استقامت اور اللہ کے حکموں کی اطاعت اس صفت کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنہ کتنے ہی لوگ ہیں جو برائی، معصیت الٰہی اور معاشرتی خرابیوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں لیکن ملامت گروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اسی لئے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو مذکورہ صفات حاصل ہو جائیں تو یہ اللہ کا ان پر خاص فضل ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان تمام صفات اور خوبیوں کا مظہر اتم تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا وآخرت کی سعادتوں سے مشرف فرمایا اور دنیا میں ہی اپنی رضامندی کی سند سے نواز دیا۔

تمہارا ولی اور رفیق کون؟

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔ (مائدہ۔55)

اے ایمان والو! تمہارا رفیق اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ (اللہ کے حضور عاجزی سے) جھکنے والے ہیں۔

اللہ کی جماعت کی نشاندہی

وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ (مائدہ۔56)

اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر اور اہل ایمان سے دوستی کرے گا تو (وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہو گا اور) اللہ کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔

یہ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کی نشاندہی اور اس کی برتری کا ذکر ہو رہا ہے۔ حزب اللہ وہ ہے جس کا تعلق، دوستی، خیر خواہی، اللہ، رسول اور اہل ایمان سے ہو۔ جیسا کہ سورہ مجادلہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں سے محبت رکھیں جو اللہ، رسول کے دشمن ہوں، چاہے وہ ان کے اقارب یا ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ ہوں، پھر خوشخبری دی گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں ایمان ہے اور جنہیں اللہ کی مدد حاصل ہے، انہیں ہی اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا۔۔ اور یہی حزب اللہ ہے جو بالآخر کامیاب و کامران ہو گی۔

تیرہواں رکوع: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا۔۔۔ (مائدہ۔57)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

دین کی توہین کرنے والوں سے دوستی نہ رکھو، اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والے، دین کو کھیل، تماشہ نہ بناؤ(لاتتخذو الذین اتخذو دینکم ھزواً و لعباً)، اذان کا مذاق اڑانے والے(واذا نادیتم الی الصلوٰۃ اتّخذوھا ھزواً و لعباً)، اہل کتاب کے اعتراضات کی وجوہات، منافقین کے ایمان کی حیثیت، گناہوں میں متحرک لوگ (یسارعون فی الاثم) گناہوں کی عادت بنانے والے،، نیکیوں میں متحرک لوگ (یسارعون فی الخیرات)، نیکیوں کی عادت بنانے والے، فسق وفجور پر علماء کی خاموشی بہت بڑی غفلت ہے(لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم و کلھم السحت)، اللہ وسعت اور کشادگی عطا کرنے والا ہے(بل یدٰہ مبسوطتٰن ینفق کیف یشاء)، اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا(واللہ لایحب المفسدین)، اقامت دین کی برکات(لاکلو من فوقھم ومن تحت ارجلھم)۔

دین کی توہین کرنے والوں سے دوستی نہ رکھو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (مائدہ۔57)

اے اہل ایمان! تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے اور منکرین میں سے جن لوگوں نے بھی تمہارے دین کو ہنسی، مذاق (توہین کا ذریعہ) بنا رکھا ہے انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور سچے ایماندار ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو۔

یہاں پھر تاکید کی گئی ہے کہ دین کو کھیل، مذاق بنانے والے اور اس کی توہین کرنے والے چونکہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں اس لئے ان کے ساتھ اہل ایمان کی محبت اور دوستی نہیں ہونی چاہئے۔

اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والے

اذان کا مذاق اڑانے والے

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ۔ (مائدہ۔58)

اور جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ (دین کی) سمجھ نہیں رکھتے۔

شانِ نزول: فتح مکہ والے دن حضور اکرم ﷺ نے حضرت بلال کو کعبۃ اللہ میں اذان کہنے کا حکم دیا۔ قریب ہی ابو سفیان بن حرب، عتاب بن اسید، حارث بن ہشام بیٹھے ہوئے تھے، عتاب نے تو اذان سن کر کہا میرے باپ پر تو اللہ کا فضل ہوا کہ وہ اس غصہ دلانے والی آواز کے سننے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسا (نعوذ باللہ)۔ حارث کہنے لگا اگر میں اسے سچا جانتا تو مان ہی نہ لیتا۔ ابو سفیان نے کہا بھئی میں تو کچھ بھی زبان سے نہیں نکالتا، ڈر ہے کہ کہیں یہ کنکریاں اسے خبر نہ کر دیں۔ انہوں نے یہ باتیں ختم کی ہی تھیں کہ حضورؐ آگئے اور فرمانے لگے اس وقت تم نے یہ یہ باتیں کیں ہیں، یہ سنتے ہی عتاب اور حارث تو بول پڑے کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، یہاں تو کوئی چوتھا تھا ہی نہیں، ورنہ گمان کر سکتے تھے کہ اس نے جا کر آپ سے کہہ دیا ہو گا۔ (سیرت ابن اسحاقؒ بحوالہ ابن کثیرؒ)

حدیث میں آتا ہے کہ جب شیطان اذان کی آواز سنتا ہے تو دور چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی کبریائی اسے پسند نہیں۔ جب تکبیر ختم ہوتی ہے تو پھر آکر نمازیوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ شیطان کی طرح شیطان کے پیروکاروں کو بھی اذان کی آواز اچھی نہیں لگتی، اس لئے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اس آیت سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث رسولؐ بھی قرآن کی طرح دین کا ماخذ اور اسی طرح حجت ہے۔ کیونکہ قرآن نے نماز کے لئے ندا یعنی اذان کا تو ذکر کیا ہے لیکن یہ ندا یا اذان کس طرح دی جائے گی؟ اس کے الفاظ کیا ہوں گے؟ یہ قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے۔ یہ چیزیں حدیث سے ثابت ہیں، جو اس کی حجیت اور ماخذ دین ہونے پر دلیل ہیں۔ حدیث کے ماخذ دین اور حجت شرعیہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرآن سے ثابت ہونے والے احکام و فرائض پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح حدیث رسول ﷺ سے ثابت شدہ احکام کا ماننا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ صحیح حدیث چاہے متواتر ہو یا آحاد، قولی ہو، فعلی ہو یا تقریری یہ سب قابل عمل ہیں۔ حدیث کا خبر واحد کی بنیاد پر یا قرآن سے زائد ہونے کی بنیاد پر یا آئمہ کے قیاس واجتہاد کی بنیاد پر یا راوی کی عدم فقاہت کے دعویٰ کی بنیاد پر یا عقلی استحالے کی بنیاد پر یا اسی قسم کے دیگر دعوؤں کی بنیاد پر رد کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ سب حدیث سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں۔ البتہ حدیث کی روایت اور درایت پر محدثین اصول حدیث کی روشنی میں تبصرہ فرما سکتے ہیں کہ آیا یہ حدیث صحیح ہے ضعیف ہے، شاذ ہے یا موضوع ہے۔

اہل کتاب کے اعتراض کی وجہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ۔59)

(اے پیغمبرؐ) آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! کیا تم ہم سے صرف اس بات پر ناراض ہو کہ ہم اللہ اور اس نے جو کچھ ہماری طرف یا ہم سے پہلے نازل کیا ہے ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور اور بیشک تمہارے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جو اہل کتاب تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں، ان سے کہو کہ تم نے جو عداوت ہم سے کرر کھی ہے، اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں کہ ہم اللہ پر اور اس کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ (اے اہل کتاب!) تم ہم سے یوں ہی ناراض ہو جب کہ ہمارا قصور اس کے سوا کوئی نہیں کہ ہم اللہ پر اور قرآن کریم اور اس سے قبل اتاری گئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

منافقین کے ایمان کی حیثیت

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ۔ (مائدہ۔61)

جب یہ (منافقین) تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

یہ منافقین کا ذکر ہے جو نبیؐ کی خدمت میں کفر کے ساتھ ہی آتے ہیں اور اسی کفر کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں۔ آپؐ کی صحبت اور آپ کے وعظ و نصیحت کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ دل میں تو کفر چھپا ہوتا ہے۔ اور رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضری سے مقصد ہدایت کا حصول نہیں، بلکہ دھوکہ اور فریب دینا ہوتا ہے، تو پھر ایسی حاضری سے فائدہ بھی کیا ہو سکتا ہے؟

گناہوں میں متحرک لوگ

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (مائدہ۔62)

آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر گناہ کے کاموں کی طرف اور ظلم و زیادتی کی طرف اور مال حرام کھانے کی طرف لپک رہے ہیں، جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ نہایت برے کام ہیں۔

يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ: وہ بلا دھڑک گناہوں میں مشغول ہیں یعنی گناہوں کے کرنے میں ان کو ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک عمل ہو یا بد جب کوئی انسان اس کو بکثرت کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ ایک ملکہ راسخہ اور عادت بن جاتی ہے۔ پھر اس کے کرنے میں اس کو کوئی مشقت اور تکلیف باقی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ۔ اسی طرح اچھی خصلتوں میں مداومت اور جلدی نیک لوگوں کی صفت ہے جس کیلئے یسارعون فی الخیرات کے الفاظ استعمال فرمائے۔

فسق و فجور پر علماء کی خاموشی

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (مائدہ۔63)

بھلا ان کے مشائخ اور علماء انہیں گناہ کی باتوں اور حرام کھانے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ بلاشبہ وہ بھی (برائی کے خلاف آواز بلند نہ کرکے) برا کرتے ہیں۔

یہ علماء و مشائخ دین اور عباد و زہاد پر تنقید ہے کہ عوام کی اکثریت تمہارے سامنے بدکاری اور حرام خوری کا ارتکاب کرتی ہے لیکن تم انہیں منع نہیں کرتے ایسے حالات میں تمہاری یہ خاموشی بہت بڑا جرم ہے۔

حدیث: حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب بنی اسرائیل نے برائیوں کا ارتکاب شروع کیا تو انکے علماء نے انہیں منع کیا۔ وہ گناہوں سے نہ رکے تو ان علماء نے بھی ان معصیت پیشہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا اور انکے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا۔ اللہ نے سب کو باہم ملا دیا (یعنی ان کے علماء کو بھی گناہگاروں میں شمار کیا گیا)۔ (مسند احمد)

جب بھی کوئی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ اور فساد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قانون کے نگران قانون شکنی کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ معاشرے کے اخلاقی رہنماء یعنی آئمہ دین اور علماء و مشائخ جب معاشرے کی بداخلاقیوں، خرابیوں، فساد اور ظلم پر سکوت کرتے ہیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں تو اس معاشرے کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بنی اسرائیل کا کیا جرم تھا یہی نہ کہ: كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ۔ کہ اُنہوں نے ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (مائدہ۔79)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کتنی اہمیت ہے اور اس کے ترک پر کتنی سخت وعید (سزا) بیان کی گئی ہے۔

ایک صحت مند معاشرے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اچھائی کا فروغ اور برائی سے نفرت فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔اس میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا مشن نیکی کا پھیلاؤ اور برائی کی روک تھا ہوتا ہے۔اس معاشرے کے عوام کے اندر بھی ایسے عناصر غالب ہوتے ہیں جو معاشرے کی نیک اور مثبت سر گرمیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرے میں ایسی مثبت روایات جڑ پکڑ لیتی ہیں وہاں بدی پروان نہیں چڑھ سکتی۔

اللہ وسعت اور کشادگی عطا کرنے والا ہے

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ۔۔۔ (مائدہ۔64)

اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں،عطا فرماتا ہے جیسے چاہے۔۔۔

یہ وہی بات ہے جو سورۃ آل عمران کی آیت 181 میں کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب اور اسے اللہ کو قرض حسن دینے سے تعبیر کیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو فقیر ہے،لوگوں سے قرض مانگ رہا ہے(نعوذباللہ)۔وہ تعبیر کے اس حسن کو نہ سمجھ سکے جو اس میں پنہاں تھا۔

اس آیت کے اندر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ مغلولہ یعنی وہ بندھے ہاتھوں والا نہیں ہے بلکہ وہ تو وسعت والا اور سخاوت والا ہے،وہ واسع الفضل اور جزیل العطاء ہے،تمام خزانے اسی کے پاس ہیں۔نیز اس نے اپنی مخلوقات کے لیے تمام حاجات وضروریات کا انتظام کیا ہوا ہے،ہمیں رات یا دن کو،سفر میں اور حضر میں اور دیگر تمام احوال میں جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے یا پڑ سکتی ہے،سب وہی مہیا کرتا ہے۔وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔تم نے جو کچھ اس سے مانگا وہ اس نے تمہیں دیا۔اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ تم گن نہیں سکتے انسان ہی نادان اور نہایت ناشکرا ہے۔(ابراہیم:14)

حدیث: حدیث میں بھی ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے،رات دن خرچ کرتا ہے لیکن کوئی کمی نہیں آتی،ذرا دیکھو تو،جب سے آسمان وزمین اس نے پیدا کئے ہیں وہ خرچ کر رہا ہے لیکن اس کے ہاتھ کے خزانے میں کمی نہیں آئی۔

اقامت دین کی برکات

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ۔ (مائدہ۔66)

کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں تو (انہیں مالی وسائل کی اس قدر وسعت عطا ہو جاتی کہ) وہ اپنے اوپر سے بھی اور اپنے نیچے سے بھی رزق کھاتے (مگر رزق ختم نہ ہوتا)۔ ان میں سے ایک گروہ میانہ رَو (یعنی اعتدال پسند ہے)، اور ان میں سے اکثر لوگ برے اعمال انجام دے رہے ہیں۔

بائیبل کی کتاب احبار (باب 26) اور استثناء (باب 28) میں حضرت موسیٰؑ کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اگر تم احکام الٰہی کی پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے، اور اگر کتاب اللہ کو پس پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں، پریشانیاں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہجوم کریں گی۔ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر قرآن کے اس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔

چودھواں رکوع: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔۔۔ (مائدہ-67)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

فریضہ دعوت و تبلیغ کی اہمیت، اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچاؤ (بلّغ ما انزل الیک من ربک)، اللہ نے اپنے نبیؐ کی حفاظت فرمائی (واللہ یعصمک من النّاس)، آپؐ کے خلاف سازشیں، کفر و سرکشی میں اضافہ، ہر امّت کے سچے ایماندار اللہ کے ہاں ضرور اجر پائیں گے، خود ساختہ معبود بنانا گناہ عظیم ہے، معبود حقیقی ایک ہی ہے یعنی اللہ ربّ العالمین، توبہ اور استغفار (افلا یتوبون الی اللہ ویستغفرونہ)، عیسیٰؑ صرف اللہ کے رسول تھے، نفع و نقصان کی مالک ہستی: اللہ ربّ العالمین، دین میں غلو اور انتہا پسندی سے بچو، مذہبی انتہا پسندی، عقیدت کا غلو، اعمال کا غلو، دینی گفتگو میں مبالغہ آرائی (لا تغلوفی دینکم غیر الحق)۔ گمراہ کن لوگوں کی پیروی نہ کرو۔

فریضہ دعوت و تبلیغ کی اہمیت

اللہ کا پیغام انسانیّت تک پہنچاؤ

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (مائدہ۔67)

اے رسولؐ! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر (دینی احکامات) اتارے گئے وہ لوگوں تک پہنچادو اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ منکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ المائدۃ۔67

اللہ ربّ العالمین اپنے پیارے حبیب ﷺ کو خطاب کرکے فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام لوگوں تک پہنچا دو۔ حضورؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔

حدیث: حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کے ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں فرمایا تھا کہ: تم میرے بارے میں کیا کہو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچایا اور اس کے پہنچانے کا حق ادا کردیا۔ اس پر آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اللّٰھُمّ فَاشْھَدْ۔۔۔ یعنی اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچادیا، تم گواہ رہو۔ (مسلم۔ کتاب الحج)

حدیث: مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ آپ نے اس خطبے میں پوچھا کہ لوگو یہ کونسا دن ہے؟ سب نے کہا حرمت والا، پوچھا یہ کونسا شہر ہے، جواب دیا، حرمت والا۔ فرمایا یہ کونسا مہینہ ہے؟ جواب ملا، حرمت والا، فرمایا پس تمہارے مال اور خون و آبرو آپس میں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرمت والے ہیں جیسے اس دن کی اس شہر میں اور اس مہینے میں حرمت ہے۔ پھر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا اے اللہ! کیا میں نے پہنچادیا؟ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: فلیبلغ الشاهد الغائب۔ دیکھو ہر حاضر شخص غیر حاضر کو یہ پیغام (دین) پہنچادے۔

غائبین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود تھے، مگر مجمع میں حاضر نہ تھے۔ اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہنچانے کا طریقہ دعوت و تبلیغ تھا جس کو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے پوری کوشش سے انجام دیا۔ اور یہ فریضہ دعوت دین امت مسلمہ پر انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں پر حسب استطاعت اور حکمت کے ساتھ ہر دور میں اور ہر جگہ فرض قرار دیا گیا۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ عام حالات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول کریم ﷺ کے ارشادات و کلمات کو اللہ کی ایک بھاری امانت کی طرح محسوس فرمایا، اور مقدور بھر اس کی کوشش کی کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے سنا ہوا کوئی جملہ ایسا نہ رہ جائے جو امت کو نہ پہنچے۔ اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی نے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کیا تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنا دیا، تاکہ وہ اس امانت سے سبکدوش ہو جائیں۔ صحیح بخاری میں حضرت معاذؓ کی ایک حدیث اپنی موت کے وقت بیان فرمائی، تاکہ اس امانت کے نہ پہنچانے کی وجہ سے گنہگار نہ ہو جائیں۔

اس حکم بَلِّغْ کے اندر فریضہ دعوت و تبلیغ ادا کرنے والوں کیلئے ہدایت ہے کہ حق کی دعوت کو حکمت کے ساتھ صاف اور دوٹوک انداز میں پیش کر دیں۔ حکمت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کتمان حق شروع کر دے۔ مبلغین کی ذمہ داری دعوت کا ابلاغ ہے۔ البتہ کسی سے منوانا ان کی ذمہ داری نہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: حضور ﷺ کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر بھی فرمائی اور دنیاوی اسباب کے تحت بھی فرمائی۔ اس حفاظت کی ایک مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے چچا ابوطالب کے دل میں آپؐ کی محبت اور احترام ڈال دیا جس کے نتیجے میں وہ آپؐ کی حفاظت کرتے رہے۔ ابوطالب کا ایمان قبول نہ کرنا بھی شاید انہی اسباب کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ مسلمان ہو جاتے تو شاید سرداران قریش کے دل میں ان کی عظمت و شان نہ رہتی جو ان کے ہم مذہب ہونے کی صورت میں آخر وقت تک رہی۔ ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے انصار کے دلوں میں حضورؐ کی محبت پیدا کر دی اور آپ انہیں کے ہاں چلے گئے۔ اب تو دشمنان اسلام بڑے بڑے ساز و سامان لشکر لے کر چڑھ دوڑے، لیکن بار بار کی ناکامیوں نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اسی طرح آپؐ کو نقصان پہنچانے کی اور بھی خفیہ سازشیں ہوتی رہیں، قدرت نے وہ بھی انہی پر الٹ دیں۔ ہجرت سے پہلے آپؐ کے قتل کی سازش کی گئی تو آپؐ نے اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلا دیا جس سے دشمن کا وار ناکام ہوا۔ ادھر وہ جادو کرتے ہیں، ادھر سورۃ معوذتین نازل ہوتی ہے اور ان کا جادو اتر جاتا ہے۔ ادھر وہ بکری کے شانے میں زہر ملا کر حضورؐ کی دعوت کر کے آپ کے سامنے رکھتے ہیں، ادھر اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو ان کی دھوکہ دہی سے آگاہ فرما دیتا ہے اور یہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک سفر میں آپ ایک درخت تلے دوپہر کے وقت قیولہ کر رہے تھے تو ایک اعرابی اچانک آ نکلا، آپ کی تلوار جو اسی درخت میں لٹک رہی تھی، اتار لی اور میان سے باہر نکال لی اور آپ سے کہنے لگا، اب بتا کون ہے جو تجھے بچا لے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میرا اللہ مجھے بچائے گا، اسی وقت اس اعرابی کا ہاتھ کانپنے لگتا ہے اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ آپؐ کی حفاظت کے اور بھی کئی واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

آیت کے آخری حصّہ کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے۔ حساب کا لینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ منکروں اور ناشکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

کفر و سرکشی میں اضافہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭوَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (مائدہ۔68)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم دراصل کسی چیز پر نہیں جب تک کہ تورات و انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا قائم نہ کرو، اور ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل ہوا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھائے گا مگر انکار کرنے والاوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔

توراۃ اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انہیں اپنا دستور زندگی بنانا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر نبی اکرم ﷺ کے دور کے اہل کتاب اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کی آسمانی کتابوں (تورات، انجیل) میں اللہ اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً نبی اکرم ؐ کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی اکرم ؐ کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیل مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوتا بلکہ وہ اسی راستہ کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آرہے تھے، آپ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔
یہ ہدایت اور گمراہی اس اصول کے مطابق ہے جو سنت اللہ رہی ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ یعنی جس طرح بعض اعمال و اشیاء سے اہل ایمان کے ایمان و تصدیق، عمل صالح اور علم نافع میں اضافہ ہوتا ہے، اسی طرح معاصی اور سرکشی سے کفر و طغیان میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان فرمایا: اور ہم قرآن کے ذریعے سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔ (القرآن)

ہر امت کے سچے ایماندار اللہ کے ہاں ضرور اجر پائیں گے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (مائدہ۔69)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابئی اور نصاریٰ ہیں۔ ان میں سے جو کوئی بھی اللہ اور قیامت پر ایمان لایا اور نیک کام کیے تو ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (مائدہ۔69)

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا کہ جس نے بھی اپنے اپنے دور کے نبی کی سچی فرمانبرداری کی، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا وہ آخرت میں اللہ کے ہاں اجر پائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ بقرہ کی آیت 62 میں بیان ہوا ہے۔ اس آیت کی مزید تشریح سورۃ بقرہ آیت 62 کے تحت گذر چکی ہے۔

خود ساختہ معبود بنانا گناہ عظیم ہے

معبود حقیقی تو ایک ہی ہے

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ۔۔ (مائدہ۔73)

توبہ اور استغفار

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (مائدہ۔74)

یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کیوں نہیں کرتے جب کہ اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

عیسٰیؑ صرف اللہ کے رسول تھے

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (مائدہ۔75)

مسیح ابن مریمؑ اللہ کے رسول کے سوا کچھ نہیں یقیناً ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ ایک راست باز عورت تھی۔ وہ دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے تھے۔ (اے پیغمبرؐ) دیکھئے ہم ان (کی رہنمائی) کے لئے کس طرح آیتوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں پھر دیکھئے کہ (اس کے باوجود) وہ کس طرح (حق سے) پھرے جا رہے ہیں۔

ان چند لفظوں میں عیسیٰ علیہ اسلام سے متعلق عقیدہ الوہیت کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ جامعیت ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا تو اس آیت میں بیان کردہ علامات سے معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرہ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود سے محدود اور ان تمام قیود سے مقید اور ان تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا،

حتیٰ کہ جسے شیطان کے ذریعہ سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا،اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک ہے۔

نفع و نقصان کی مالک ہستی: صرف اللہ ربّ العالمین

قُلْ اَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔(مائدہ۔76)

آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے۔ اللہ ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے

اس آیت میں یہ وضاحت کی جا رہی ہے کہ سمیع و علیم ذات صرف اللہ ربّ العالمین کی ہے۔ حاجت روا، مشکل کشا بھی صرف وہی ہے۔

دین میں غلو اور انتہا پسندی سے بچو

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ (مائدہ۔77)

کہو، اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، اور اور سیدھی راہ سے دور ہو گئے۔

غلو اور مذہبی انتہا پسندی ہر دور میں گمراہی کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے۔ انسان کو جس سے عقیدت اور محبت ہوتی ہے، وہ اس کی شان میں خوب مبالغہ کرتا ہے۔ اپنے روحانی مرشد اور مذہبی پیشواء کو حد سے زیادہ مقام و مرتبہ عطا کرنا اور ہر جائز ناجائز حکم پر سر اطاعت خم کرنا عقیدت کا غلو ہے۔ بد قسمتی سے مسلمان بھی اس غلو سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ انہوں نے بعض نیک ہستیوں کی شان میں غلو کیا جس سے شرک اور گمراہی کے راستے کھلے۔ اعمال میں غلو اس کے علاوہ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اتباع دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور جو پابندیاں اللہ نے نہیں لگائیں وہ خود بخود اپنے اوپر لاگو نہ کرو۔ جن کی تعظیم کا حکم دیا گیا ہے، اس میں مبالغہ کر کے انہیں مقام الوہیت پر فائز مت کرو۔

چھٹے پارے کا آخری رکوع: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔۔۔ (مائدہ۔78)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اللہ کی رحمت سے دوری کے اسباب: ذٰلک بما عصوا وکانو یعتدون۔عصیان، فرائض وواجبات کا ترک، محرمات کا ارتکاب، دین میں غلو، مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی، بدعات، ظلم وزیادتی، سرکشی، نافرمانی۔فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے غفلت: کانو لا یتناھون عن منکر فعلوہ۔۔ انہوں نے ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکنا چھوڑ دیا تھا، فریضہ دعوت وتبلیغ سے غفلت سوسائٹی کو بے دین کر دیتا ہے، بعض مذاہب کے لوگوں کی اسلام دشمنی اور بعض کی اسلام دوستی کا ذکر، بعض اہل کتاب کی حق پرستی کی تعریف، نجاشی کے بارے میں آیات، مدینہ میں عیسائی وفد کی آمد، نبی اکرمؐ کی زبانی قرآن سنا، رقت طاری، دل نرم، ندامت کے آنسو، قرآن میں دوسرے مذاہب کے اچھے لوگوں کی تعریف۔

اللہ کی رحمت سے دوری کے اسباب: دین میں غلو، سرکشی اور نافرمانی

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ (مائدہ۔78)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داوٗدؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔

اس آیت میں اللہ کی رحمت سے دوری کے اسباب بیان کئے گئے ہیں:

1۔عصیان: یعنی واجبات کا ترک اور محرمات کا ارتکاب کرکے انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی۔

2۔دین میں غلو اور انتہا پسندی۔

3۔اس کے علاوہ انہوں نے بدعات ایجاد کرکے بھی حد سے تجاوز کیا۔

4۔ظلم وزیادتی

5۔سرکشی

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں کرتا لیکن اس وقت کہ برائیاں ان میں پھیل جائیں اور وہ باوجود قدرت کے انکار نہ کریں، اس وقت عام خاص سب کو اللہ تعالیٰ عذاب میں گھیر لیتا ہے۔(مسند احمد)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

آخری رکوع میں پچھلی قوموں کی گمراہی اور اللہ کی رحمت سے دوری کا ایک سبب یہ بتایا گیا کہ گناہ ہوتے رہتے تھے مگر روکنے والا (نھی عن المنکر کرنے والا) کوئی نہیں ہوتا تھا۔

ہر قوم کا بگاڑ ابتدا میں چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام ان بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملہ میں تساہل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انہیں سوسائیٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے، تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخر کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کی موجب ہوئی:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔۔ (مائدہ۔79)

اُنھوں نے ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا طرز عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا۔

اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ فریضہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے غفلت سوسائٹی کو بے دین کر دیتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسی ترک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو عصیان اور اعتدا یعنی حد سے بڑھنا بھی قرار دیا ہے جو لعنت اللہ یعنی اللہ کی رحمت سے دوری کا سبب بھی بنا۔ بہر حال برائی کو دیکھتے ہوئے برائی سے نہ روکنا، بہت بڑا گناہ اور لعنت و غضب الٰہی کا سبب ہے۔ حدیث میں بھی اس جرم پر بڑی سخت وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

حدیث: ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلا گناہ جو بنی اسرائیل میں داخل ہوا یہ تھا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو کہتا، اللہ سے ڈر اور یہ برائی چھوڑ دے، یہ تیرے لیے جائز نہیں۔ لیکن دوسرے روز پھر اسی کے ساتھ اسے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی عار یا شرم محسوس نہ ہوتی، (یعنی اس کا ہم نوالہ، ہم پیالہ و ہم نشین بن جاتا)۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان آپس میں عداوت ڈال دی اور وہ لعنت الٰہی

کے مستحق قرار پائے (یعنی رحمت الٰہی سے دور کر دیئے گئے۔) پھر فرمایا کہ اللہ کی قسم! تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکا کرو، ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا کرو، ورنہ تمہارا بھی یہی حال ہو گا۔

حدیث: ایک دوسری روایت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کے ترک پر یہ وعید سنائی گئی ہے کہ تم عذاب الٰہی کے مستحق بن جاؤ گے پھر تم اللہ سے دعائیں بھی مانگو گے تو قبول نہیں ہوں گی۔ (مسند احمد)

حدیث: عدی ابن عمیرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ خاص گناہگاروں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ ہاں جب وہ اپنے درمیان برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتے ہوں مگر نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ خاص مجرموں کی وجہ سے عام لوگوں کو بھی مبتلائے عذاب کرتے ہیں۔ (مسند احمد)

نجاشی کے بارے میں آیات

بعض اہل کتاب کی حق پرستی

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (مائدہ۔82)

اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا عابد پائے جاتے ہیں اور اُن میں غرور نفس نہیں ہے۔

یہ آیت اور اس کے بعد کی چار آیتیں نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہیں۔ جب ان کے سامنے حبشہ کے ملک میں حضرت جعفر بن ابو طالب نے قرآن کریم پڑھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیتیں اس عیسائی وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جسے نجاشی نے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ وہ آپ سے ملیں، حاضر خدمت ہو کر آپ کے حالات وصفات دیکھیں اور آپ کا کلام سنیں۔ جب یہ آئے، آپؐ سے ملے اور آپ کی زبان مبارک سے قرآن کریم سنا تو ان کے دل نرم ہو گئے، ندامت کے آنسو بہائے اور اسلام قبول کیا اور واپس جا کر نجاشی سے سارا حال بیان کیا تو وہ بھی اسلام قبول کرنے پر رضامند ہو گیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسری صحیح روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ نجاشی فوت ہوئے تو حضورؐ نے صحابہ کرام کو ان کے انتقال کی خبر دی اور ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

رُهْبَانُ سے مراد نیک، عبادت گزار اور گوشہ نشین لوگ جن کو عموماً ہم عابد و زاہد کہتے ہیں۔

قِسِّيْسِيْنَ سے مراد علماء و خطباء ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان اہل کتاب نصاریٰ میں علم و تواضع ہے، ان میں جمود و استکبار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عیسیٰؑ کی مشہور تعلیمات میں میں نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان آیات میں اصل اشارہ حبشہ کے مشہور بادشاہ نجاشی کی اسلام دوستی اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کی طرف ہے جس کا ذکر سیرت اور تاریخ کی تقریباً تمام کتابوں میں ملتا ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً۔ یعنی ہم نے حضرت عیسیٰؑ کے (سچے) فرمانبرداروں میں نرمی اور رحم دلی ڈال دی ہے۔ (سورہ حدید۔27)

امام ابن جریرؒ کا قول ان سب اقوال سے جامع ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتیں ان تمام (غیر مسلم) لوگوں کے بارے میں ہیں جن میں یہ اوصاف ہوں (مثلاً اسلام دوستی، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، نرمی، رحمت) خواہ وہ حبشہ کے ہوں یا کہیں کے۔ (بحوالہ ابن کثیرؒ)

اس نکتہ یعنی دوسرے مذاہب کے اچھے لوگوں کی تعریف اگلے پارے کے شروع میں بھی بیان کی گئی ہے۔

پارہ – 7

قرآن مجید کا ساتواں پارہ سورۃ المائدہ کی آیات 83 تا 120 اور سورۃ الانعام کی پہلی 110 آیات پر مشتمل ہے۔

اہم تفسیری نکات

پہلا رکوع: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ۔۔۔ (مائدہ۔83)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

اس رکوع کا پہلا حصہ چھٹے پارے کے آخر میں گذر چکا ہے جس میں اللہ کی رحمت سے دوری کے اسباب: ذٰلک بما عصوّا وکانو یعتدون۔ عصیان، فرائض وواجبات کا ترک، محرمات کا ارتکاب، دین میں غلو، مبالغہ آرائی اور انتہاپسندی، حد سے تجاوز کرنا، بدعات، ظلم وزیادتی، سرکشی، نافرمانی۔ فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے غفلت: کانو لا یتناھون عن منکر فعلوہ۔۔، بعض مذاہب کے لوگوں کی اسلام دشمنی اور بعض کی اسلام دوستی کا ذکر، بعض اہل کتاب کی حق پرستی کی تعریف، نجاشی کے بارے میں آیات، مدینہ میں عیسائی وفد کی آمد، نبی اکرمؐ کی زبانی قرآن سنا اور اثر قبول کیا۔

اس رکوع کے دوسرے حصے یعنی ساتویں پارے کے آغاز میں وہی مضمون بیان ہو رہا ہے جو چھٹے پارے کے آخر میں بیان ہو رہا تھا یعنی دوسرے مذاہب کے اچھے لوگوں کی تعریف کی گئی۔ فرمایا گیا کہ تمام اہل کتاب یکساں نہیں۔ بعض اہل کتاب کی حق پرستی بیان کی گئی: ترٰی اعینهم تفیض من الدمع مما عرفو من الحق۔
اہل ایمان کی پہچان اور ان کیلئے خصوصی اجر، حسن نیت، حسن عمل کی برکات۔ محسنین یعنی بھلائی کرنے والوں کیلئے اجر وثواب: وذٰلک جزاء المحسنین۔

قرآن میں دوسرے مذاہب کے اچھے لوگوں کی تعریف

ایمان والوں کی پہچان

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَـهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ۔ (مائدہ۔83)

جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو دیکھے گا کہ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اس لیے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا، کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے پس تو ہمیں ماننے والوں کے ساتھ لکھ لے۔ المائدہ۔83

ان آیات میں اہل کتاب میں سے ایسے لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو ادب اور لحاظ سے کلام اللہ سنتے بھی ہیں، اس سے اثر بھی لیتے ہیں اور نرم دلی کی وجہ سے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ اس سے پہلے چھٹے پارے کے آخر میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ نصاریٰ میں سے جو نیک دل لوگ دین اسلام سے ہمدردی رکھتے ہیں ان میں اور بھی اچھے اوصاف ہیں مثلاً عبادت، علم، تواضع، انکساری، انسانی ہمدردی، رحمدلی وغیرہ، ایسے لوگ ادب اور لحاظ سے کلام اللہ سنتے ہیں، اس سے اثر لیتے ہیں کیونکہ وہ حق کو سمجھ سکتے ہیں (مثلاً نجاشی اور دوسرے اہل کتاب)۔

حضرت عبداللہ بن زبیر (رض) فرماتے ہیں یہ آیتیں عیسائی بادشاہ نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا بیان ہے کہ کچھ عیسائی لوگ حضرت جعفر بن ابی طالب (رض) کے ساتھ حبشہ سے آئے تھے حضور کی زبان مبارک سے قرآن کریم سن کر ایمان لائے اور کلام اللہ کے اثر سے رونے لگے۔

انہیں کا بیان ان آیتوں میں ہے کہ قرآن سننے کے بعد وہ کہتے ہیں:

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ۔ (مائدہ۔84)

اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اِس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟

ان آیات میں قرآن سن کر ان پر جو اثر ہوا اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ان کے ایمان لانے کا تذکرہ ہے قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر اس قسم کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً: وان من اهل الكتاب لمن يومن بالله وما انزل اليكم وما انزل اليهم خاشعين لله۔ (سورہ آل عمران) یقیناً اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کے آگے عاجزی کرتے ہیں۔

ہجرت حبشہ کے واقعات میں بیان کیا گیا کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے مصاحبین اور امرا کے سامنے جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سورۃ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں تو ان سب کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور نجاشی نے کہا کہ یہ قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو لے کر آئے ہیں، یہ سب ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں۔(فتح القدیر)

حدیث: حدیث میں آتا ہے کہ جب نجاشی کی موت کی خبر نبی اکرم ﷺ تک پہنچی تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنھم اجمعین سے فرمایا کہ حبشہ میں تمہارے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے اس کی نماز جنازہ پڑھو چنانچہ ایک صحرا میں آپؐ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔(بخاری، مسلم)

حدیث: حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہل کتاب میں سے جو اپنے نبی کو مان کر پھر مجھ پر بھی ایمان لائے ان کیلئے دوہرا اجر ہے۔ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت پر ایمان لائیں گے انہیں دوگنا اجر ملے گا۔(بخاری۔کتاب العلم)

قرآن مجید کی اگلی آیت میں ایسے لوگوں کیلئے خصوصی اجر کا ذکر ہے:

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕوَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ۔(مائدہ۔85)

اُن کے اِس قول کی وجہ سے اللہ نے اُن کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔

اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ بعض اہل کتاب دل کے سچے ہیں اور ان کی زبان صداقت کا شعار ہے۔وہ صراط مستقیم پر چلنا چاہتے ہیں۔چونکہ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں اس لئے اللہ نے ان کی اس حسن نیت اور حسن عمل کو قبول کر لیا اور ان کے لئے جزائے آخرت لکھ دی۔اس پر اپنی گواہی بھی قائم کر دی کہ یہ لوگ نیک ہیں اور یہ ہے جزاء محسنین کی: وَذٰلِکَ جَزَاءِ الْمُحْسِنِيْنَ۔اور یہی بدلہ ہے نیکو کاروں کا۔

احسان ایمان اور اسلام کے اعلیٰ درجات کو کہتے ہیں اور اللہ بذات خود شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ گروہ محسنین میں سے ہیں لہٰذا یہ آیات ایک خاص گروہ کے بارے میں ہیں جس کے خدوخال بالکل واضح ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ حکم ہے: وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُواْ الَّذِيْنَ قَالُوْاْ إِنَّا نَصَارَى۔۔۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر تم ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔یہ ایک ایسا گروہ

ہے کہ جب وہ حق بات کو سنتا ہے تو سرکشی نہیں کرتا بلکہ وہ دل کی گرائیوں سے اسے قبول کرتا ہے اور اس قبولیت کا برملا اعلان کرتا ہے۔

قران مجید کے اندر سورۃ قصص آیت 52 کے اندر بھی فرمایا گیا:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۔

جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا کی تھی وہ (اسی ہدایت کے تسلسل میں) اس (قرآن) پر (بھی) ایمان رکھتے ہیں۔ (قصص۔52)

تفسیر ابن کثیر کے مطابق اس آیت سے مراد یہودی عالم عبد اللہ بن سلام وغیرہ ہیں۔ یا اس سے مراد وہ عیسائی ہیں جو حبشہ سے نبی ﷺ کی خدمت میں آئے تھے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دوبار دیا جائے گا اُس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (قصص۔54)

دوسرے مذاہب کے نیک لوگوں کا ذکر سورۃ آل عمران میں بھی گذر چکا ہے۔ یعنی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر، اللہ کی آیات پر، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر اللہ سے ڈرنے والے بھی ہیں یعنی:

سب اہل کتاب یکساں نہیں

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ (آل عمران۔115-113)

مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اسکے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں یہ صالح لوگ ہیں۔ (آل عمران۔113۔114)

یہ آیات اہل کتاب کے علماء عبد اللہ بن سلام، اسد بن عبید، ثعلبہ بن شعبہ وغیرہ کے بارے میں آئیں۔ (ابن کثیر)

دوسرا رکوع: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ۔۔۔ (مائدہ۔87)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو: لاتحرموطیبات مااحل اللہ لکم۔ اسلام میں رہبانیت یعنی ترک دنیا حرام ہے، رہبانیت سے کیا مراد ہے؟ حلال چیزوں کو حرام سمجھنے کے تین درجے (اعتقادی، قولی یا عملاً حرام سمجھنا)۔ حلال و حرام میں خود ہی اتھارٹی نہ بن جاؤ، حد اور راہ اعتدال سے تجاوز نہ کرو: وَلَا تَعْتَدُوْا، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ حلال اور طیب چیزیں استعمال کرو۔ حلف اور قسم کا مفہوم، اقسام اور ان کے احکامات، اپنے حلف و قسم کی پاسداری کرو: وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ۔ اللہ کے نام کو جھوٹے حلف و قسم کیلئے استعمال نہ کرو: وَلَا تَجْعَلُوا اللهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ۔ (بقرہ۔224)

ممنوعات: الخمر والمیسر والانصاب والازلام۔ نشہ آور اشیاء، شراب، جواء، قمار بازی، غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز، توہمات و فال گیری، گیم آف چانس، لاٹری، علم نجوم، شرط، شطرنج۔ قرعہ اندازی کی جائز صورتیں، فال نکالنے کے بجائے استخارہ کرو۔ نشہ اور جوئے کے دینی، اخلاقی و سماجی نقصانات، انسانی صحت اور نفسیات پر اثرات۔

رسول کی ذمہ داری ابلاغ دعوت ہے۔ قبول اسلام اور سچی توبہ سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ رکوع کا اختتام اللہ کی صفت رحمت و محبت پر ہوتا ہے: وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اللہ محسنین یعنی نیکی و بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (مائدہ۔87)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کی ہیں ان اپنے اوپر حرام مت کرو اور حد سے آگے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کی شان نزول میں کئی روایات آتی ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام زہد و عبادت کی غرض سے بعض حلال چیزوں سے (مثلاً شادی، نکاح کرنے، رات کے وقت سونے، دن کے وقت کھانے پینے سے) اجتناب کرنا چاہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے انہیں منع فرمایا۔

رہبانیت (ترک دنیا۔ سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنا) اسلام میں حرام اور ممنوع ہے

رہبانیت یا ترک دنیا سے کیا مراد ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رہبانیت یا ترک دنیا اصل میں ہے کیا اور کونسی چیزیں اس میں داخل ہیں؟

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں:

ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے۔

دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرے۔ مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا۔

تیسرے یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قرآن وسنّت سے ثابت ہو تو اس حلال چیز کو اعتقاداً حرام سمجھنے والا احکام الٰہی کا منکر ہوگا۔ اور دوسری صورت میں اگر الفاظ قسم یا حلف اٹھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے، تو قسم لاگو ہو جائے گی۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ قسم ادا کرے۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ کبیرہ ہے۔

ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیت ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی بیماری کے سبب کسی چیز سے پرہیز کرے یا دائمی طور پر چھوڑ دے تو یہ جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

قرآن کی اس آیت (مائدہ۔87) نے واضح کر دیا کہ حلال اور پاکیزہ چیزوں کو ثواب سمجھ کر چھوڑ دینا تقویٰ نہیں، بلکہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ تقویٰ اس میں ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر استعمال کرے، اور شکر ادا کرے، ہاں کسی بیماری کی وجہ سے بطور علاج کسی چیز کو چھوڑے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت (مائدہ۔87) میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

پہلی بات یہ ہے حلال و حرام کے سلسلے میں خود ہی اتھارٹی نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو دین و شریعت کے بجائے خواہشات نفس کے پیروکار بن جاؤ گے۔

دوسری بات یہ کہ رہبانیت کے راستے پر نہ چلو۔ حدیث مبارکہ کے اندر بھی آتا ہے: لا رھبانیتہ فی الاسلام ۔ اسلام میں ترک دنیا کوئی دینداری نہیں۔ بعض شدت پسند مذہبی لوگوں کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ ہر نعمت کو اپنے اوپر حرام سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح ا، اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنے سے قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ حد سے تجاوز کرنا وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا کہ وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔ اللہ کو یہ تینوں باتیں ناپسند ہیں۔

حدیث: کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آپؐ کی عبادت کے متعلق پوچھنے آئے، جب انہیں نبی کریمؐ کا عمل بتایا گیا تو جیسے انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہا کہ ہمارا نبی کریمؐ سے کیا مقابلہ! آپؐ کی تو تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ آج سے میں ہمیشہ رات بھر نوافل پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ نفلی روزے سے رہوں گا اور کبھی ناغہ نہیں ہونے کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے جدائی اختیار کر لوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ پھر نبی کریمؐ تشریف لائے اور آپؐ کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ ایسی باتیں کہ کر گئے ہیں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کیا تم نے ہی یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ رب العالمین سے میں تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں لیکن میں اگر روزے رکھتا ہوں تو افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں (رات میں) اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا

ہوں۔فمن رغب عن سنتي فليس مني، جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔(بخاری)

حدیث: حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آکر کہا کہ یارسول اللہ! جب میں گوشت کھاتا ہوں تو نفسانی شہوت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے، جس پر آیت نازل ہوئی۔

بہر حال اس آیت اور احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ کسی بھی چیز کو حرام کر لینا یا اس سے بلاوجہ پرہیز کرنا جائز نہیں ہے چاہے اس کا تعلق کھانے پینے یا مشروبات سے ہو یا لباس سے ہو یا مرغوبات و جائز خواہشات سے۔

حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔

اور اللہ نے تمہیں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ۔ اور اسی اللہ سے ڈرو (اس کی نافرمانی سے بچو) جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ المائدہ۔88

حلف وقسم کے احکامات

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (مائدہ۔89)

تم لوگ جو لغو قسمیں کھالیتے ہو اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو اُن پر ضرور تم سے مواخذہ کرے گا (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا کر توڑ دو اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اپنے اوپر بعض کھانے، بعض لباس اور عورتوں کے ساتھ نکاح حرام کر لیا تھا' انہوں نے اس پر حلف بھی اٹھایا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی "اللہ کی پاک چیزیں اپنے اوپر حرام نہ کرو" تو انہوں نے پوچھا کہ ہماری قسموں کا کیا بنے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لغو قسموں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں کرتا۔

قسم و حلف کا مفہوم اور اقسام:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عہد و پیمان اور حلف کی پابندی کی تاکید فرمائی:

قسم جس کو عربی میں حلف یا یمین کہتے ہیں جن کی جمع احلاف اور ایمان ہے۔ اس کی تین اقسام ہیں:

1۔ لغو، 2۔ غموس۔ 3۔ معقدۃ

لَغْوٌ: وہ قسم ہے جو انسان بات بات میں عادتاً بغیر ارادے اور نیت کے کھاتا رہتا ہے۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں. لیکن یہ ایک بری عادت ہے۔ اسی طرح بلا قصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی یمین لغو کہا جاتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس پر کفارہ ہے نہ گناہ۔

غَمُوْسٌ: وہ جھوٹی قسم ہے جو انسان دھوکہ اور فریب دینے کے لئے کھائے۔ یہ کبیرہ گناہ بلکہ اکبر الکبائر میں سے ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کیا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس نے یہ کام کیا ہے، اور پھر جان بوجھ کر قسم کھالے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم ہے، سخت گناہ کبیرہ اور موجب وبال دنیا و آخرت ہے مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ و استغفار لازم ہے اسی لئے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہا جاتا ہے، کیونکہ غموس کے معنی غرق کر دینے والی کے ہیں یعنی یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کر دینے والی ہے۔

مُعَقَّدَةٌ: وہ قسم ہے جو انسان اپنی بات میں تاکید اور پختگی کے لئے ارادہ اور نیت کے ساتھ کھائے، ایسی قسم اگر توڑے گا تو اس کا وہ کفارہ ہے جو آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

قسم کا کفارہ

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ۔۔۔: (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ (مائدہ۔89)

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ: اور اپنی قسموں کا خیال رکھو۔(مائدہ۔89)

قسم اور عہد و حلف کے حوالے سے اس سے پہلے بھی سورہ بقرہ آیت 224 میں ہدایت گذر چکی ہے کہ:

اللہ کے نام کو جھوٹی قسموں کیلئے استعمال نہ کرو

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

اللہ کے نام کو قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو تاکہ تم نیکوکار، پرہیز گار بن سکو۔ اور لوگوں میں صلح کرا سکو اور اللہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ البقرہ۔224

حدیث: حضور ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے فرمایا اے عبدالرحمن سرداری، امارت کو طلب نہ کر اگر بغیر مانگے دی جائے گا تو اللہ کی جانب سے تیری مدد کی جائے گی اور اگر تو نے خود مانگ کر لی ہے تو تجھے اس کی طرف سونپ دیا جائے گا۔ تو اگر کوئی قسم کھا لے اور اس کے خلاف بھلائی دیکھ لے تو اپنی قسم کا کفارہ دے دے اور اس نیک کام کو کر لے۔ (بخاری و مسلم)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

قسموں کو مذاق نہ بناؤ

فضول قسمیں نہ اٹھاؤ

!ممنوعات۔ نشہ آور اشیاء، جواء وغیرہ،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (مائدہ۔90)

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر سب اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔(مائدہ۔90)

اس آیت مبارکہ میں چار چیزیں حرام کی گئی ہیں:

1: شراب

2: جواء یا قمار بازی

3: غیر اللہ کے نام پر نذرونیاز (آستانوں پر چڑھاوے) یعنی وہ مقامات جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا کسی اور کے نام پر قربانی کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔

4: چوتھی چیز توہمات اور فال گیری کی ممانعت۔ ایسی قرعہ اندازی جو مشرکانہ عقائد اور توہمات سے آلودہ ہو۔ اور میسر کا اطلاق ان کھیلوں اور ان کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقیہ کمائی، قسمت آزمائی کو تقسیم اموال و اشیاء کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مثلاً لاٹری وغیرہ۔ اس کو انگریزی میں گیم آف چانس کہا جاتا ہے۔ اس کے دو معنی کیے گئے ہیں ایک تیروں کے ذریعے تقسیم کرنا دوسرے تیروں کے ذریعہ قسمت معلوم کرنا مثلاً فال نکالنا وغیرہ۔ پہلے معنی کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جوئے وغیرہ میں ذبح شدہ جانور کی تقسیم کے لیے یہ تیر ہوتے تھے جس میں کسی کو کچھ مل جاتا، کوئی محروم رہ جاتا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ علم نجوم یا جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے اس ممانعت کے حکم میں ہیں۔ اَزْلَامُ کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے، یہ بھی بنص قرآن حرام ہے جس کو اس آیت میں میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیر، مجاہد اور شعبی نے فرمایا کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ بھی ازلام کے حکم میں ہیں (مظہری)۔

قرعہ اندازی کی جائز صورت

قرعہ اندازی کی جائز صورتیں بھی موجود ہیں۔ جب کسی چیز میں سب کے مساوی حقوق ہوں اور حصے بھی مساوی تقسیم کر دیئے گئے ہوں پھر ان میں سے حصوں کی تعیین بذریعہ قرعہ اندازی کر لی جائے، مثلاً ایک مکان چار شریکوں میں تقسیم کرنا ہے تو قیمت کے لحاظ سے چار حصے برابر کر لئے گئے، اب یہ تعین کرنا کہ کونسا حصہ کس شریک کے پاس رہے، اس کی تعیین اگر آپس میں مصالحت و رضامندی سے نہ ہو سکے تو اس بات کی اجازت ہے کہ قرعہ اندازی کر کے جس کے نام پر جو حصہ نکل آئے اس کو دے دیا جائے۔ قرعہ اندازی کی ایک اور جائز صورت یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کے خواہش مند ایک ہزار ہیں، اور سب کے حقوق مساوی ہیں مگر جو چیز تقسیم کرنا ہے اس کی تعداد صرف ایک سو ہے تو ایسی تمام صورتوں میں قرعہ اندازی کے ذریعے سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

فال گیری کے بجائے استخارہ کا حکم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تیروں سے قسمت معلوم کرنا اور فال گیری حرام ہے، ایسا کام کا کرنا فسق، گمراہی، جہالت اور شرک ہے۔ اس کے بجائے اہل ایمان کو حکم ہوا کہ جب تمہیں اپنے کسی کام میں تردد ہو تو تم اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرلو، اس کی عبادت کرکے اس سے بھلائی طلب کرو۔ مسند احمد، بخاری اور سنن میں مروی ہے حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ جس طرح قرآن کی سورتیں سکھاتے تھے، اسی طرح ہمارے کاموں میں استخارہ کی تعلیم بھی فرماتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سے کسی کو کوئی اہم کام آپڑے تو اسے چاہئے کہ دو رکعت نفل نماز نفل پڑھ کر یہ دعا پڑھے:

اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر۔۔۔ خیر لی فی دینی ودنیای ومعاشی وعاقبتہ امری فقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ وان کنت تعلم انہ شر لی فی دینی ودنیای ومعاشی وعاقبتہ امری فاصرفہ عنی واقدرلی الخیر حیث کان ثم رضنی بہ۔ (مسند احمد)

یعنی اے اللہ میں تجھ سے تیرے علم کے ذریعہ بھلائی طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے وسیلے سے تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں اور تجھ سے تیرے بڑے فضل کا طالب ہوں، یقینا تو ہر چیز پر قادر ہے اور میں محض مجبور ہوں، تو تمام علم والا ہے اور میں مطلق بے علم ہوں، تو ہی تمام غیب کو بخوبی جاننے والا ہے، اے میرے اللہ اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لئے دین دنیا میں آغاز و انجام کے اعتبار سے بہتر ہی بہتر ہے تو اسے میرے لئے مقدر کردے اور اسے میرے لئے آسان بھی کردے اور اس میں مجھے ہر طرح کی برکتیں عطا فرما اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لئے دین کی دنیا زندگی اور انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے اور میرے لئے خیر و برکت جہاں کہیں ہو مقرر کردے پھر مجھے اسی سے راضی وضامند کردے۔ دعا کے یہ الفاظ مسند احمد میں ہیں۔

اس دعا استخارہ میں ھذا الامر جہاں ہے وہاں اپنے کام کا نام لے مثلاً نکاح ہو تو ھذا النکاح، سفر میں ہو تو ھذا السفر، بزنس میں ہو تو ھذا التجارۃ وغیرہ۔

زیر تفسیر آیت المائدہ۔90 میں سب سے پہلے شراب کی قطعی حرمت کو بیان کیا گیا۔

حدیث: مسلم شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ہر نشے والی چیز خمر ہے اور ہر نشے والی چیز حرام ہے اور جس شخص نے شراب کی عادت ڈالی اور بغیر توبہ مر گیا وہ جنت کی شراب سے محروم رہے گا۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت سے نہ دیکھے گا:

1۔ماں باپ کا نافرمان،

2۔شراب کی عادت والا

3۔اور اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات دے کر احسان جتلانے والا۔(مسند احمد، نسائی)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں شراب سے پرہیز کرو کیونکہ وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔(ابن کثیرؒ)

آیت کے آخر میں فرمایا: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ جس میں بتلا دیا گیا کہ اگر تم دنیا و آخرت میں فلاح چاہتے ہو تو ان پابندیوں اور حدود و قیود کا خیال رکھو۔

نشہ آور اشیاء اور جوئے کے دینی اور سماجی نقصانات

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْـتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ (مائدہ۔91)

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟

یہ نشہ آور اشیاء، شراب اور جوئے کے مزید معاشرتی اور دینی نقصانات بیان ہو رہے ہیں جو محتاج وضاحت نہیں ہیں۔

رسول کی ذمہ داری ابلاغ دعوت ہے

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔(مائدہ۔92)

اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور (نافرمانی سے) بچتے رہو اور اگر تم نے روگردانی کی تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف واضح طور پر (ہمارا پیغام) پہنچا دینا ہے۔

قبول اسلام اور سچی توبہ کی برکت سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں

لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوا وَّاَحۡسَنُوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔ (مائدہ۔93)

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہو اُسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

حرمت شراب کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنھم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ زمانہ جاہلیت میں شراب پیتے رہے ہیں جس کا گناہ کہیں ان کے نامہ اعمال میں نہ ہو۔ اسی طرح شراب کی حرمت آنے سے پہلے بھی بہت سارے مسلمان فوت ہو چکے تھے جو اپنی زندگی میں شراب کے عادی رہے۔ اس آیت میں اس شبہے کا ازالہ کر دیا گیا کہ ایمان، اسلام اور سچی توبہ سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں لہذا ان کو اپنے سابقہ گناہوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حدیث کے اندر بھی آتا ہے: الاسلام یھدم ماکان قبلہ۔ اسلام اپنے ماقبل گناہوں کو خود بخود معاف کروا دیتا ہے یعنی قبول اسلام سے قبل کئے گئے تمام گناہ قبول اسلام کے بعد معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نزول قرآن کے وقت کسی چیز کی حرمت سے پہلے اس کے استعمال پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسے ان آیات میں شراب اور جوئے کی حرمت کا ذکر ہے تو جس نے ماضی میں ان چیزوں کو استعمال کیا اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ قرآن میں دوسرے مقام پر بھی یہی فرمایا گیا: ولقد عفا اللہ عمّا سلف۔۔ جو کچھ ماضی میں ہو گیا اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔

تیسرا رکوع: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَيَبۡلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَىۡءٍ۔۔۔ (مائدہ۔87)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

حج وعمرہ کے احرام کی پابندیاں، احرام کے احکام کی تفصیل، سمندر یا پانی کا شکار اور کھانے کے احکامات: اُحِلَّ لَكُمۡ صَيۡدُ الۡبَحۡرِ۔ کعبۃ اللہ کی حرمت و فضیلت: جَعَلَ اللّٰهُ الۡـكَعۡبَةَ الۡبَيۡتَ الۡحَـرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ دلوں کا مقناطیس، یونٹی کی علامت، مرجع خلائق۔ رحمت الٰہی اور عذاب الٰہی، داعی کا کام صرف ابلاغ ہے ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے: مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ۔ تمہارے ظاہر و باطن سے آگاہ ہستی: وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ۔

رزق حلال کی برکات: قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ۔ حلال وحرام برابر نہیں ہوتے، حلال کم بھی باعث برکت، حرام زیادہ بھی ہو تو ناکافی اور بے برکتی وبے سکونی کا ذریعہ، حلال پر قناعت اختیار کرو، چیزوں کی قدر وقیمت کا خاص معیار، پرفیوم کا ایک قطرہ بدبو کے ڈھیر سے بہتر ہوتا ہے، برائی کی کثرت سے مرعوب نہ رہو۔

احرام کی پابندیاں، احرام کے مسائل کی تفصیلات

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَىْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُـهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَـعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْـغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَ لِيْمٌ۔ (مائدہ۔94)

ایمان والو! اللہ ان شکاروں کے ذریعہ تمہارا امتحان ضرور لے گا جن تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ جاتے ہیں تاکہ تاکہ وہ یہ دیکھے کہ غائبانہ طور پر کون اس سے ڈرتا ہے؟ اور جس نے تنبیہ کے بعد بھی حد سے تجاوز کیا تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

زمانہ قدیم سے شکار انسانی زندگی کی معاش اور معاشرت کا ایک اہم عنصر رہا ہے اور ہر زمانے میں کسی حد تک انسانی ضرورت بھی رہا ہے۔ بالخصوص زمانہ جاہلیت سے عرب کلچر میں شکار کو زندگی کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا، اس لئے حالت احرام میں شکار کی ممانعت کرکے لوگوں کا امتحان لیا گیا۔

حضور اکرمؐ اور صحابہ کرام کے تاریخی سفر عمرہ کے موقع پر حدیبیہ میں قیام کے دوران احرام کی پابندیوں کے احکام نازل ہوئے۔ یہ چار آیات تھیں جن میں حالت احرام کی پابندیوں بشمول شکار کی ممانعت کا حکم نازل ہوا۔

اگلی آیت میں حالت احرام میں شکار کی پابندی کی مزید تفصیل بیان کی جارہی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْـتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْـكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ (مائدہ۔95)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ کرو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اُسی کے ہم پلہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر آدمی کریں گے بشرطیکہ یہ قربانی کعبہ تک پہنچنے والی ہو یا کفارہ مسکینوں کا کھانا کھلانا ہو یا اس کے برابر روزے تاکہ اپنے کام کا

وبال چکھے۔ اللہ نے اس چیز کو معاف کیا جو گزر چکی اور جو کوئی پھر کرے گا اللہ اس سے بدلہ لے گا اور اللہ غالب بدلہ لینے والا ہے۔

امام شافعیؒ نے اس سے مراد صرف ان جانوروں کو لیا ہے جو ماکول اللحم ہیں یعنی جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے کہ ان کا شکار حالت احرام میں ممنوع ہے دوسرے جانور مثلاً درندے، موذی جانور کو حالت احرام میں مارنے کو وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے فقہاء کے نزدیک اس میں کوئی تفریق نہیں۔ محرم کو ہر قسم کے شکار سے مطلقاً پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ البتہ اگر موذی یا زہریلا جانور سامنے آجائے، حملہ کر دے یا اس سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسے مارنے میں کوئی حرج نہیں۔ دورِ جدید میں اگرچہ اس کا امکان کم ہی ہوتا ہے لیکن بہر حال حاجی کو مسئلہ کا علم ہونا چاہیے۔

سمندر یا پانی کے شکار اور کھانوں کے احکامات

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (مائدہ۔96)

تمہارے لیے سمندر (پانیوں) کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے، جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو البتہ خشکی کا شکار تم پر حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالتِ احرام میں ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی (بارگاہ کی) طرف تم (سب) جمع کئے جاؤ گے۔ (مائدہ۔96)

چونکہ سمندر کے سفر میں بسا اوقات زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور غذا کی فراہمی کے لیے بجز اس کے کہ آبی جانوروں کا شکار کیا جائے اور کوئی تدبیر ممکن نہیں ہوتی اس لیے ہر طرح کا بحری شکار حلال کر دیا گیا۔

البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہاء احناف کے نزدیک پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی کا کھانا حلال ہے۔ کیونکہ پانی کے جانوروں میں تو مگرمچھ، کچھوے، سمندری سانپ، سمندری گھوڑے، کیکڑے اور دوسرے کئی عجیب الخلقت جانور بھی ہوتے ہیں جن کو کھانے سے نفس انسانی ویسے ہی کراہت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا فقہاء احناف کے نزدیک مچھلی کے علاوہ کسی اور آبی جانور کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جن فقہاء کے نزدیک جھینگا مچھلی کی قسم سے ہے ان کے نزدیک اس کا کھانا بھی حلال ہے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ پانی کے تمام جانور حلال ہیں سوائے مینڈک کے۔

کعبۃ اللہ: اسی نام سے باقی ہے آرامِ جہاں ہمارا

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْىَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ۔

(مائدہ۔97)

اللہ نے مکان محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور ہدی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنادیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو لوگوں کے قیام وبقاء اور امن واطمینان کا سبب بتلایا ہے۔ لفظ کعبہ عربی زبان میں ایسے مکان کو کہتے ہیں جو مربع یعنی چوکور ہو۔ کعبہ کو البیت الحرام اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک حرمت اور احترام والی جگہ ہے۔ اس کی حدود میں شکار کرنا، درخت کاٹنا وغیرہ بھی حرام ہیں۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی سامنے آجاتا تو اس سے بھی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے قیاما للناس (لوگوں کے لئے جائے قرار) قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بیت اللہ کو دلوں کا مقناطیس بنادیا گیا۔ لفظ قیام اور قوام اسم مصدر ہے، اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر کسی چیز کا قیام وبقاء موقوف ہو، اس لئے قیٰماً للناس کے معنے یہ ہوئے کہ کعبہ اور اس کے متعلقات لوگوں کے قیام وبقاء کا سبب اور ذریعہ ہیں۔ اور لفظ ناس لغت میں عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ پورے عالم کے انسان اس میں داخل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ بیت اللہ اور جن چیزوں کا ذکر آگے آرہا ہے، ان کو ساری انسانیت کے لئے قیام وبقاء اور امن وسکون کا ذریعہ بنادیا ہے، جب تک دنیا کا ہر ملک، ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا رہے تو اس کی برکت سے پوری دنیا قائم اور بابرکت رہے گی۔ بیت اللہ کا پورے عالم کی بقاء کے لئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے ظاہری نظریں اس کو نہیں پاسکتیں۔ جس طرح مقناطیس اور لوہے کے باہمی ربط باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بیت اللہ اور نظام عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے قبضہ میں نہیں، وہ خالق کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

زمانہ جاہلیت سے عرب کلچر میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ کعبۃ اللہ سوشل لائف کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا رشتہ اور نیشنل یونٹی کا تصور پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان و ادب کی ترقی ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرمت والے مہینوں کی برکت سے سال کے چار مہینے مکمل امن نصیب ہوتا تھا۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں تھیں اور کسی کو فساد پھیلانے یا قتل و غارت گری کی جرأت نہ ہوتی۔

کعبۃ اللہ اگرچہ عام پتھروں کی ایک سادہ سی عمارت ہے مگر اس کی نسبت اللہ کی طرف ہے لہٰذا وہ محترم ہو گئی۔ ہدی کا جانور اگرچہ ایک جانور ہی ہے مگر چونکہ اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو گئی تو وہ شعائر اللہ میں سے ہو گیا۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری حیثیت ایک پتھر سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس چیز کی نسبت اللہ کی طرف یا دین کی طرف ہوتی ہے وہ بابرکت ہو جاتی ہے۔ دن تو بہت سارے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے جمعۃ المبارک اور یوم عرفہ کو سارے دنوں پر فضیلت عطا فرمادی۔ راتیں تو بہت ساری ہیں مگر لیلۃ القدر کو ساری راتوں پر فضیلت عطا کر دی گئی۔ فرشتے تو بہت سارے تھے مگر جبرئیل امینؑ کو سارے فرشتوں کا سردار بنا دیا۔ امتیں تو بہت ساری گذریں مگر امت مسلمہ کو ساری امتوں کا سردار بنا دیا۔ نبی اور رسول تو بہت سارے آئے مگر ان میں محمد رسول اللہ ﷺ کو سارے رسولوں کا سردار بنا دیا۔

عذاب الٰہی اور رحمت الٰہی

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (مائدہ-98)

یاد رکھو اللہ سخت گرفت کرنے والا بھی ہے اور غفور و رحیم بھی ہے۔

ظاہر و باطن سے آگاہ ہستی

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ۔ (مائدہ۔99)

رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔

رزق حلال کم بھی ہو تو باعث برکت

حرام زیادہ بھی ہو تو بے برکت

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الْاَ لْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (مائدہ۔100)

اے پیغمبرؐ! انہیں بتادو کہ برائی اور اچھائی برابر نہیں ہوتیں، خواہ برائی کی کثرت تمہیں کتنی ہی اچھی لگے، پس اے لوگو جو سمجھ بوجھ رکھتے ہو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ: اے پیغمبرؐ! انہیں بتادو کہ برائی اور اچھائی برابر نہیں ہوتیں۔

عربی زبان میں طیّب اور خبیث دو متقابل لفظ ہیں، طیّب ہر چیز کے عمدہ اور جیّد کو اور خبیث ہر چیز کے ردی اور خراب کو کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک خبیث سے مراد حرام یا ناپاک ہے، اور طیّب سے مراد حلال اور پاک۔ معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر عقل سلیم کے نزدیک پاک و ناپاک یا حلال و حرام برابر نہیں ہوسکتے۔

اس جگہ لفظ خبیث اور طیّب اپنے عموم کے اعتبار سے حرام و حلال مال و دولت کو بھی شامل ہے، اور اچھے برے انسانوں کو بھی، اور بھلے برے اعمال و اخلاق کو بھی۔ مطلب آیت کا واضح ہے کہ کسی عقل سلیم کے نزدیک نیک و بد اور بھلا برا برابر نہیں ہوتا اسی فطری قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال و حرام یا پاک و ناپاک چیزیں برابر نہیں اسی طرح اچھے اور برے اعمال و اخلاق برابر نہیں، اسی طرح نیک و بد انسان برابر نہیں۔

آیت کے اندر آگے ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ۔ خواہ برائی کی کثرت تمہیں تعجب میں ڈال دے۔ یعنی اگرچہ دیکھنے والوں کو بعض اوقات خراب اور خبیث چیزوں کی کثرت مرعوب کردیتی ہے، اور گردوپیش میں خبیث و خراب چیزوں کے پھیل جانے اور غالب آجانے کے سبب انہیں کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہ انسانی علم و شعور کی بیماری اور احساس کا قصور ہوتا ہے۔

حرام مال کی یہ بے توقیری تو آخرت کے اعتبار سے ہوئی اور اگر گہری نظر سے معائنہ کیا جائے اور سب کاموں کے آخری انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال و حرام مال برابر نہیں ہوتے، حلال سے جتنے فوائد اور اچھے نتائج اور حقیقی آرام وراحت نصیب ہوتی ہے وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

تفسیر در منثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہو گیا اور آمدنی بہت محدود ہو گئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی: لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ۔ برائی اور اچھائی برابر نہیں ہوتیں، خواہ برائی کی کثرت تمہیں تعجب میں ڈال دے۔ اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم وجور کے ذریعے جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل وانصاف قائم کر کے اپنے خزانہ کو کم کر لو اور کوئی پرواہ نہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم مقدار سے پورے ہوں گے۔

سبحان اللہ! یہ کتنی بلیغ قرآنی آیت ہے جس کے اندر کتنی اہم ہدایت کی گئی۔ اگر دنیا صرف اس قرآنی اصول کو سمجھ لے اور اس پر عمل شروع کر دے تو دنیا مالی بددیانتی اور کرپشن سے پاک ہو جائے۔

ایک اور پہلو سے بھی اس آیت کی تفسیر کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر پوری دنیا کے پر نظر ڈالی جائے تو سارے عالم میں بھلائی کی مقدار کم اور برائی کی تعداد میں کثرت نظر آئے گی۔ ایمان کے مقابلہ میں کفر، تقویٰ وطہارت اور دیانت وامانت کے مقابلہ میں بددیانتی اور بے ایمانی، ایمان اور تقویٰ کے مقابلے میں فسق وفجور، عدل وانصاف کے مقابلہ میں ظلم و جور، علم کے مقابلہ میں جہل، عقل کے مقابلہ میں بے عقلی کا کثرت کا مشاہدہ ہو گا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی چیز یا کسی جماعت کی تعداد کی کثرت اس کے اچھے یا حق پر ہونے کی قطعاً دلیل نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی چیز کی اچھائی اور بہتری اس چیز اور اس جماعت کے ذاتی حالات وکیفیات پر دائر ہوتی ہے، حالات وکیفیات اچھی ہیں تو وہ اچھی اور بری ہیں تو بری ہیں، قرآن کریم نے اسی حقیقت کو وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ۔ خواہ برائی کی کثرت تمہیں تعجب میں ڈال دے کے الفاظ میں واضح فرمادیا ہے۔

یہ آیت (مائدہ۔100) چیزوں کی قدر وقیمت کا ایک خاص معیار بیان کرتی ہے جو عام انسانی معیار سے بالکل مختلف ہے۔ دنیا کی نظر میں ایک سو پاؤنڈ بمقابلہ پانچ پاؤنڈ کے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو(100) پاؤنڈ اگر اللہ کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہوں تو وہ حرام اور ناپاک ہیں، اور پانچ پاؤنڈ

اگر اللہ کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ حلال اور پاک ہیں، اور حرام اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو، بہر حال وہ حلال اور پاک کے برابر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ پرفیوم کا ایک قطرہ بدبو کے ڈھیر سے زیادہ قدر رکھتا ہے۔ لہٰذا ایک سچے ایماندار انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شاندار ہو۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ حلال اگرچہ تھوڑا ہو وہ بہتر ہے اس حرام سے جو بہت سارا ہو۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ماقل و کفیٰ خیر ممّا کثر و الھیٰ۔ جو کم ہو اور کفایت کرے وہ بہتر ہے اس سے جو زیادہ ہو اور غافل کر دے۔

حدیث: ابن حاطب نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال عطا فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا: کم مال جس کا شکریہ تو ادا کرے یہ بہتر ہے اس زیادہ سے جس کی تو طاقت نہ رکھے۔ اے عقلمند لوگو! اللہ سے ڈرو حرام سے بچو، حلال پر اکتفا کرو و قناعت کیا کرو تاکہ دین و دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔

چوتھا رکوع: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ۔۔۔ (مائدہ۔101)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

غیر ضروری اور فضول سوالات کی ممانعت: لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جاہلانہ اور مشرکانہ روایات کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں، جاہلیت کسی زمانے کا نام نہیں، ہر تاریک خیالی، لادین کلچر، رسومات و توہمات، دین سے دوری، نفس کی پیروی، خاندانی رواج و روایات کی اندھی پیروی جاہلیت کی جدید شکل ہے۔ اپنی ہدایت کی فکر کرو کسی کی گمراہی کا وبال تم پر نہ ہوگا: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ وراثت کی وصیت کے وقت گواہوں کی اہمیت۔

غیر ضروری اور فضول سوالات سے گریز کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (مائدہ۔101)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔ اور اگر یہ باتیں ایسے وقت میں پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ گذشتہ سوالات اللہ نے معاف کر دیے ہیں اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

غیر ضروری سوال کرنے کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ اے ایمان والو ایسی (فضول) باتیں مت پوچھو (جن میں احتمال ہو کہ) اگر تم سے ظاہر کر دی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو (یعنی یہ احتمال ہو کہ جواب تمہاری منشاء کے خلاف آیا تو تمہیں ناگوار ہو گا)۔

اس آیت میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو دینی احکامات و مسائل میں بلاضرورت تدقیق اور بال کی کھال اتارنے کا شوق ہوتا ہے، اور جو احکام نہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں جن کے نتیجہ میں ان پر اعمال کا بوجھ بڑھ جائے۔

بعض مفسرین کے مطابق یہ ممانعت صرف نزول قرآن کے وقت تھی۔ خود نبی اکرم ﷺ بھی صحابہ رضی اللہ عنہ کو غیر ضروری سوالات کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

ختم نبوت اور سلسلہ وحی کے انقطاع کے بعد ایسے سوالات کا اگرچہ یہ اثر نہ ہو گا کہ نئے احکام آجائیں یا جو چیزیں فرض نہیں ہیں وہ فرض ہو جائیں لیکن بلاضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بلاضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا بعد انقطاع نبوت کے بھی مذموم اور ممنوع ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

حدیث: حضرت مغیرہ ابن شعبہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ان اللہ حرم علیکم عقوق الامھات، ووادالبنات، ومنع وھات وکرہ لکم قیل وقال و کثرۃ السوال واضاعۃ المال۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی، بیٹیوں کو زندہ در گور کرنا، دوسروں کے حقوق روکنے کو حرام قرار دیا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند کیا ہے: فضول گفتگو، مال ضائع کرنا اور فضول سوال کرنا۔ (مسلم)

علماء کا کہنا یہ ہے کہ کثرت سوال سے مراد فقہی مسائل میں زیادہ سوالات کرنا ہے۔ یعنی ان معاملات میں جن میں کوئی نص نہیں ہے اور جن کا دارومدار ہمارے کسی عمل سے نہیں ہے یعنی فقہی پہیلیاں اور مسائل سے جزئیات اور مشتقات نکالنا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔ یعنی دین اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان جو بالکل فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ موسیٰؑ کی والدہ کا کیا نام تھا، اور نوحؑ کی کشتی کا طول و عرض کیا تھا جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں، ایسے سوالات کرنا مذموم ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ ایسے سوالات کرنے والے حضرات اکثر ضروری اور اہم مسائل دین سے بیخبر ہوتے ہیں۔ فضول کاموں میں پڑنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی ضروری کاموں سے محروم ہو جاتا ہے۔

بعض فقہاء نے فرضی سوالات کر کے بہت سے مفروضہ مسائل کا حل نکالا ہے وہ اس ممانعت سے مستثنٰی ہیں کیونکہ ان سوالات کا مقصد تعلیم و تدریس ہوتا ہے۔ ایک عالم اور امام کو متوقع سوالات کیلئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے۔

شان نزول: جب آیت وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (آل عمران۔97) نازل ہوئی کہ: صاحب استطاعت لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے۔ تو لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ خاموش رہے، انہوں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا، آپؐ نے پھر سکوت فرمایا انہوں نے تیسری دفعہ پھر یہی پوچھا آپؐ نے فرمایا ہر سال نہیں اور اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا اور تم ادا نہ کر سکتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إنَّ اللّٰهَ تَعالَى فَرَضَ فَرائِضَ فَلاَ تُضَيِّعُوها، وحدَّ حُدُودًا فَلا تَعْتَدُوهَا، وحَرَّم أشْياءَ فَلا تَنْتَهِكُوها، وَسكَتَ عَنْ أشْياءَ رَحْمةً لَكُمْ غَيْرَ نِسْيانٍ فَلا تَبْحثُوا عَنْهَا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے کچھ امور فرض قرار دیئے ہیں، پس انہیں ضائع نہ کرنا، اور کچھ امور کی حد بندی فرمادی ہے، پس اس سے تجاوز اختیار نہ کرنا، اور کچھ اشیاء کو حرام قرار دیا ہے، پس انہیں پامال نہ کرنا، اور کچھ اشیاء سے خاموشی اختیار فرمائی ہے، بھول کر نہیں، بلکہ تمہارے ساتھ رحمت کا برتاؤ کرتے ہوئے، پس انہیں کریدنے کی کوشش نہ کرنا۔ (دار قطنی۔ ریاض الصالحین)

حافظ ابن رجبؒ نے اپنی کتاب جامع العلوم والحکم میں اس حدیث پر بڑا جامع تبصرہ فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چار قسموں میں تقسیم فرمایا ہے 1: فرائض، 2 محرمات، 3 حدود 4 مسکوت عنہ (یعنی ایسے امور جن سے خاموشی اختیار فرمائی)۔ یہ چاروں امور دین کے تمام احکام کو جامع ہیں۔ ابو بکر ابن السمعانیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اساس دین میں سے ہے یعنی دین کی بہت بڑی اصل اور بنیاد ہے۔ کچھ علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے پورے ذخیرۂ حدیث میں اس حدیث سے بڑھ کر تمام اصول و فروع کو سمیٹنے والی اور کوئی حدیث نہیں۔

اگلی آیت میں ماضی کے لوگوں کے غیر ضروری سوالات اور اس کے نتیجے میں ان کے انکار و تکذیب کو بیان کیا جارہا ہے:

قَدْ سَاَ لَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (مائدہ۔102)

اس طرح کے سوالات تم سے پہلے لوگوں نے بھی پوچھے تھے مگر پھر انہیں کی وجہ سے وہ منکر (مرتد) ہوگئے۔

یعنی کہیں تم بھی اس کوتاہی کے مرتکب نہ بن جاؤ کیونکہ امور غیبیہ سے متعلق کریدنا آدمی کو خواہ مخواہ تذبذب اور شک میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں انکار وارتداد کی طرف جاسکتا ہے۔

حدیث: ایک حدیث مبارکہ کے اندر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ, وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ؛ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ۔ میں جس چیز سے منع کردوں اس سے اجتناب کرو,اور جس چیز کا حکم دوں اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو، تمہیں جن چیزوں کی بابت نہیں بتایا گیا، تم مجھ سے ان کی بابت سوال مت کرو، اس لئے کہ تم سے پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ان کا کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف بھی تھا۔ (بخاری، مسلم)

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ كَرِهَ لَكُمْ ثَلَاثًا قِيلَ وَقَالَ ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ۔ کہ اللہ تعالیٰ کو تین چیزیں ناپسند ہیں: فضول گفتگو، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔ (بخاری)

جاہلانہ اور مشرکانہ روایات کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۗ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (مائدہ۔103)

اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حام کو لیکن جو لوگ منکر ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے اور ان میں سے اکثر فہم و شعور نہیں رکھتے۔

اس آیت میں ان اوہام و خرافات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو زمانہ جاہلیت سے مشرکین عرب میں مروج تھیں۔ یہاں بتایا جارہا ہے کہ ان جاہلانہ اور مشرکانہ روایات کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام یہ ان جانوروں کی قسمیں ہیں جنہیں اہل عرب اپنے بتوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ وہ ان جانوروں کے کان اور سینگ

کاٹ کر ان کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ نہ ان کو سواری کے لئے استعمال کرتے، نہ ان کا دودھ دوہتے اور نہ انہیں باربرداری کے لئے استعمال کرتے۔ غیر اللہ کے نام پر اس طرح کی نذر و نیاز کا سلسلہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں آج بھی قائم و جاری ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جاہلیت کسی مخصوص زمانے کا نام نہیں ہے بلکہ جاہلیت ایک نظریہ، فکر اور سوچ کا بھی نام ہے جو بار بار رنگ بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ مختلف ادوار میں آتی ہے۔

تمام جاہلی روایات میں رسوم و توہمات کی ظاہری شکلیں تو مختلف ہوتی ہیں لیکن خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بنیاد تاریک خیالی پر ہوتی ہے، دین سے دوری پر ہوتی ہے۔ اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہوتی ہے۔

آباؤاجداد اور خاندانی روایات کی اندھی تقلید

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔ (مائدہ۔104)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس (قرآن) کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ اللہ کے رسول ؐ کی طرف۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے تو وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے اگرچہ ان کے باپ دادا نہ علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔

آیت کا شان نزول

جاہلیت کی رسموں میں ایک آباؤاجداد اور خاندانی روایات کی اندھی تقلید بھی تھی، جس نے ان کو ہر برائی میں مبتلا اور ہر بھلائی سے محروم کر رکھا تھا۔ تفسیر در منثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب حق بات کو مان کر مسلمان ہو جاتا تو اس کو یوں عار دلائی جاتی تھی کہ تو نے اپنے باپ دادوں کو بیوقوف ٹھہرایا، کہ ان کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کر لیا۔ ان کی اس گمراہی در گمراہی پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا۔۔۔ یعنی جب ان کو کہا جاتا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اور رسول کی طرف رجوع کرو جو ہر حیثیت سے حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں اور تمہارے لئے اصلاح و فلاح کے ضامن ہیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ ہم کو تو وہی طریقہ کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔

یہ وہ جاہلانہ استدلال ہے جس نے لاکھوں انسانوں کو علم وہنر رکھنے کے باوجود گمراہ کیا۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔ قرآن کے اس ایک جملہ نے کسی شخص یا جماعت کی اقتداء کا صحیح اصول بیان کر دیا۔ یہ کوئی معقول بات نہیں کہ علم وعقل اور ہدایت کے معیار سے ہٹ کر انسان اپنے باپ دادا یا کسی اور فرد یا جماعت کی اقتداء کو اپنا طریقہ کار بنالے اور بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ مقتداء خود کہاں جارہا ہے، اور ہمیں کہاں پہنچائے گا اس کے پیچھے لگ لیا جائے۔ اسی طرح بعض لوگ کسی کی اتباع و اقتداء کا معیار رائے عامہ کو بنالیتے ہیں جس طرف بھیڑ چال دیکھی اسی طرف چل پڑے، یہ بھی ایک نامعقول رویہ ہے، کیونکہ محض عوامی رائے حق اور باطل اور حق وناحق کا معیار نہیں بن سکتی۔

قرآن کریم کی اس آیت نے علم وحکمت کا عالیشان سبق دیا کہ کوئی چیز خود بخود مقتداء وپیشواء بنانے کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد متعین کرے۔ پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ دیکھے کہ کون ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو، اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا فقیہ، عالم یا امام مل جائے تو اس کی ہدایات کی پیروی اس کو منزل مقصود پر پہنچا سکتی ہے۔ یہی حقیقت ہے آئمہ ومجتہدین کی تقلید کی کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لئے نہ جاننے والے ان کا اتباع کر کے دین کا مقصد یعنی اتباع قرآن وسنت کو حاصل کرسکتے ہیں اور جو شخص منزل مقصود کو خود ہی نہ جانتا ہو، یا جان بوجھ کر منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقل مند کے نزدیک اپنی سعی وعمل کو ضائع کرنا، بلکہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، اس علم وحکمت اور روشن خیالی کے زمانہ میں بھی افسوس ہے کہ پڑھے لکھے اور عقل وخرد والے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور آج کی بربادی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب نااہل اور گمراہ رہنماؤں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔ گویا قرآن کریم کی اس آیت نے اقتداء کا معیار نہایت معقول اور واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ علم وہدایت ہے۔ کسی فرد یا جماعت کو معیار بنانے کے بجائے قرآن وسنّت کو معیار بناؤ۔ قرآن وسنت کے مطابق علم حاصل کر کے صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کرو۔ محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا، یا صاحب مال ودولت ہونا یا صاحب حکومت وسلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیار اقتداء سمجھا جائے۔

کسی پر تنقید کرنے کا مثبت طریقہ

قرآن کریم نے اس جگہ کسی پر تنقید کا مثبت طریقہ بھی واضح فرمادیا۔ کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ایسے انداز میں ظاہر کی جائے جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو اشتعال انگیزی بھی نہ ہو۔ دین آبائی کی تقلید کرنے والوں

کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں، بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا، نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔

اپنی ہدایت اور اصلاح کی فکر کرو، کسی کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں دے سکتی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (مائدہ۔105)

اے ایمان والو! اپنے اعمال کی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں اگر تم خود سیدھے راستے پر ہو۔ اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلادے گا جو کچھ تم سب کرتے تھے۔

اس آیت میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ بیان کیا گیا کہ بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا برائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے سب سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔ اسے اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی فکر ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کر رہا ہے، اور صحیح اور سیدھے راستے (صراط مستقیم) پر چلنے کے تقاضے پورے کر رہا ہے جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی دوسرے شخص کی گمراہی اور گناہ گاری اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔
اس آیت کا یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔
حضرت ابو بکر صدیقؓ اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں "لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کو دیکھیں اور اس کی اصلاح کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرنے سے نہ روکیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ اللہ کی قسم! تم پر لازم ہے کہ بھلائی اور نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے ایک دوسرے کو روکتے رہو، ورنہ اللہ تم پر ایسے حکمران مسلط کر دے گا جو ظالم ہونگے اور وہ تم کو تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ اللہ سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی پہلے فکر کرو، دوسروں کی خرابی اعمال کا وبال تم پر نہیں ہو گا۔

تفسیر ابن عباس میں ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرے، برائیوں سے بچ جائے تو اس پر گنہگار لوگوں کے گناہ کا کوئی بوجھ نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں ظاہری الفاظ سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ اپنی اصلاح اگر کرلی جائے تو کافی ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ مطلب صحیح نہیں ہے کیونکہ امر بالمعروف کا فریضہ بھی نہایت اہم ہے۔ اس لئے آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمہارے سمجھانے کے باوجود اگر لوگ نیکی کا راستہ اختیار نہ کریں یا برائی سے باز نہ آئیں تو تمہارے لئے یہ نقصان دہ نہیں ہے جب کہ تم خود نیکی پر قائم اور برائی سے اجتناب کرنے والے ہو۔ البتہ ایک صورت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ترک جائز ہے کہ جب کوئی شخص معاشرتی طور پر اپنے اندر اس کی طاقت اور اہلیت نہ پائے۔ یعنی خدانخواستہ ایسے حالات ہوں کہ زبان سے بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا نہ کرسکے تو ایسی صورت میں: فان لم يستطع فبقلبه وذلک اضعف الايمان کے تحت اس کی گنجائش ہے کہ وہ کم از کم اپنے دل میں برائی کو برائی سمجھے۔ اس آیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔

وراثت کی وصیت کے وقت گواہوں کی موجودگی کی اہمیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔۔۔ (مائدہ۔106)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت (قریب) آجائے اور وہ (وراثت کی) وصیت کرنا چاہتا ہو تو وصیت کے وقت تمہارے دو معتبر گواہ موجود ہونے چاہئیں۔۔۔۔

ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ: وراثت کے معاملات کے گواہ تم میں سے ہوں کا مطلب مفسرین نے یہ بتایا ہے (وصیت کرنے والے) کے خاندان سے ہوں کیونکہ فیملی اور خاندان کے لوگوں کو وصیت کرنے والے کی ذاتی زندگی، ورثہ کی ملکیت، رشتے، نسب وغیرہ کے بارے میں زیادہ معلومات اور باریکیاں پتہ ہوتی ہیں اور وہ اس معاملے میں بہتر گواہی دے سکتے ہیں۔ اگر گھر یا خاندان کے گواہ دستیاب نہ ہوں تو گھر یا خاندان سے باہر کے لوگ بھی گواہ ہوسکتے ہیں جیسا کہ آیت کے اگلے حصے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے: اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ۔۔ یعنی یہ گواہ تمہارے خاندان کے باہر کے لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔۔ آیت کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان گواہ مل جائیں تو اچھی بات ہے ورنہ غیر مسلموں کی گواہی بھی قبول ہو جائے گی۔ جن حالات میں یہ آیت اتری تھی اس وقت مخصوص حالات کی وجہ سے یہ ہدایت ضروری تھی۔

اس نکتے کو اگلی آیت میں مزید واضح فرمایا جارہا ہے:

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّأْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (مائدہ۔108)

اس طریقہ سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت (گواہی) دیں گے یا کم از کم وہ اس بات کا خوف تو کریں گے کہ ان کی قسموں (گواہیوں) کے بعد کہیں اور قسموں (گواہیوں) سے ان کی تردید نہ ہو جائے (یا انہیں یہ اندیشہ تو ہو گا کہ ان کی گواہی کے بعد دوسرے گواہوں سے بھی گواہی یا حلف لیا جاسکتا ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سنو! اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

پانچواں رکوع: يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ۔۔۔ (مائدہ۔109)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

علام الغیوب ہستی صرف اللہ ربّ العالمین، روز محشر کا منظر نامہ، روز محشر کے سوالات، عیسیٰؑ پر اللہ کی رحمتیں، احسانات وانعامات، حضرت عیسیٰؑ سے خصوصی سوال وجواب، عیسیٰؑ کے حواریوں کا دین بھی اسلام تھا: وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔ حواریوں کا تعارف، حواریوں کا آسمانی کھانے (مائدہ) کا مطالبہ، مائدہ کیلئے دعا، رزق کی دعا: وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ ناشکری اور اللہ کا عذاب، نعمت غیر معمولی ہو تو ناشکری کا وبال بھی سخت ہوتا ہے، مائدۃ (خوان طعام) آسمان سے اترا تھا یا نہیں؟ قریش مکہ کا مائدہ سے ملتا جلتا مطالبہ۔

علام الغیوب ہستی: صرف اللہ ربّ العالمین

روز محشر کا منظر نامہ

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔ (مائدہ۔109)

جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا ہے، تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی قوموں نے اچھا یا برا جو بھی معاملہ کیا، اس کا علم یقیناً انہیں ہو گا۔ آیت میں انبیاءؑ کے جس علم کی نفی کا ذکر کیا جارہا ہے اس کا تعلق ان کی وفات کے بعد کے حالات سے ہے۔ یعنی انبیاءؑ کے جواب کا یہ مطلب ہے کہ ہم تو اپنی دعوت کے جواب میں اس ظاہری رسپانس اور اثرات کو جانتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں نظر آیا یا محسوس ہوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا رد عمل اور نتیجہ کہاں کس صورت میں کتنا ہوا، تو اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں یہ نکتہ بیان کیا جارہا ہے کہ امور غیبیہ یعنی باطنی امور کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء و رسل عالم الغیب نہیں ہوتے، عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے۔ انبیاء کو جتنا کچھ علم ہوتا ہے اولاً تو اس کا تعلق ان امور سے ہوتا ہے جو فرائض رسالت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ ثانیاً ان علوم سے بھی ان کو بذریعہ وحی آگاہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ عالم الغیب وہ ہوتا ہے جس کو ہر چیز کا علم ذاتی طور پر ہو، نہ کہ کسی کے بتلانے پر اور جس کو بتلانے پر کسی چیز کا علم حاصل ہو اسے عالم الغیب نہیں کہا جاتا۔

ایک مطلب اس آیت کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سوال کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری امتوں نے تمہارے بعد کیا کیا عمل کئے اور کیا کیا نئی باتیں نکالیں؟ تو وہ ان سے اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے۔ یہ معنی بھی درست ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہو کہ ہمیں کوئی ایسا علم نہیں جو اے اللہ ربّ العالمین تیرے علم میں نہ ہو۔

روز محشر کے سوالات

اس آیت میں مناظر قیامت کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جس کا ایک سبق اور خلاصہ یہ بھی ہے کہ ہم سب کو اپنے رب کے حضور جوابدہی سے ڈرنا چاہئے اور اس کی تیاری کرنی چاہئے۔ موقف حساب میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ و مقبول رسول بھی جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں تو ہمارا کیا حال ہو گا؟ اس لئے اس روز کی فکر آج ہونی چاہئے، اور فرصت عمر کو اس حساب کی تیاری کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔

حدیث: ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تزول قدما ابن ادم حتی یسئل عن خمس۔۔۔

یعنی کسی آدمی کے قدم محشر میں اس وقت تک آگے نہ سرک سکیں گے جب تک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لے لیا جائے:

ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کے طویل وکثیر لیل ونہار کس کام میں صرف کئے۔ دوسرے یہ کہ خصوصیت سے جوانی کازمانہ جو قوت عمل کازمانہ تھا، اس کو کن کاموں میں خرچ کیا۔ تیسری یہ کہ ساری عمر میں جو مال اس کو کہاں سے کمایا۔

چوتھے یہ کہ مال کو کن جائز یاناجائز کاموں میں خرچ کیا۔ پانچویں یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟

اللہ تعالیٰ نے غایت رحمت وشفقت سے اس امتحان کا پرچہ سوالات بھی پہلے ہی نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے امت کو بتلادیا، اب ہمارا کام صرف اتنارہ گیا کہ ان سوالات کا حل سیکھیں اور کامیابی حاصل کریں۔ امتحان سے پہلے ہی سوالات بتلادینے کے بعد بھی کوئی ان میں فیل ہو جائے تو اس سے زیادہ کون محروم ہو سکتا ہے۔

عیسیٰؑ پر اللہ کی رحمتیں، احسانات، معجزات

حضرت عیسیٰؑ سے خصوصی سوال وجواب

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (مائدہ۔110)

جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوا ہے، جب میں نے تم کو روح القدس سے تائید دی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی اور میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا، پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے انہوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے اُن سے بچایا۔

ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ کے جس سوال وجواب کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے ان مخصوص انعامات کا بھی ذکر ہے جو خصوصی طور پر حضرت عیسیٰؑ پر مبذول ہوئے، اور بشکل معجزات ان کو عطا فرمائے گئے۔ اس مجموعہ میں ایک طرف

انعامات کا اور دوسری طرف جواب طلبی کا منظر دکھلا کر ان دونوں قوموں کو تنبیہ کی گئی ہے، جن میں سے ایک نے تو ان کی توہین کی اور طرح طرح کی تہمتیں لگائیں اور ستایا، اور دوسری قوم نے ان کی تعظیم میں غلو کیا اور ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا۔ انعامات کا ذکر کر کے پہلی قوم کو اور سوال وجواب کا ذکر کر کے دوسری قوم کو تنبیہ کی گئی ہے۔

فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: ہر نبی کے مخالفین، آیات الٰہی اور معجزات دیکھ کر انہیں جادو ہی قرار دیتے رہے ہیں، حالانکہ جادو تو شعبدہ بازی کا ایک فن ہے، جس سے انبیاء علیہ السلام کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انبیاء کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات قادر مطلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت وطاقت کا مظہر ہوتے تھے کیونکہ وہ اللہ ہی کے حکم سے اور اس کی مشیت وقدرت سے ہوتے تھے کسی نبی کے اختیار میں یہ نہیں تھا کہ وہ جب چاہتا اللہ کے حکم اور مشیت کے بغیر کوئی معجزہ صادر کر کے دکھا دیتا اسی لئے یہاں بھی دیکھ لیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہر معجزے کے ساتھ اللہ نے چار مرتبہ یہ فرمایا: باذنی کہ ہر معجزہ میرے حکم سے ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ سے قریش مکہ نے مختلف معجزات کے دکھانے کا مطالبہ کیا جس کی تفصیل سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر 91-92 میں ذکر کی گئی ہے تو اس کے جواب میں نبی کریمؐ نے یہی فرمایا: سبحان ربی هل كنت الا بشرا رسولا۔ میرا رب پاک ہے یعنی وہ تو اس کمزوری سے پاک ہے کہ وہ یہ چیزیں نہ دکھا سکے وہ تو دکھا سکتا ہے لیکن اس کی حکمت اس کی مقتضی ہے یا نہیں؟ یا کب مقتضی ہو گی؟ اس کا علم اسی کو ہے اور اسی کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے لیکن میں تو صرف ایک انسان اور اللہ کا رسول ہوں۔

عیسیٰؑ کے حواریوں کا دین بھی اسلام تھا

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔(مائدہ۔111)

اور جب میں نے حواریوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو کہنے لگے ہم ایمان لائے اور تم گواہ رہو کہ ہم مسلم (فرمانبردار بندے) ہیں۔

حَوَارِيّٖنَ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں جو ان پر ایمان لائے ان کے ساتھی اور مددگار بنے۔ حواری کی تفصیل سورۃ آل عمران میں گذر چکی ہے۔ اس آیت میں وحی سے یہاں مراد وہ وحی نہیں ہے جو بذریعہ فرشتہ انبیاء علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی بلکہ یہ وحی الہام ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض لوگوں کے

دلوں میں کر دی جاتی تھی، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ۔ اسی طرح حضرت مریم علیہ السلام کو اسی قسم کا الہام ہوا جسے قرآن نے وحی سے ہی تعبیر کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے وحی کے لفظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم نبی تھیں کیونکہ ان پر بھی اللہ کی طرف سے وحی آئی تھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ وحی، وحی الہام ہی تھی جیسے یہاں اوحیت الی الحوارین میں ہے یہ وحی رسالت نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال قرآن میں موجود ہے جس میں شہد کی مکھی کیلئے بھی وحی (یعنی الہام) کے الفاظ آئے ہیں:

واوحیٰ ربّک الی النحل۔۔۔ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو یہ ہدایت کی۔۔۔

عیسیٰؑ کے حواریوں کا آسمانی کھانے کا مطالبہ

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (مائدہ۔112)

یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰؑ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم صاحب ایمان ہو۔

یہ مائدہ کا واقعہ ہے اور اسی کی وجہ سے اس سورت کا نام سورۃ مائدہ ہے۔ مَآئِدَةً ایسے برتن (پلیٹ یا ٹرے وغیرہ) کو کہتے ہیں جس میں کھانا ہو۔ اسی لئے دستر خواں بھی اس کا ترجمہ کر لیا جاتا ہے کیونکہ اس پر بھی کھانا چنا ہوتا ہے۔ سورت کا نام بھی اسی مناسبت سے ہے کہ اس میں مائدہ (دستر خوان) کا ذکر ہے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ عیسیٰؑ کے حواریوں نے بوجہ فقر و فاقہ، تنگی اور حاجت کے یہ سوال کیا تھا، جناب عیسیٰؑ نے ان سے فرمایا کہ ایسے انوکھے سوالات نہ کرو، اللہ پر بھروسہ رکھو، رزق کی تلاش اور محنت، کوشش کرو۔ صرف بیٹھ کر کھانے کی عادت نہ بناؤ۔

حواریوں کے اصرار پر عیسیٰؑ کی کھانے (مائدہ) کی دعا

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ (مائدہ۔114)

تب عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے اللہ! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کی بات ہو جائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔

حواریوں کے اصرار پر عیسیٰؑ نے اللہ سے مائدہ (خوانِ طعام) اور رزق کی دعا کی۔

رزق کی دعا

وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ اے اللہ! تو ہمیں رزق عطا فرما، بے شک، تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔ (انعام۔114)

ناشکری اور عذاب الٰہی

نعمت غیر معمولی یا بڑی ہو تو ناشکری کا وبال بھی بڑا ہوتا ہے

قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (مائدہ۔115)

اللہ نے فرمایا بے شک میں وہ خوان تم پر اتاروں گا پھر اس کے بعد جو کوئی تم میں سے ناشکری کرے گا تو میں اسے ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہو گی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب غیر معمولی نعمت حاصل ہو گی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمول سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور سخت آئے گا۔

مَآئِدَةً (خوانِ طعام) آسمان سے اترا تھا یا نہیں؟

اس کے بارے میں کوئی صحیح مرفوع حدیث موجود نہیں۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط سن کر کہ جو اس کے بعد ناشکری کرے گا میں اسے سخت عذاب دوں گا، حواریوں نے کہا کہ پھر ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جس کے بعد اس کا نزول نہیں ہوا۔ امام ابن کثیر نے ان آثار کی اسانید کو جو امام مجاہدؒ اور حضرت حسن بن بصریؒ سے منقول ہیں صحیح قرار دیا ہے۔ نیز کہا ہے کہ ان آثار کی تائید اس بات سے بھی ہوئی ہے کہ نزول مائدہ کی کوئی سند نصاریٰ میں ہے نہ ان کی کتابوں میں اس کا کوئی حوالہ درج ہے۔ حالانکہ اگر یہ نازل ہوا ہوتا تو اسے ان کے ہاں مشہور ہونا چاہیے تھا اور کتابوں میں بھی تواتر اً ہوتا یا کم از کم خبر احاد سے نقل ہونا چاہیے تھا۔

قریش مکہ کا مائدہ سے ملتا جلتا مطالبہ

اسی سے ملتا جلتا مطالبہ اہل مکہ (قریش) نے بھی رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ صفا پہاڑ کو ہمارے لئے سونے کا بنادے تو ہم آپؐ پر ایمان لائیں گے۔ آپؐ نے دعا کی اسی وقت حضرت جبرائیلؑ آئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو میں کوہ صفا کو سونے کا بنا دیتا ہوں لیکن اگر پھر ان لوگوں نے انکار کیا تو میں انہیں وہ عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا ہو، یا اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لئے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھلا رکھوں۔ آپؐ نے فرمایا: یا اللہ! معاف فرما، توبہ اور رحمت کا دروازہ ہی کھول دے۔ (مسند احمد)

چھٹا رکوع: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ --- (مائدہ۔116)

رکوع کے تفسیری موضوعات:

عیسٰیؑ سے خصوصی سوال وجواب، تمام رسول بشمول عیسٰیؑ اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہیں۔ عالیشان اور بلیغ الفاظ میں عفوو درگذر کی دعا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اے اللہ! اگر تو انہیں سزا دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو معاف کردے تو، تو ہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ ایمان اور راستبازی کا فائدہ آخرت میں ظاہر ہوگا، تمام اختیارات کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، سورۃ مائدہ کا اختتام اور مرکزی مضمون: لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

عیسٰی علیہ السلام سے خصوصی سوال وجواب

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔ (مائدہ۔116)

اور جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسٰی ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی، تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔

یہ سوال قیامت والے دن ہو گا اور مقصد اس سے اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنا لینے والوں یعنی غیر اللہ کی نفی ہے کہ جن کو تم معبود اور حاجت روا سمجھتے تھے، وہ تو خود اللہ کی بار گاہ میں جوابدہ ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ من دون اللہ یا غیر اللہ میں صرف بت اور مورتیاں ہی شامل نہیں ہیں بلکہ اللہ کے نیک بندے بھی غیر اللہ ہی ہیں۔ اور کسی بھی لحاظ سے ان کی عبادت یعنی انہیں سجدہ وغیرہ جائز نہیں۔

اس آیت کے اندر عیسیٰؑ کے قول کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں لوگوں کے غلط عقائد سے براءت پیش کر دیں اور ان غلط عقائد کے حامل لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔

اگلی آیت میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی نکتے کی مزید وضاحت فرما رہے ہیں:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ۔ (مائدہ۔117)

میں (یعنی عیسیٰؑ) نے ان سے صرف وہی کہا ہے جس کا تو نے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ہر چیز پر نگراں ہیں۔

حدیث: حدیث میں آتا ہے کہ میدان محشر میں نبی کریم ﷺ کی طرف آپ کے کچھ امتی آنے لگیں گے تو فرشتے ان کو پکڑ کر دوسری طرف لے جائیں گے آپؐ فرمائیں گے ان کو آنے دو یہ تو میرے امتی ہیں۔ فرشتے آکر بتلائیں گے: انک لاتدری ما احدثوا بعدک۔ یعنی اے محمدؐ! آپ نہیں جانتے کہ آپؐ کے بعد انہوں نے دین میں کیا کیا بدعتیں ایجاد کیں جب آپؐ نے یہ سنا تو آپؐ نے فرمایا میں بھی اس وقت یہی کہوں گا جو العبد الصالح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو پھر آپ ہی ان پر نگراں تھے۔ (بخاری، مسلم)

عالیشان اور عجیب الفاظ میں دعا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (مائدہ۔118)

(اے اللہ!) اگر تو انہیں سزا دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو معاف کر دے تو، تو ہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ المائدہ۔118

سبحان اللہ! کیسی عجیب و بلیغ آیت ہے۔ یعنی مطلب یہ کہ یا اللہ! ان کا معاملہ تیری مشیت کے سپرد ہے اس لئے کہ تو فعال لما یرید بھی ہے جو چاہے کر سکتا ہے اور تجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا بھی نہیں ہے۔ لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ یعنی اللہ جو کچھ کرتا ہے اس سے باز پرس نہیں ہو گی لوگوں سے ان کے کاموں کی باز پرس ہو گی۔ (سورۃ انبیاء)۔ گویا آیت میں اللہ کے سامنے بندوں کی بے بسی اور عاجزی کا اظہار بھی ہے اور اللہ کی عظمت و جلالت اور اس کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کا بیان بھی اور پھر ان دونوں باتوں کے حوالے سے عفو و درگذر کی التجا بھی ہے۔

حدیث: حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات نبی کریم ﷺ نوافل میں اس آیت کو پڑھتے ہوئے ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بار بار ہر رکعت میں اسے ہی پڑھتے رہے حتی کہ صبح ہو گئی۔ (مسند احمد)

حدیث: مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات نماز پڑھی اور صبح تک ایک ہی آیت کی تلاوت فرماتے رہے، اسی کو رکوع میں اور اسی کو سجدے میں پڑھتے رہے، وہ آیت یہی ہے (مائدہ118)۔ صبح کو حضرت ابوذر (رض) نے کہا یا رسول اللہؐ! آج کی رات تو آپ نے اسی ایک آیت میں گزاری رکوع میں بھی اس کی تلاوت رہی اور سجدے میں بھی، آپؐ نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کی شفاعت کیلئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمالیا، پس میری یہ شفاعت ہر توحید پر قائم شخص کیلئے ہو گی۔ (مسند احمد)

ایمان اور راستبازی کا فائدہ آخرت میں ظاہر ہو گا

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (مائدہ۔119)

اللہ تعالیٰ نے (قیامت کے دن کے بارے میں) ارشاد فرمایا کہ یہ وہ دن ہے کہ جو لوگ سچے تھے ان کا سچا ہونا ان کے کام آئے گا، ان کو باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہو نگی جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں، یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔ (مائدہ۔119)

قیامت کے دن کا ذکر ہو رہا ہے کہ آج کے دن سچے اہل ایمان کو فائدہ ہو گا۔ وہ ہمیشگی والی جنت میں جائیں گے، وہ اللہ سے خوش ہوں گے اور اللہ ان سے خوش ہو گا، فی الواقع رب کی رضامندی سب سے اعلیٰ چیز ہے۔

اس آیت میں مناظر قیامت میں سے ایک منظر کو بیان کیا گیا جس میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ ہماری سوچ اور ہمارے تصور کے مطابق تو یہ ایک منظر واقع ہو گا' البتہ اللہ کے علم کے مطابق تو وہ ہو چکا اس لئے کہ اللہ کا علم زمان و مکان کے حدود و قیود سے آزاد ہے۔ زمان و مکان کا تصور تو انسان کے محدود علم کے لئے ہے۔ ہمارا علم محدود اور فانی ہے۔

حدیث: ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ ان پر تجلی فرمائے گا اور ان سے کہے گا تم جو چاہو مجھ سے مانگو میں دوں گا، وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشنودی طلب کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا فرمائے گا۔

حدیث: إِنْ أَحْبَبْتُمْ أَنْ يُحِبَّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ؛ فَأَدُّوا إِذَا ائْتُمِنْتُمْ، وَاصْدُقُوا إِذَا حَدَّثْتُمْ، وَأَحْسِنُوا جِوَارَ مَنْ جَاوَرَكُمْ۔ (معجم الاوسط۔6517)

پھر آیت کے اندر فرمایا گیا کہ یہ ایسی بے مثل کامیابی ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اسی کیلئے عمل کرنے والوں کو عمل کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر فرمایا کہ سب کا خالق، سب کا مالک، سب پر قادر، سب کا متصرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، ہر چیز اسی کی ملکیت میں اسی کے قبضے میں اسی کی چاہت میں ہے، اس جیسا کوئی نہیں، نہ کوئی اس کی نظیر و عدیل ہے نہ اس کی ماں ہے، نہ باپ، نہ اولاد نہ بیوی۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں نہ کوئی اس کے سوا رب ہے۔

تمام اختیارات کا مالک حقیقی اللہ ہے

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (مائدہ۔120)

آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ سورت اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ یہ آیت اس سورت کا اختتامی تبصرہ اور مرکزی مضمون ہے۔

یہ آخری آیت اس پوری سورت کے مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے۔اس سورۃ کا مرکزی موضوع دین اسلام ہے۔اور دین اور دینداری کا اظہار اللہ کے دین کی پیروی میں ہوتا ہے۔اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت میں ہوتا ہے۔اس پوری سورت میں کچھ اصولی اور فروعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے آخر میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق ومالک ہے، اس لئے اسے یہ احکام دینے کا حق ہے۔اور بندوں کو یہ احکام پوری طرح ماننے چاہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں (انّ اللہ علیٰ کل شیٍ قدیر)۔وہ نافرمانی کی صورت میں سزا اور فرماں برداری کی صورت میں اجر وانعام دینے پر قادر ہیں۔تمام مخلوق اللہ کے سامنے عاجز ہے۔تمام انبیاءؑ بھی اپنا آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔چنانچہ فرمایا گیا کہ اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں موجود ہیں، اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

تذکیر بالقرآن پر اپنی قیمتی تجاویز، آراء اور تبصروں سے ضرور آگاہ فرمائیں

Telephone: +44 785 3099 327

Email: info@hafizsajjad.com

www.hafizsajjad.com